حمد باری تعالیٰ

اے خالق جہاں ہے سارا جہان تیرا
ساری زمین تیری یہ آسمان تیرا

سب نعمتیں جہاں کی تو نے ہمیں عطا کیں
کیا شکر کر سکیں ہم اے مہربان تیرا

تو صانع جہاں ہے قدرت تری عیاں ہے
ہر صنعت اک نشاں ہے او بے نشان تیرا

ہر وقت ذکر تیرا یا رب! کریں نہ کیوں ہم
دل مطمئن ہو جس سے وہ ہے نشان تیرا

پہچانتے ہیں تجھ کو ہم علم کی بدولت
اس سے ہے قرب حاصل اے مہربان تیرا

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

ہو نعت بشر کیا کوئی شایانِ محمدؐ
ہے جب کہ خدا خود ہی ثنا خوانِ محمدؐ
ہو جائے جو یہ عشق میں قربانِ محمدؐ......!
کہلائے میری جان خیریں جان محمدؐ......!
میں اور میرے ماں باپ ہوں قربان محمدؐ

ہر سنت حضرت پہ چل سر کے بل اے دل
کر دے جو خدا تجھ کو ادب دان محمدؐ......!
کیا بات ہے حضرت کی اطاعت کے شرف کی
شایان دو عالم ہیں غلامان محمدؐ......!
میں اور میرے ماں باپ ہوں قربانِ محمدؐ

جان دینے کو تیار ہی رہتے تھے صحابہؓ
کافی تھا فقط جنبش مژگان محمدؐ
دانائے عرب کا بھی ابوجہل پڑا نام
ہونا تھا یہی وہ بھی تھا نادانِ محمدؐ
میں اور میرے ماں باپ ہوں قربانِ محمدؐ

جنت میں پہنچ جاؤں یا رب اسی صورت
چھوٹے نہ کبھی ہاتھ سے دامانِ محمدؐ

(حافظ محمد ذیشان زاہد، رجانہ)

حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کو بارگاہ رسالت مآب ﷺ سے غائبانہ ”خیر التابعین“ کا لقب عطا ہوا تھا۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میری امت کے ایک شخص کی شفاعت سے قبیلہ مضر اور تمیم کے برابر لوگ جنت میں داخل ہوں گے صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ وہ شخص کون ہے؟ آپ نے فرمایا اویس قرنی۔ (۱)

آپ امت محمدیہ میں عاشقوں کے سردار ہوئے ہیں، جن کے بارے میں منقول ہے کہ انہیں قیامت کے روز ستر ہزار فرشتوں کے جھرمٹ میں جنت میں داخل کیا جائے گا تاکہ حالت عشق میں ان کی خلوت نشینی اور مخلوق سے روپوشی وہاں بھی برقرار رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب آپ کا زہد دیکھا تو فرمانے لگے کہ کاش مجھ سے کوئی ایسی روکھی روٹی کے ٹکڑے کے بدلے خلافت خرید لے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جب ارشاد نبوت کی تکمیل میں آپ سے ملنے اور امت کے حق میں حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف سے دعائے مغفرت کا پیغام پہنچانے کے لئے آئے تو اتباع رسول ﷺ کے موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، آپ نے فرمایا: جب مجھے جنگ احد میں حضور نبی اکرم ﷺ کے دانت مبارک شہید ہونے کی خبر ملی تو میں نے اپنا ایک دانت توڑ ڈالا پھر خیال آیا شائد اس کی بجائے حضور نبی اکرم ﷺ کا کوئی دوسرا دانت شہید ہوا ہو تو میں نے دوسرا دانت بھی توڑ ڈالا اس طرح ایک ایک کر کے سارے دانت توڑ چکا تو مجھے سکون نصیب ہوگیا۔ یہ بات سن کر دونوں صحابہ پر عجیب رقت طاری ہوگئی اور یہ اندازہ ہوگیا کہ یہ عاشق ظاہری دیدار اور صحبت سے کیوں محروم رکھا گیا ہے۔

آپ نے فرمایا: سب سے بڑی وصیت یہ ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پہچانو! اور جب تم جانتے ہو کہ اللہ تمہیں پہچانتا ہے تو بس اسی کو کافی سمجھو کہ وہ تمہیں پہچانتا ہے اور یہ آرزو ہرگز دل میں نہ رکھو کہ

”اس کے سوا کوئی اور بھی تمہیں پہچانے۔“

آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے ملاقات کے بعد کہا: ”اب آپ واپس تشریف لے جائیں قیامت قریب ہے میں اس کے لئے کچھ تیار کر لوں۔ وہاں ایک ایسا دیدار نصیب ہونے والا ہے جس سے پھر کبھی محرومی نہیں ہوگی۔“

کثرت گریہ اور رقت قلبی کا یہ عالم تھا کہ حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور کچھ نصیحت فرمانے کے لئے بہت اصرار کے بعد آمادہ ہوئے۔ آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم پڑھا اور چیخ مار کر گر پڑے اور جب ہوش میں آئے تو فرمانے لگے میرے رب کا ذکر بلند ہے، سب سے زیادہ حق اس کا قول ہے اور سب سے اچھا اسی کا کلام ہے پھر مفید کلمات فکر آخرت کی نسبت تلقین فرمائے۔

حضرت عمر ﷛ نے دوران ملاقات آپ کی ظاہری حالت انتہائی خستہ دیکھ کر خواہش کی کہ آپ ذرا اسی جگہ ٹھہریں میں آپ کے لئے کچھ سامان لے آتا ہوں آپ ﷛ نے جیب سے دو درہم نکال کر دکھائے اور کہا یہ اونٹ چرانے کا معاوضہ ہے، اگر آپ یہ ضمانت دے دیں کہ یہ درہم خرچ ہونے سے پہلے میری موت نہیں آئے گی تو پھر جو آپ کا جی چاہے لے آیئے ورنہ یہ دو درہم میرے لئے کافی ہیں۔ آپ نے فرمایا: "السلامة فی الوحدة" یعنی تنہائی میں سلامتی ہے۔ جس کا دل اللہ کے لئے مخلوق کی آفتوں سے محفوظ رہتا ہے، اور غیر کے اندیشہ وار فکر سے بھی بے نیاز رہتا ہے، جسے حقیقی خلوت گزینی اور تنہائی کی عادت نصیب ہوگئی وہ لوگوں کی مجلس میں بیٹھا ہو تب بھی اس کی تنہائی میں خلل واقع نہیں ہوتا اور جو مخلوق کے خیال اور محبت میں محو ہو وہ خلوت میں بھی فارغ نہیں ہوتا۔ اس لئے آپ نے فرمایا: "علیک بالقلب" اپنے دل کی حفاظت کر۔

جس دل کو محبت الٰہی کی دولت نصیب ہو جائے اسے انسانوں سے ملنا جلنا نقصان نہیں دیتا اور جو مخلوق کی محبت میں گرفتار ہو اس کے دل پر اللہ کی محبت کا گزر نہیں ہوتا۔ لوگو! ارشاد الٰہی ہے:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ. (۱)

"کیا اللہ اپنے بندۂ (مقرّب نبی مکرم ﷺ) کو کافی نہیں ہے؟"

آپ عشق و محبت کا وہ پیکر اتم ہیں، جنہیں سرکار دو عالم ﷺ کی قربت اور حضور دور رہ کر بھی میسر تھی، فرط محبت میں جنوں کا غلبہ ہوا تو ان کا یہ حال ہوگیا کہ دیوانوں کی طرح گلیوں میں ننگے پاؤں چلتے تھے، پریشان اور خستہ حال دیکھ کر لڑکے مجنوں سمجھتے اور پتھر مارتے جن سے خون بہنے لگتا ایک روز آپ رک گئے اور بچوں سے فرمانے لگے کہ "مجھے بڑے پتھروں سے نہیں بلکہ چھوٹے پتھروں سے مارا کرو" ان میں سے کسی نے کہا "اویس! کیا تیرے دعوی عشق کی یہی حقیقت ہے کہ بڑے پتھروں کی تکلیف سے خوفزدہ ہوگئے ہو؟" آپ یہ سن کر فرمانے لگے "میں بڑے پتھروں سے نہیں ڈرتا بلکہ بات یہ ہے کہ ان سے خون بہنے لگتا ہے اور وضو ٹوٹ جاتا ہے اور میں بے وضو یاد الٰہی نہیں کرسکتا۔"

آپ ایک شب قیام میں گزارتے، دوسری شب رکوع میں اور تیسری سجدہ میں اکثر دن کا وقت بھی عبادت میں گزرتا، ہمیشہ روزہ رکھتے، جب افطار کے لئے کچھ میسر نہ ہوتا تو کھجور کی گٹھلیاں چن کر بیچتے اور ان کی قیمت سے چند لقموں کا سامان کرلیتے، کوفہ میں آپ ایک حلقہ ذکر میں شریک ہوتے تھے۔ اسیر بن جابر ﷛ کا بیان ہے کہ اس حلقہ میں ہمارے دلوں پر سب سے زیادہ حضرت اویس ﷛ کے ذکر کا اثر ہوتا تھا۔

ایک پرانے اور شکستہ مکان میں رہائش رکھتے، اکثر وقت جنگل میں گزارتے اور لوگوں سے بہت کم ملاقات فرماتے تھے۔

☆......☆......☆

حضرت رابعہ بصری رضی اللہ عنہا

حضرت رابعہ بصری رضی اللہ عنہا بہت بڑی زاہدہ، عابدہ اور عارفہ تھیں ان کی پیدائش پر خواب میں آپ کے والد گرامی کو حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تیری یہ بچی بہت ہی مقبولیت حاصل کرے گی اور اس کی شفاعت سے میری اُمت کے کئی افراد بخش دیئے جائیں گے۔

آپ کا معمول تھا کہ دن میں روزہ رکھتیں اور رات عبادت میں صرف کر دیتیں۔ ابتداء ایک شب جب آپ کے مالک کی آنکھ کھلی تو اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا، اس نے ایک گوشہ میں آپ کو سربسجود پایا اور ایک معلق نور آپ کے سر پر فروزاں دیکھا آپ اللہ تعالٰی سے یہ عرض کر رہی تھیں کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو سارا وقت تیری عبادت میں گزار دیتی لیکن چونکہ تو نے مجھے غیر کا محکوم بنا دیا ہے، اس لئے میں تیری بارگاہ میں دیر سے حاضر ہوتی ہوں، یہ سن کر آپ کا مالک بہت پریشان ہوا، اس نے یہ عہد کرلیا کہ مجھے تو اپنی خدمت لینے کی بجائے الٹا ان کی خدمت کرنا چاہئے تھی، چنانچہ صبح ہوتے ہی آپ کو آزاد کرکے استدعا کی کہ آپ یہیں قیام فرمائیں تو میرے لئے باعث سعادت ہے ویسے آپ اگر کہیں اور جانا چاہیں تو آپ کو اختیار ہے، یہ سن کر آپ باہر نکل گئیں اور ذکر و شکر میں مشغول ہوگئیں۔

آپ شب و روز ایک ہزار رکعت پڑھا کرتی تھیں اور گاہے گاہے حضرت حسن بصری ﷛ کے وعظ میں بھی شریک ہوتی تھیں۔

ایک مرتبہ آپ جب حج پر گئیں تو دیکھا کہ خانہ کعبہ خود آپ کے استقبال کے لئے چلا آرہا ہے آپ نے عرض کیا مولا مجھے مکان کی حاجت نہیں، مکین کی ضرورت ہے مجھے حسن کعبہ سے زیادہ تیرے دیدار کی تمنا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابراہیم ادھمؒ جب سفر حج پر روانہ ہوئے تو ہر گام پر دو رکعت نماز ادا کرتے ہوئے چلے اور مکمل چودہ سال میں مکہ معظمہ میں پہنچے، دوران سفر یہ بھی کہتے گئے کہ دوسرے لوگ تو قدموں سے چل کر پہنچے ہیں لیکن میں آنکھوں کے بل پہنچوں گا اور جب مکہ میں داخل ہوئے تو وہاں خانہ کعبہ دکھائی نہ دیا، چنانچہ اس تصور سے آپ آبدیدہ ہوگئے کہ شاید میری بصیرت زائل ہوچکی ہے لیکن غیب سے آواز آئی کہ بصیرت زائل نہیں ہوئی بلکہ کعبہ ایک ضعیفہ کے استقبال کے لئے گیا ہے، یہ سن کر آپ کو احساس ندامت ہوا اور گریہ کناں ہوئے یا اللہ وہ کون سی ہستی ہے ندا آئی کہ بہت ہی عظیم المرتبت ہستی ہے، چنانچہ آپ کی نظر اٹھی تو دیکھا کہ سامنے سے حضرت رابعہ بصری علیہ الرحمہ لاٹھی کے سہارے چلی آرہی ہیں اور کعبہ اپنی جگہ موجود ہے۔ آپ نے رابعہ بصری رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ تم نے نظام کو کیوں درہم برہم کر رکھا ہے، جواب ملا میں نے تو نہیں کیا البتہ تم نے ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے جو چودہ برس میں کعبہ تک پہنچے ہو، ابراہیم ادھمؒ نے کہا کہ میں ہر گام پر دو رکعت نفل پڑھتا ہوا آیا ہوں جس کی وجہ سے اتنی تاخیر سے پہنچا، رابعہ نے فرمایا کہ تم نے تو نماز کے ساتھ فاصلہ طے کیا ہے اور میں عجز و انکساری کے ساتھ یہاں تک پہنچی ہوں۔ پھر ادائیگی حج کے بعد حضرت رابعہ بصری علیہ الرحمہ نے اللہ تعالٰی سے رو کر عرض کیا تو نے حج پر بھی اجر کا وعدہ فرمایا ہے اور مصیبت پر صبر کرنے کا بھی لہٰذا اگر تو میرا حج قبول نہیں فرماتا تو پھر مصیبت پر صبر کرنے کا ہی اجر عطا کردے کیونکہ حج قبول نہ ہونے سے بڑھ کر اور کون سی مصیبت ہوسکتی ہے، پھر آپ بصرہ واپس آگئیں اور عبادت میں مشغول ہوگئیں۔ جب اگلے سال حج کا زمانہ آیا تو فرمایا گزشتہ سال کعبہ نے میرا استقبال کیا تھا اس سال میں اس کا استقبال کروں گی، چنانچہ شیخ فاردی کے قول کے مطابق ایام حج کے موقع پر آپ نے جنگل میں جا کر کروٹ کے بل لڑھکنا شروع کردیا اور مکمل سات سال کے عرصہ میں عرفات پہنچیں۔

وہاں یہ غیبی آواز سنی کہ اس طلب میں رکھا ہے اگر تو چاہے تو تمہیں اپنی تجلی سے نواز سکتے ہیں۔ آپ نے عرض کیا کہ مجھ میں اتنی قوت و سکت کہاں، البتہ رتبہ فقر کی خواہش مند ہوں ارشاد ہوا کہ فقر ہمارے قہر کے مترادف ہے جس کو ہم نے صرف

ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دیا جو ہماری بارگاہ سے اس طرح متصل ہو جاتے ہیں کہ سرمو فرق باقی نہیں رہتا، پھر ہم انہیں لذت وصال سے محروم کر کے آتش فراق میں جھونک دیتے ہیں لیکن اس کے باجود ان پر کسی قسم کا حزن و ملال نہیں ہوتا بلکہ حصول قرب کے لئے از سر نو سرگرم عمل ہوجاتے ہیں، مگر تو ابھی دنیا کے ستر پردوں میں ہے اور جب تک ان پردوں سے باہر آ کر ہماری راہ میں گامزن نہ ہوگی اس وقت تک تجھے فقر کا نام بھی نہ لینا چاہئے۔ پھر ارشاد ہوا کہ ادھر دیکھ اور جب حضرت رابعہ بصری علیہ الرحمہ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لہو کا ایک بحر بیکراں ہوا میں لٹکا ہوا نظر آیا ندا آئی کہ یہ ہمارے ان عشاق کی چشم خونچکاں کا دریا ہے جو ہماری طلب میں چلے اور منزل عشق میں اس طرح شکستہ پا ہو کر رہ گئے کہ ان کا کہیں سراغ نہ ملا۔ رابعہ بصری نے عرض کیا کہ ان عشاق کی ایک صفت مجھ پر بھی ظاہر ہو، یہ کہتے ہی انہیں پھر نسوانی معذوری ہوگئی اور یہ ندا آئی کہ ان کا مقام یہی ہے کہ سات برس تک پہلو کے بل لڑھکتے ہیں تاکہ خدا تک رسائی ملے اور ایک تجلی کا مشاہدہ کر سکیں اور جب وہ قرب کی منزل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں تو ایک حقیری علت ان کی راہوں کو مسدود کر کے رکھ دیتی ہے اور وہ صبر کرتے ہیں یہی ان عاشقوں کی علامت ہے۔

جب آپ سے نکاح نہ کرنے کی وجہ دریافت کی گئی تو جواب دیا کہ تین چیزیں میرے لئے وجہ غم بنی ہوئی ہیں اگر تم یہ غم دور کر دو تو میں یقیناً نکاح کرلوں گی اول یہ کہ کیا خبر میری موت اسلام پر ہوگی یا نہیں، دوم روز محشر میرا نامہ اعمال نہ جانے سیدھے ہاتھ میں ہوگا یا الٹے ہاتھ میں، سوم روز محشر جب جنت میں ایک جماعت کو دائیں طرف سے اور دوسری کو بائیں طرف سے داخل کیا جائے گا تو نہ جانے میرا اشمار کس جماعت میں ہوگا، لوگوں نے عرض کیا کہ ان تینوں سوالوں کا جواب ہمارے پاس نہیں آپ نے فرمایا پھر جس کو اتنے غم ہوں اس کو نکاح کی کیا تمنا ہو سکتی ہے۔

آپ ہمہ وقت گریہ و زاری کرتی رہتی تھیں جب لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ میں اس کے فراق سے خوفزدہ ہوں جس کو محفوظ تصور کرتی ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ دم نزع یہ ندا آجائے کہ تو لائق بارگاہ نہیں ہے۔

ہر صبح یہ دعا کیا کرتیں کہ اللہ مجھے اس طرح اپنی جانب متوجہ فرما لے کہ اہل جہان مجھے تیرے سوا کسی کام میں مشغول نہ دیکھ سکیں، اور کبھی یہ دعا کرتیں کہ دنیا میں میرے لئے جو حصہ متعین کیا گیا ہے وہ اپنے معاندین کو دے دے اور جو حصہ عقبیٰ میں مخصوص ہے وہ اپنے دوستوں میں تقسیم فرما دے، میرے لئے صرف تیری ذات ہی کافی ہے اور اگر میں جہنم کے ڈر سے عبادت کرتی ہوں تو مجھے جہنم میں جھونک دے اگر خواہش فردوس وجہ عبادت ہو تو فردوس میرے لئے حرام فرما دے، اور اگر میری پرستش صرف تمنائے دیدار کے لئے ہو تو پھر اپنے جمال دلنواز سے مشرف فرمادے۔

ایک مرتبہ علیل ہوگئیں وجہ مرض دریافت کرنے پر فرمایا کہ جب میرا قلب جنت کی جانب متوجہ ہوا تو باری تعالیٰ نے اظہار ناراضگی فرمایا اسی کا غصہ میرے مرض کا باعث ہے۔ مراد یہ تھی کہ دعویٰ ہمارے عشق اور دیدار کا اور دھیان جنت کی طرف، اگر جنت کی طرف دھیان کا یہ حال ہے تو دنیا کی طرف دھیان کا حال کیا ہوگا۔

☆......☆......☆
☆......☆......☆......☆......☆

ریشمی بہن بھائیو!
ریشمی دنیا کے ریشمی ساتھیو!
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ کہاں گم ہیں آپ سب؟ اتنی زیادہ غیر حاضری؟ بہت افسوس ہے۔ ارشد وفا، راشد ترین، ثنا ناز، صفیہ تجل، شمیم ناز صدیقی کدھر گئے سب......؟ اور یہ ڈاکٹر طارق محمود بھی نظروں سے اوجھل ہو کر جانے کن کاموں میں مصروف ہیں۔ بھئی واپس آجاؤ سارے۔ محفل سونی سونی سی ہو رہی ہے۔

نزہت جبیں نے اپنا تبصرہ ہمیں واٹس اپ کیا...... ان کا بے حد شکریہ۔ مگر پیاری تسبیلی جلدی سے لکھ کر TCS کروا دیتیں تو مجھے زیادہ آسانی رہتی۔

اور جناب اب سب لوگ کمر کس کے تیار ہو جائیں کیوں کہ ایوارڈ تقریب آپہنچی ہے سر پہ، اور اس بار کسی نے غیر حاضر نہیں ہونا۔ اپنی آمد کو کنفرم کریں۔ ایوارڈ ملے نہ ملے لیکن کسی کو ایوارڈ لیتے دیکھ کر خوش ہونا، خوشی کا اظہار کرنا اور تالیاں بجا کر اسے داد دینا یا حوصلہ افزائی کرنا بھی بہت بڑی بات ہے۔

اس لیے وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایوارڈ ہوا تو جائیں گے ورنہ نہیں۔ تو یہ بہت کم ظرفی کی بات ہے اور ریشمی جذبات و احساسات رکھنے والوں کو یہ ہرگز بھی زیب نہیں دیتا۔

کراچی والے بھی اس تقریب کے لیے رخت سفر باندھ لیں۔ نزہت جبیں ضیاء، ناہید سلطانہ اختر، شمیم ناز صدیقی، نگہت غفار، عذرا فردوس اور بہت سے دوسرے بشمول اشفاق شاہین اور ایس امتیاز احمد تیاری پکڑ لیں۔

اشفاق بٹ کی محبتوں کا ہمیں علم ہے۔ وہ غیر حاضر نہیں ہوں گے۔ باقی فیصل آباد، ساہیوال، لاہور، کوئٹہ، بی، ملتان، بہاولپور، احمد پور، دینہ، جہلم، چکوال، پنڈی گھیب اور پشاور والے بھی اپنی آمد کو یقینی بنائیں۔ یاد رکھیے یہ تقریب صرف اور صرف آپ لوگوں کے لیے ہی کی جاتی ہے اگر اسے سجانے سنوارنے اور رونق بڑھانے میں آپ لوگوں کا کردار ہی نہ ہو تو پھر کیا فائدہ!

جو لوگ اپنے ساتھ دوست احباب اور عزیز و اقارب کو لانا چاہتے ہیں وہ پہلے سے ان کے نام فون نمبرز اور شناختی کارڈ نمبرز مجھے فون پر نوٹ کرا دیں۔

سعدیہ ہما شیخ اور فریدہ جاوید فری کو تو کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ضرور آئیں گی۔ اور صفیہ تجل کے ساتھ ثناء ناز بھی ضرور پہنچیں گی۔ (انشاء اللہ)

تو ہم نے ابھی سے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے ہیں۔
اور باتوں میں اندازہ نہیں ہوا کہ......کوئی دروازہ زور زور سے بجا رہا ہے۔
دیکھتے ہیں کہ یہ دستک کس نے دی ہے۔

☆☆☆

عمارہ ناز، سرگودھا

بہت ہی پیاری آپی جان بشریٰ مسرور صاحبہ!

پیار اور خلوص بھرا اسلام عرض کرتی ہوں۔

سب سے پہلے اتنا شاندار اور معیاری ڈائجسٹ ریشم شائع کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ ریشمی دستک میں میری پہلی حاضری ہے۔ ریشم ڈائجسٹ مجھے سرگودھا کے ممتاز احمد صاحب نے متعارف کروایا۔ کمالیہ میں بہت تلاش کیا مگر نہیں ملا پھر ممتاز احمد صاحب نے سرگودھا سے خرید کر مجھے بذریعہ ڈاک پوسٹ کیا یقین جانیے ریشم من کو اتنا بھایا کہ ایک ہی نشست میں سارا پڑھ کر دم لیا۔ تمام افسانے ایک سے بڑھ ایک تھے۔ خاص طور پر ممتاز صاحب کی لکھی آپ بیتی ''جتلائے کرب'' کا تو جواب نہیں بہت زبردست اور شاندار آپ بیتی تھی۔

عنبرین اختر نے نصیحت آموز افسانہ ہوئے تم دوست جس کے لکھا۔ تقدیر بہاروں کی، وہم محبت، عظیم آدمی، مہذب بدمعاش، داغ بہت اچھی تحریریں تھیں پسند آئیں۔ شاہد رفیق سہو کا افسانہ انتظار اچھا افسانہ تھا۔ اس کے علاوہ دیگر افسانے اور آپ بیتیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ آپی جان میں ایک پسماندہ اور دیہی علاقے (گاؤں) میں رہتی ہوں ہماری تحصیل کمالیہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ریشم ڈائجسٹ دستیاب نہیں ہے تو آپ مجھے ممبر شپ دے دیں تاکہ مجھے گھر بیٹھے مل جائے۔

باقی میں شاعرہ بھی ہوں اور میرا ایک مجموعہ کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔ اپنا کلام خط کے ساتھ ارسال کر رہی ہوں اور اشاعت کی منتظر رہوں گی۔ انشاء اللہ عنقریب ایک افسانہ بھی بھیجوں گی۔ میرے والد محترم ایک ٹیچر تھے جو کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مجھے علم و ادب سے محبت ورثے میں ملی ہے۔ اچھے انسانوں کی قدر کرتی ہوں۔ آپی جان آپ مجھے اچھی لگی ہیں کیونکہ آپ بھی علم و ادب سے محبت کرنے والی ہستی ہیں۔ مجھ یتیم لڑکی کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔ اب اجازت چاہوں گی۔ فقط آپ کی چھوٹی بہن۔

(☆ پیاری عمارہ: خوش آمدید...... ''ریشم'' کا حصہ بنی ہیں تو مستقل مزاجی سے شامل رہیے گا، ممبر شپ کے لیے ڈائجسٹ کے صفحے پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں یا پھر آفس فون کر لیجیے)

☆☆☆

ممتاز احمد، سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا

محترمہ بشریٰ مسرور صاحبہ!

السلام علیکم:

اللہ رب العزت آپ کو آپ کے پورے گھرانے کو اور ریشم سے جڑے ہر فرد کو صحت اور تندرستی جیسی عظیم نعمت اور دولت سے ہمیشہ مالا مال رکھے۔ (آمین)

سال نو کا پہلا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ موصول ہوا۔ ثقافت کے حوالے سے فکر انگیز اداریہ خواب غفلت میں سوئے لوگوں کو جھنجھوڑنے کی زبردست کاوش تھی۔ تلخ حقائق سے خوب پردہ ہٹایا۔ بھارت ہمارے وقومی نظریے کو پہلے دن سے ہی مٹانے اور ختم کرنے کے درپے ہے تو اس نے یہی راستہ چنا ہے کہ ثقافت کے نام پر مسلمان قوم کا تشخص مٹا دیا جائے۔ ہمارے نادان لوگ سوچے سمجھے بغیر نام نہاد ثقافت کی اندھی تقلید میں یہ بھول گئے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اللہ کریم ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبولؐ کے مطالعہ سے روح سیراب ہوئی۔ دین اور دنیا میں بزرگان دین کے مختصر حالات زندگی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ کرسی صدارت پر محترم ایم حسن نظامی قبولہ شریف والے رونق افروز

تھے۔ بہت جامع اور عمدہ تبصرہ لکھا۔ نگہت غفار کا خط نمبر ون تھا۔ بہت خوبصورت الفاظ کے چناؤ کے ساتھ بہت شاندار تبصرہ لکھا۔ ویلڈن......

عابدہ طارق حسب سابق لاجواب تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ آپ کے لکھنے کا انداز بہترین ہے تو آپ سے التماس ہے کہ کہانیاں اور افسانے بھی لکھا کریں۔ میرا چھوٹا ویر مخلص، ہمدرد، پیار کرنے والا، احساس کرنے والا اور بے پناہ عزت و احترام دینے والا ایم ارشد وفا فرام گوجرانوالہ اس بار کڑی تنقید کے ساتھ ریشمی دستک کو رونق بخش رہا تھا۔ آپ کی تنقید پڑھ کر میرے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جن پر تنقید کی ہے پتہ نہیں ان کا کیا حال ہوا ہوگا......؟ خیر کوئی بات نہیں مثبت تنقید سے لکھاری کے قلم میں نکھار آتا ہے۔ اگر مجید جائی صاحب اور ان کی بیگم دونوں لکھ رہے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سجدہ صابر کیسی ہیں آپ؟ آپ نے بہت اچھی ریشمی دستک دی۔ محترم شیر زمان صاحب یقیناً آپ علم و ادب سے سچا پیار کرنے والے انسان ہیں۔ آپ کی محبت کا عکس ریشمی دستک میں بخوبی نظر آتا ہے۔ اوکاڑہ کی محترمہ غزالہ جلیل راؤ صاحبہ وعلیکم السلام اللہ کا شکر ہے سب خیریت ہے۔ آپ طویل عرصے کے بعد ریشمی دستک میں حاضر ہوئیں۔ خوش آمدید......

ہم سب تو ریگولر ہیں بس آپ اپنی حاضری کو یقینی بنائیں محمد طلحہ سرور صاحب کو ایڈیٹر کا قلم دان سنبھالنے پر ڈھیروں مبارکباد...... عذرا فردوس کا افسانہ نئے سال کا پہلا عہد لاجواب تحریر تھی۔ محمد سلیم اختر کا افسانہ محبت اور مسیحا بہت اچھا تھا۔ مسز نگہت غفار پری وش کے عنوان سے شاندار اور بہترین افسانہ لے کر آئیں بلاشبہ دل موہ لینے والی تحریر تھی۔ دوراہا، آسیب اچھی تحریریں تھیں۔ محبت کے موضوع پر لکھا گیا طلعت خان کا افسانہ ثمناً قلیلا دل کو چھو گیا بہت پسند آیا۔ محسن علی کا ناولٹ محبت خواب جیسی ہے کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ شروع سے آخر تک تحریر نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔

عنبرین اختر نے محبت میری ہی رہی کے عنوان سے شاندار افسانہ پڑھنے کو دیا۔ بہت خوب اور زبردست لکھا۔ سائبان، شعور زندگی، قصاص، کیسی تیری محبت تھی، شام دشت حیراں، ابھی موسم سنہرا ہے کے مصنفین نے اپنے قلم سے خوب انصاف کیا بہت زبردست تخلیقات تھیں۔ شاندار لکھا۔

جوتیاں مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ خط کچھ طوالت اختیار کر گیا ہے لہٰذا اختتام کرتا ہوں انشاء اللہ اگلے ماہ ریشمی دستک کی خوشبو بھری بزم میں حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو...... اللہ نگہبان

☆☆☆

فریدہ جاوید فری، لاہور

سویٹ بشریٰ جی......

السلام علیکم:

جنوری کا ریشم ملا ٹائٹل پسند آیا اس مرتبہ ریشم کی صحت کچھ زیادہ اچھی ہو گئی ہے ماشاء اللہ خوب موٹا تازہ لگا۔ اداریہ بہت اچھا لگا۔ حمد و نعتؐ سے فیض یاب ہوئے۔ دین اور دنیا پڑھ کر دلی سکون ملا۔

پچھلے ماہ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے کچھ نہ لکھ سکی اب قدرے بہتر ہوں۔ سب سے پہلی دستک ایم نظامی صاحب کی تھی پھر ساری دستک پڑھی پرنس بھائی کی کمی بے حد محسوس ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جلد صحت یاب کرے۔ (آمین) ارشد وفا بھائی آپ ہمیں یاد رکھتے ہیں بے حد شکریہ۔ افسانے اور ناول سب کے اچھے لگے۔ رنگ خیال پھر غائب تھا۔

بشریٰ جی آپ کے اسلام آباد کے ایڈریس پہ تو لیٹر پہنچتا ہی نہیں اوروں نے بھی یہی کہا ہے اب بھیج تو رہی ہوں دیکھو ملتا ہے یا نہیں بشریٰ جی آپ کی آواز سننے کو تو دل ترس گیا ہے یعنی کان ترس گئے ہیں۔
راولپنڈی جانا ہی نہیں ہوا نہیں تو اسلام آباد ضرور آتی بھتیجی کی شادی تھی۔ بڑی مصروفیات رہیں۔ لاہور میں تو ہماری پسندیدہ کڑاکے دار سردی پڑ رہی ہے اور 22 دسمبر کو ہماری سالگرہ تھی۔
اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے۔ اللہ حافظ......سب کو دعا اور سلام۔

☆☆☆

عنبرین اختر، لاہور

پیاری آپی بشریٰ مسرور صاحبہ!
السلام علیکم:
بہت محبت کے ساتھ انتہائی پیارا بھرا خلوص، دعاؤں سے سجا سلام۔
کیسا ہے میرا پیارا ریشم
اور سارا اسٹاف؟
امید واثق ہے کہ تمام ریشمی پروانے بخیریت ہوں گے۔ مجھے گیارہ جنوری کو سال نو نمبر ملا اور فوراً تبصرہ لکھ رہی ہوں۔
''ہم تو اسلام آباد کے قدرتی حسن کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔''
اس بار ٹائٹل تو بہت ہی خوبصورت ہے۔ یعنی میرا من پسند کلر لال، نشیلے نینوں میں کاجل۔ لبوں پہ لال لپ اسٹک کی تہہ جمائے اور جوڑے میں لال پھول لگائے ہوئے ماڈل لرزتے لبوں سے نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہی ہے۔
بشریٰ آپی اس بار تو اداریہ بہت جاندار اور شاندار ہے۔ ''بھارت کا جنگی جنون'' یہ بھی ہے کہ وہ ہماری عوام کے رگ و پے میں زہر کی مانند اپنے پروگرام سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اور ہر سال اربوں کھربوں روپیہ ''پاکستان سے بھارت'' جاتا ہے اور جب بھارت سے بات مذاکرات پر آتی ہے تو حیلے سازیاں بنا کر بات گول مول کر دیتا ہے۔
حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول ﷺ کی روحانی اور سنہری کرنوں سے روح کو ترو تازہ کرتے آگے بڑھے۔ دین و دنیا عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارے لیے فلاح و بقاء کی دعوت دیتی تحریریں ہیں۔
ریشمی دستک میری من پسند تحریروں میں سے ایک بجی سنوری بزم ہے۔ جہاں سب ریشمی لکھاریوں کی انسیت اور اپنائیت دل کھول کر سامنے آتی ہے۔
اور یہ سب پھول اور پتیوں کو یکجا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ جس میں ''پھول آپی بشریٰ صاحبہ'' اور ''پتیاں ہم سب ریشمی لکھاری'' ہیں۔
ریشم ڈائجسٹ میں نیا سلسلے وار ناول ریشم شروع ہونے جا رہا ہے۔ اللہ تحسین انجم انصاری کے زور قلم میں اور اضافہ کرے۔ (آمین)
گھونگھٹ کی اوٹ سے اس بار بھی شائع نہیں ہوا۔ چلیں کوئی بات نہیں ایک بار پھر انتظار کر لیتے ہیں۔
مجھے شکوہ ہے اچھا سلسلہ شروع ہونے جا رہا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سب افسانے اور ناولٹ ایک دوسرے پر سبقت لے گئے۔
نئے سال کا پہلا عہد عذرا فردوس، سلیم اختر کی اور مسیحا، عرفان رامے کی تیری پناہ میں، نگہت غفار پری وش، ایس

امتیاز دوراہا، یہی کرن آسیب، طلعت خان ثمنا قلیلا، محسن علی محبت خواب جیسی ہے، عفت گل اعزاز سائبان، شعور زندگی ندیم عباس ڈھکو، ثمینہ طاہر بٹ قصاص، عامر بشیر کیسی تیری محبت تھی، حنا اصغر شام دشت حیراں، ثنا ناز ابھی موسم سنہرا ہے اور رانا زاہد حسین کی جوتیاں سب معیاری افسانے ہیں۔

اپنا افسانہ دیکھ کر تو مجھے طمانیت اور حسرت کا احساس ہوا۔ الف سے اچھے ب سے بچے میں عبداللہ مسکراہٹیں بکھیر رہے تھے۔ ریشم کا باورچی خانہ میں چکن میکرونی اور عربی شاہی ٹکڑے بہت لذیذ تھے۔

نوک جھونک تو تمام ریشمی لکھاریوں کا من پسند سلسلہ ہے۔ خود کلامی، آپ کے اوراق میں خرم بورے والا، اشفاق بٹ گجرات اور شائستہ حسین کراچی کے اوراق اچھے لگے۔

بی بی کی بیوٹی ٹپس اچھی اور مفید ہوتی ہیں۔ برجوں کا طلسم کدہ اچھا سلسلہ ہے۔ ناریل ایک مفید اور کارآمد پھل ہے جسے بھی شوق سے کھاتے ہیں۔

افضل شاہین اور فریدہ فری آپ دونوں کو اللہ صحت کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین)

نگہت غفار آپی آپ نے میری تحریر کو پسندیدگی کی سند دے دی۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ (آمین)

مبین شاہ جھنگ سے آپ کی خوش فہمی پر تبسم بکھیر گئی۔

نیلم احمد بشیر کی غزل ایس امتیاز احمد کی غزل

شکیل خان پشاور کے سلسلے اچھے لگے۔

ریشم کی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

آخر میں پاکستان کی بقا کے لیے دعا کہ اللہ پاکستان کو مزید ترقی عطا کرے۔ (آمین)

کیونکہ دنیا کے کسی بھی کونے میں دکھ کی آندھی آئے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

سب چاہنے والوں کو پرخلوص سلام۔

☆☆☆

مسز نگہت غفار، کراچی

بہت پیاری سی بشریٰ جی!

السلام علیکم!

جیتی رہیں، سلامت رہیں، خوش رہیں، کامیاب رہیں، ترقی کرتی رہیں۔ (آمین ثم آمین)

آج 10 فروری کو پوسٹ مین کی آواز پر لبیک کہا اور دوسرے ہی لمحے ریشم ہاتھ میں تھا۔ پوسٹ مین نے کہا باجی ایڈریس میں "قائد آباد" لکھا ہونا چاہیے کیونکہ لانڈھی تو بہت بڑا ہے ہم نے کہا اچھا بھائی میں کہہ دوں گی کہ "قائد آباد" بھی ضرور لکھیں۔

ویلن ٹائن ڈے کی مناسبت سے "محبت نمبر" دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

واہ...... واہ...... بشریٰ جی...... بہت خوب کیا مثال دی ہے آپ نے دو نمبر دوستوں کی......

بالکل سچ کہا ہے آپ نے ہمیں اپنی زندگی میں قسم قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے زندگی کے اس سفر میں بے خوف و خطر آنکھیں بند کیے رہنے والے اکثر گھاٹے کا سودا کرتے ہیں نقصان اٹھاتے ہیں ہمیں اپنی زندگی کے اس سفر میں ہر قدم سنبھل کر احتیاط کے ساتھ اٹھانا چاہیے۔ اللہ ہم سب کو ایسے اژدھوں سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

ہمیشہ کی طرح اپنے "رب" اور اپنے "حبیب رسول پاک" کے خوبصورت مقدس پاکیزہ نور سے منور لفظوں کو قلب و روح میں اتارتے ہوئے "دین و دنیا" کی محفل میں "حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری" "حضرت خواجہ

بہاؤ الدین نقشبند" ایسی پرنور اور اچھی تحریروں سے ہمیں بھی دینی معلومات ملتی ہیں۔

ریشمی دستک بھیا افضل شاہین آپ کو میری تحریر پسند آئی بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ سلامت رہیں۔ ایم اشفاق بٹ آپ کو بھی رنگ خیال میں میری تحریر پسند آئی بھائی بہت بہت نوازش اللہ آپکو خوش رکھے۔ شیر زمان آپ نے ریشمی دستک میں میری دستک کو پسند کیا اللہ رب العزت آپ پر عنایتیں فرمائے۔ بشریٰ جی...... مجھے لگ رہا ہے اس بار دستک کی آوازیں بہت ہی کم تھیں پلیز...... اس محفل کو زیادہ سے زیادہ آباد کریں۔

کہانیاں...... شہر دل عذرا فردوس کی کہانی اچھی لگی حقیقی محبت وہ بھی شوہر کی شکل میں ملنا قسمت والوں کو ملتی ہے۔ میں اسیر عشق ہوں غزالہ جلیل راؤ پیارے پیارے لفظوں سے سجی اچھی لگی۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے بڑی خوبصورتی سے اختتام کو پہنچی۔ میرا آسماں تو ہے نزہت جبین کی کہانی سبق آموز تھی۔ خالی ہاتھ آمنہ صدف کی کہانی مختصر مگر پر اثر تھی۔

"ریشم"، تحسین انجم کے ناول کی پہلی قسط اچھی تھی اب دوسری قسط کا انتظار ہے۔ اور انہونی ہوگئی فدا حسین کی کہانی اور ناولٹ بن مانگی دعا صفیہ تجل، وفا کی خوشبو محمد قاسم ساری کہانیاں پسند آئیں۔

آپ کے اوراق میں ایم اشفاق، پرنس افضل شاہین، ناز سلوش زشے، ایم حسن نظامی، راشد شرف الدین، نادیہ آپ کے اوراق اچھے لگے۔ خود کلامی ایم اشفاق، پرنس افضل شاہین کے اشعار اور قطعات اچھے تھے۔ ریشمی دستک میں ایم اشفاق کی تحریر بہت پسند آئی۔

عزیز از جان! بشریٰ جی افسانے کی اشاعت کے لیے بہت ہی زیادہ نوازش اور اپنی کوتاہی پر سوری اور شرمندگی پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا؟؟؟

☆☆☆

میاں طارق محمود، فیصل آباد

بہن بشریٰ مسرور صاحبہ!

ہمیشہ مسکراتی رہیں:

السلام علیکم: ریشمی دستک میں حاضر ہوتا ہی رہتا ہوں۔ ریشم ماشاء اللہ دنیا کا نمبر ون ڈائجسٹ بن چکا ہے۔ کچھ دوست جو چلے گئے وہ بہت یاد آتے ہیں۔ ایک گزارش ہے جو ریشم کے باقاعدہ ممبرز ہیں ان کو ترجیح دی جائے۔ تو نوازش ہوگی۔ افسانہ ارسال خدمت ہے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ آپ کا بھائی۔

☆☆☆

فریدہ جاوید فری، لاہور

بشریٰ جی!

السلام علیکم:

فروری کا ریشم ملا سرورق سو سو لگا جنوری کے شمارے میں تبصرہ نہ کر سکی ریشم میری کزن پڑھنے کے لیے لے گئی پھر دوسرے ماہ ملا اب فروری پر تبصرہ حاضر ہے۔ جو آپ نے ایڈریس دیا ہے اسلام آباد کا اس پر تو ڈاک آپ کو ملتی نہیں اب لاہور کے ایڈریس پر بھیج رہی ہوں۔ طلحہ بیٹا کو ایڈیٹری مبارک ہو۔ تبصرہ تو نہیں تھا مگر اپنی غزل پڑھ کر خوشی ہوئی۔ دستک میں سب کے خطوط جگمگا رہے تھے۔ جن بھائیوں نے میری تعریف کی ان کا بے حد شکریہ نگہت غفار آپ کے یاد کرنے کا شکریہ۔ حسن نظامی صاحب بے حد شکریہ۔ پرنس افضل بھائی آپ کو میری آپ بیتی پسند آئی شکریہ اور خط بہت ہی اچھا تھا پڑھ کر ہنستی رہی۔ ایم اشفاق بٹ بھائی آپ کا تبصرہ تو لاجواب ہوتا ہے

بے حد سلام و دعا۔ شیر زمان بے حد سلام و دعا اپنے خط میں یاد رکھتے ہو۔ پیاری صفیہ تجل تمہارے محفل میں آنے سے دل خوش ہوگیا۔ فیصل ندیم آپ کا بھی شکریہ آپ نے مجھے عظیم قلم کار کہا جو خود اچھے ہوتے ہیں وہ دوسرے کے لیے بھی اچھا سوچتے ہیں۔ مقصود احمد بھائی آپ کو بھی سلام و دعا یادوں میں یاد رکھنا...... اور محفل میں آتے رہنا۔ اب تبصرہ ہو جائے تحریروں پر......

شہر دل...... میں اسیر عشق ہوں غزالہ جلیل کا لازوال افسانہ تھا۔ نزہت جبیں تو لکھی ہی اتنا اچھا ہیں۔ میرا آسمان تو ہے بے حد پسند آیا۔ ایس امتیاز کا افسانہ اک حادثہ ہونے کو ہے واہ کیا افسانہ ہے۔ روشنی کی کرن وفا کی خوشبو، زہر عشق، بن مانگی دعا بہترین ناولٹ تھا۔ تم ہو زندگی سے بڑھ کر نگہت جی کا افسانہ لاجواب تحریر تھی سب افسانے ایک بڑھ کر ایک لگے۔

سندیسے میں نگہت جی نے پھر ہمیں یاد کیا شکریہ نگہت جی...... امیر حمزہ کو پہلا انعام ملنے پر مبارکباد۔ آپ کے اوراق میں اشفاق بٹ اور محبت کس سے کی جائے نادیہ اوکاڑہ کا بے حد پسند آیا۔ گھر کا حکیم اچھا سلسلہ ہے۔ چلو جی اب سب کو دعا اور سلام۔

کشائس مسرور، طلحہ، حمزہ، عبداللہ کو بے حد پیار۔

☆☆☆

محسن علی طاب، ساہیوال

آپی بشریٰ مسرور صاحبہ!

السلام علیکم:

کیسے مزاج ہیں؟ سوری غائب رہا۔ دراصل ریشم ملا ہی نہیں آپ کو بھی صورتحال سے آگاہ کیا تھا بہت سی دعائیں آپ کے لیے۔

آج میں اتفاق سے "عمران سیریز" لینے کے چکر میں شہزاد بک ڈپو پر چلا گیا انہوں نے دیکھ کر کہا چودھری صاحب آج کدھر؟ میں نے ان سے گپ شپ کی عمران سیریز لی۔ اس دوران میری نظر ریشم پر پڑ گئی۔ میں فوراً اس کی طرف لپکا اور ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اور شہزاد سے سوال کیا یہ تمہارے پاس آتا ہے؟

اس نے کہا جی جناب میں نے آرڈر دیا کہ مجھے ہر ماہ میرے آفس میں پہنچا دیا کرنا ورنہ میرا چکر لگا تو میں لے جایا کروں گا۔ اس طرح ریشم مجھ تک پہنچ ہی گیا۔ کافی دوستوں کو کہا مگر نہ ملا بہر حال کہتے ہیں کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا۔

ریشم فروری پر تبصرہ حاضر خدمت ہے اسی کے ساتھ خط کے ساتھ کہانی (جعلی پیر) بھی حاضر خدمت ہے جگہ دیجئے گا۔

ریشم ماہ فروری کا شمارہ محبت نمبر دل کو چھو گیا۔ ٹائٹل محبت کی امنگوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔

اس میں کافی چینج تھا عمران امید ہے اچھے سرکولیشن منیجر ثابت ہوئے ہوں گے۔ اداریہ تو ریشم کی جان ہے دین اور دنیا واہ......

ریشمی دستک پرنس افضل اپنی وائف کے وہی پرانے دکھڑے سنا رہے تھے۔ حسن نظامی بھائی وعلیکم السلام...... اشفاق شاہین بھائی کا تبصرہ فٹ تھا۔ باقی اشفاق بٹ اچھی نشان دہی کر رہے تھے۔ مجید جائی مفرور ہو چکا ہے۔ بہر حال ان کی یہ سٹوری کافی رسالوں میں دیکھی تھی جائی یہ غلط بات ہے اپنی اصلاح کرو۔

شہر دل، قسمت بہت ظالم ہے مگر جن پر مہربان ہوتی ہے ان کے ہاں پھول ہی کھلتے ہیں۔ میں اسیر عشق ہوں

اذان کی ڈانٹ محبت بھرا رنگ لے آئی پر مزاح تحریر تھی اچھی لگی۔

آپی بشریٰ آپ کے ناول کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں بس یہ کہ آپ کو لکھنے کا اور دل چھو لینے کا فن آتا ہے۔

آپی ظالم فروری نے ادب کے ہمارے بھائی ہمارے رہنما محی الدین نواب اور انتظار حسین ہم سے چھین لیے یہ تو دسمبر سے بھی زیادہ ظالم نکلا۔

میرا آسمان تو ہے اچھی تحریر تھی گھریلو مسائل کی پر زور ترجمانی کر رہی تھی۔ بابر کا کردار یاد رہے گا۔

دہرا قتل اس میں بھی لگتا ہے عمران ہی عمران سیریز والا۔ جو جرم کی بخیہ کنی میں مصروف تھا۔

اور انہونی ہوگئی۔ نصیحت آموز تحریر تھی نا صرف عبرت حاصل کی بلکہ رائٹر کو بھی داد دی۔

کہانی روشنی کی کرن میں لیلیٰ بھی مجید جائی کی طرح مغرور نظر آئی ہاہاہا......

تم ہو زندگی سے بڑھ کر۔ اشعر اور ثمرہ کی داستان محبت دل کو پسند آئی۔ حسن نظامی اور صفیہ تجل نے بھی اچھی تحریر لکھیں کیوں نا لکھتے آخر یہ ہمارا ریشم ہے جتنی محبت ہم کو اتنی ان کو بھی ہوگی۔

وجنتی مالا انتخاب اچھا تھا۔ ان کے متعلق جان کر اچھا لگا معلومات میں اضافہ ہوا۔ عائشہ آپی نے جلیبی سے تواضع کی۔

نوک جھونک میں انعام حاصل کرنے والوں کو مبارکباد۔ طلحہ بھائی تمہارے جوابات سے لگ رہا ہے تم کچھ کمزور ہو گئے ہو؟ خود کلامی میں مہوش کا شعر سب سے اچھا تھا۔ آپ کے اوراق اور بی بی کی نپس اچھے سلسلے ہیں۔

منشی محمد عزیز یاد رکھنے پر شکریہ تمہاری خود بینی کو داد دیتا ہوں۔ ورنہ مجھے تو ریشم والے بھول ہی گئے تھے۔

الف سے اچھے ب سے بچے، بچوں کے لیے اچھا سلسلہ ہے کم از کم مائیں بچوں کو یہ سٹوری سنا کر سلا سکیں گی۔

ویسے آج کل کے دور میں ایسا ہوتا تو نہیں ہوگا۔ محمد طلحہ، محمد عبداللہ، آپی کشائش کو میرا اسلام دیجئے گا۔ اجازت دیں بک ڈپو والے شمارے پہنچا دیا کریں گے انشاء اللہ میں بھی اب ہر ماہ حاضری دوں گا۔ آپ سب کے لیے بہت سی دعائیں۔

☆☆☆

بشرط زندگی آئندہ انہی صفحات پر دوبارہ ملاقات ہوگی۔ اپنا بہت سا خیال رکھیے گا۔

فی امان اللہ

بے شمار چاہتوں کے ساتھ آپ سب کی

بشریٰ مسرور

خطوط اور اپنی تحریریں ہمیں اس پتے پر ارسال کریں

Suite#1, 4th Floor,

12-Mian Chambers, 3-Temple Road, Lahore

Facebook ID: Bushrarafiq

E mail: Bushraraysham@gmail.com.

اردو کمپوزنگ میں اپنی کہانیاں اور دیگر تحاریر ہمیں اسی E mail پر بھیجی جائیں۔

افسانہ

خواب سنہرے

عذرا فردوس

جائز خواہشات کے حصول کی کوشش کرنا
بری بات نہیں لیکن ان خواہشات کو
پورا کرنے کے لیے صراط مستقیم سے
بھٹک جانا بہت سی مصیبتوں کو جنم دیتا ہے۔

ایک لڑکی کا فسانہ جو رانی بن کر جینا چاہتی تھی

بہت آرام کرنا چاہتی ہوں
یہی اک کام کرنا چاہتی ہوں
شعور آگہی ایک المیہ ہے
اسے نیلام کرنا چاہتی ہوں

موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ باغوں اور کھیتوں میں ہر طرف ہریالی نظر آ رہی تھی۔ خوش نما پھول ہر طرف کھلے ہوئے تھے۔

رانی کی زندگی بھی بہار کی طرح خوش نما تھی کیونکہ اٹھارہ سال کی عمر میں امنگیں جو جوان ہوتی ہیں۔ قدرت نے رانی کو حسن کی دولت سے بھی خوب نوازا تھا۔ بلوری بڑی، بڑی آنکھیں، گھٹنے تک چھوتے لمبے بال، گورا رنگ نکلتا ہوا قد جو بھی اسے دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔

اماں تم نے میرا نام رانی کیوں رکھا جب کہ تم اچھی طرح جانتی تھیں تمہاری رانی صرف نام کی رانی ہے اس کے نصیب میں دولت کہاں؟

رانی کے اس سوال پر اس کی ماں حیران ہو گئی۔ اگلے لمحے اس نے سوچ کر کہا اسی لیے تیرا نام رانی رکھا ہے کہ رب تیری تقدیر رانیوں جیسی بنائے تو بیاہ کر ایسے گھر جائے جہاں تو رانیوں کی طرح راج کرے۔

رہنے دے اماں مجھے اپنی اوقات کا اندازہ ہے۔ ایک غریب پوسٹ مین کی بیٹی کو کوئی شہزادہ آ کر بیاہنے سے رہا۔

ضروری تو نہیں تجھے کوئی شہزادہ ہی بیاہنے آئے تو اپنے سے اونچے گھر میں جا کر بھی تو راج کر سکتی ہے۔ کیوں کیا غریب گھروں کی لڑکیوں کی شادیاں دولت مند گھرانوں میں نہیں ہوتیں۔

آخر کو میں نے اور تیرے ابا نے تجھے پڑھایا اسی لیے ہے کہ تیری خوبصورتی کے ساتھ تعلیم بھی ہو گی تو بھلا تیری شادی اچھے گھر میں کیوں نہیں ہو گی۔ اماں نے پریقین لہجے میں کہا۔

رانی، اماں کی بات سن کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ اماں اور دوسرے لوگوں کے منہ سے اپنی تعریفیں سن کر وہ خوشی سے سرشار ہو جاتی تھی۔ اماں اور ابا کی بڑی خواہش تھی کہ رانی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ مگر انٹر کرنے کے بعد اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب وہ گھر کے کاموں میں اماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔

رانی، دوپہر کا ایک بجنے والا ہے گھر الٹا پڑا ہے اب جھاڑو پونچا کر لو...... باورچی خانے میں الگ برتن پڑے ہیں۔

اماں! آج میرا موڈ صفائی کا بالکل نہیں تم صومیہ سے کروا لینا۔ اماں نے سلائی مشین پر سلائی کرتے ہوئے چشمے کے پیچھے سے اسے گھورا۔

صومیہ اور ربیعہ سکول سے تھکی ہاری آتی ہوں گی۔ اب وہ آتے ہی کھانا کھا کر بستر پر پڑیں گی یا صفائی کریں گی۔

دیکھ رہی ہوں تجھے دن بدن کام چور ہوتی جا رہی ہے۔ اماں کی باتیں سننے سے بہتر رانی نے کام کرنے کو جانا اور اٹھ کر وہ بے دلی سے گھر کی صفائی کرنے لگی۔ دل تو اس کا کام کرنے میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو جاگتی آنکھوں سے اپنی تقدیر بدلنے کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔

رانی ذرا اس قمیص کی ترپائی تو کرنا شام میں وہ بیٹھی چاول چن رہی تھی اماں نے اسے رائل بلیو کلر کی جالی دار قمیص تھمائی۔

اس نے چاول کی ٹرے اٹھا کر ایک طرف رکھی اور قمیص کی ترپائی کر کے اسے غور سے دیکھا۔ اماں نے بڑی نفاست سے سلائی کی تھی۔ بے شک کپڑا بڑا خوبصورت تھا۔ یہ قمیص اس کی کالج کے زمانے کی دوست فریحہ کی تھی۔

رانی نے ایسے ہی بلا ارادہ بے اختیار قمیص کو اپنے تن پر لگا کر دیکھا پھر وہ قمیص پہن کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

رائل بلیو رنگ کی یہ قمیص جس پر سنہرا کام تھا اس کا وجود اسے پہن کر دمک اٹھا تھا۔ وہ ستائشی نظروں سے

اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ کاش میرے پاس بھی ایسے ہی کپڑے ہوتے پر میرے نصیب میں یہ کہاں؟

فریحہ کہتی ہے انسان اپنی قسمت خود بھی بناتا ہے۔ پر اماں کو تو میری اس سے دوستی بھی سخت ناپسند ہے۔ اس نے حسرت بھرے دل سے سوچا۔

واؤ...... زبردست آج تو تمہارا حسن بجلیاں گرا سکتا ہے۔ وہ گھبرا کر پلٹی تو پیچھے دروازے پر فریحہ کھڑی تھی۔ رانی شرمندہ ہو گئی اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ مگر اگلے لمحے وہ سنبھل گئی۔

سوری فریحہ میں تو پہن کر دیکھ رہی تھی اس کی فٹنگ درست ہے بھی کہ نہیں۔ تمہیں تو پتہ ہے اماں لوز فٹنگ کر دیتی ہیں۔ پچھلی دفعہ بھی تم نے فٹنگ دوبارہ کروائی تھی۔

آج کل اماں کے پاس شادیوں کی وجہ سے کام زیادہ ہے۔ اس لیے مجھے بھی ان کی ہیلپ کرنی پڑتی ہے۔

اچھا تو تم پہن کر اپنی اماں کی ہیلپ کرتی ہو کہ ناپ صحیح ہے کہ نہیں۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

تم بیٹھو میں ابھی چینج کر کے آتی ہوں۔ رانی تیزی سے اسٹور کی طرف بڑھ گئی۔

لو فریحہ اپنی قمیص میں بہت شرمندہ ہوں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ فریحہ کا موڈ آف دیکھ کر رانی نے کہا۔

کوئی بات نہیں مگر تم بڑی غضب کی لگ رہی تھیں۔ واقعی رانیہ تم بہت حسین ہو کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اللہ نے تمہیں کتنی فرصت اور محنت سے بنایا ہے۔ مگر پیدا غریب گھر میں کیا۔ خیر اب بھی تم چاہو تو دولت اور نام کما سکتی ہو۔

ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو اگر پیدا ہونا انسان کے اختیار میں ہوتا تو کون گودڑی کا لعل بنتا۔ ہر کوئی دولت مند گھرانے میں پیدا ہونے کی خواہش رکھتا۔ فریحہ کی باتوں سے رانی ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جایا کرتی تھی۔ اب بھی وہ اپنی نظریں نیچی کیے انگلیاں مروڑنے میں لگی تھی۔

میں نے تو تمہیں کئی بار سمجھایا ہے مگر تم ہو کہ مانتی ہی نہیں ہو۔ کیا ہوا تم غریب ہو مگر ہو تو ہیرا اور ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے اور پھر تم باصلاحیت ہو ایک بار تم میری بات مان لو دیکھنا تمہاری تقدیر کیسے بدلتی ہے۔

ماڈل گرل ہونے میں کیا برائی ہے اور پھر تم پیپر ماڈلنگ کرو گی کوئی ٹی وی پر تو نہیں آؤ گے۔ سچ تمہارے اماں، ابا کو پتہ بھی نہ چلے گا۔

مگر فریحہ اماں، ابا سے چھپ کر یہ کام کرنے میں جانے کیوں مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

سب ممکن ہے تم بس جاب کرنے کے بہانے اجازت تو لو۔ فریحہ کی نظریں اس کے حسین چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

سب کچھ بہتر ہو جائے گا تم فیصلہ تو کرو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں کل آؤں گی۔ خوب سوچ لینا۔

رانیہ کو پریشانی کے بھنور میں چھوڑ کر فریحہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

دل میں رانی، فریحہ کی بات پر غور کرنے لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسے خود بھی یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اس کی ضرورت اب اس کے گھر کو زیادہ ہے۔ اس کا کوئی بھائی تو تھا نہیں وہ کل تین بہنیں تھیں۔

بڑی ہونے کے ناطے اس کی ذمے داریاں زیادہ تھیں۔ اماں چاہتی تھیں وہ سلائی میں طاق ہو جائے مگر اسے اماں کا لوگوں کے کپڑے سینا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

محلے کی اکثر عورتوں نے رانی سے کہا تھا کہ وہ ان کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا دے مگر اس نے صاف منع کر دیا تھا اس کے تصور میں تو ایک محل نما گھر بسا ہوا تھا۔ جس

میں وہ آراستہ پیراستہ ہو کر حکم چلائے کچھ اپنے حسن کے زعم نے اور کچھ فریحہ کی تعریفوں نے اسے خود پسندی میں مبتلا کر دیا تھا۔

حالانکہ وہ بچپن سے اپنی تعریفیں سنتی آرہی تھیں۔ اگر میں نے ماڈلنگ کی دنیا میں قدم رکھ دیا تو باقی ٹاپ کلاس ماڈلز کی تو چھٹی ہو جائے گی۔ پھر میرے پاس دولت ہی دولت ہو گی۔ پھر پیپر ماڈلنگ کا پتہ بھی کیسے چلے گا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ہمارے رشتے دار کون سے پڑھے لکھے ہیں۔ ان سب میں تو میرا رکھ رکھاؤ بہتر ہے وہ بے چینی سے سوچتی جا رہی تھی۔

سوچ کبھی تو کیلے کانٹے بن جاتی اور کبھی تصور میں پھول مہک اٹھتے دل اور ضمیر کی کشمکش میں بالآخر دل جیت گیا۔ وہ اپنے فیصلے پر مطمئن ہو گئی۔

یہ کیا تم ادھر ادھر ٹہلے جا رہی ہو جب سے فریحہ گئی ہے تم بے چین ہو آخر اس نے ایسا کیا کہہ دیا۔

اماں اس کی پریشانی بھانپ کر بولیں۔

کچھ نہیں اماں، فریحہ نے جاب کرنے کے لیے بتایا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہیں جگہ ہو تو مجھے ضرور بتانا گھر میں بیٹھ کر بور ہونے سے بہتر ہے کہ میں جاب کر لوں کیا تم ٹیچری کرو گی؟ انٹر پاس کو تو ایسی ہی نوکری ملتی ہے۔

اماں رہنے دو اس کے لیے بھی اچھی انگلش آنی چاہیے وہ تو فریحہ کی سفارش کی وجہ سے مجھے آفس میں چھوٹی، موٹی نوکری مل جائے گی۔

نوکری کے بارے میں بعد میں سوچنا تمہارے ابا آگئے ہیں جلدی سے روٹی ڈالو۔ وہ کھانے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔

ابا آگئے مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ رانی جلدی سے کچن کی طرف نکل گئی۔ دل ہی دل میں وہ کل کا انتظار کر رہی تھی تاکہ فریحہ کو اپنا فیصلہ سنا سکے۔

فریحہ یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو سچ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ فریحہ کے ساتھ اس وقت وہ ایڈورٹائزنگ کمپنی میں آئی تھی ابھی وہ وزیٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔

فریحہ کا کزن اس کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ اس کی بدولت ہی رانی کو ماڈلنگ کا چانس ملنے والا تھا۔ تھوڑی دیر بعد فریحہ نے رانی کو جدید طرز کا لباس اندر روم سے لا کر دیا ویسا ہی رائل بلیو کلر کا لیکن یہ لباس فریحہ کے لباس سے زیادہ قیمتی اور حسین تھا۔

لو یہ پہن لو سامنے ڈریسنگ روم ہے تم ڈریس تبدیل کر لو پھر تمہارا میک اپ ہو جائے گا تاکہ فوٹو سیشن ہو سکے۔

رانی وہ لباس لے کر اندر ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔ بلیو نیٹ کے سوٹ میں اس کا سفید رنگ عریاں ہو کر شعلہ جوالہ بن گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے آئینے میں وہ اپنے آپ کو دیکھ کر شرما گئی۔ مگر اگلے لمحے دل نے کہا ایسا موقع قسمت والوں کو ملتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت تھی کہ جس ماحول میں وہ پیدا ہوئی تھی اگر محنت کر کے کماتی تو اتنی دولت نہ مل سکتی تھی۔

فریحہ کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجے بہن دولت ہی سب کچھ ہے۔ معاشرے میں عزت دولت سے ہی ملتی ہے۔

ڈریس چینج کر کے وہ نکلی تو وہاں موجود تمام لوگ اس کے معصوم اور سادہ حسن کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ فوٹو گرافر نے اس کے کئی کلوز اپ لیے اس کے چہرے کو فوٹو جینک کا خطاب دیا دیگر لوگوں نے بھی اس کی تعریف کی مگر اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

کیا بات ہے مس رانیہ؟ آپ کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہیں۔ اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر روحیل فاروقی بولے۔

وہ فریحہ کے کزن کے باس تھے اور ہمیشہ سے خوبصورت چہروں کے دیوانے رہے تھے۔ پینتیس سالہ روحیل کا بہترین مشغلہ لڑکیوں سے فرینڈ شپ کرنا تھا۔

اس شوق کی بدولت ابھی تک کنوارے تھے۔ فوٹو سیشن مکمل ہوا تو روحیل نے اسے اپنے روم میں بلا لیا۔

جی سر آپ کو کوئی کام ہے؟

کام تو آپ سے بہت سے ہیں فی الحال تو آپ ہمارے ساتھ چائے پئیں۔ روحیل نے گہری نظروں سے اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔

سر! میں چائے تو نہیں پیتی۔

گڈ کوئی بات نہیں ہم کولڈ ڈرنک پی لیتے ہیں۔ اب تو آپ کو کوئی پرابلم نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے پیون کو کولڈ ڈرنک لانے کا آرڈر دیا۔

مس رانیہ آپ چاہیں تو میں آپ کو کمرشل کے لیے بک کر سکتا ہوں۔ مگر یاسر نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اپنے آپ کو پیپر ماڈلنگ تک محدود رکھنا چاہتی ہیں۔

جی سر...... مجھے گھر والوں کی طرف سے پرمیشن نہیں ملے گی۔

ایک بات ہے مس رانیہ آپ جیسی اٹریکٹو اور فوٹو جینک ماڈل بہت کم ہوتی ہیں۔ مجھے آپ جیسے چہرے کی تلاش تھی۔

اتنے میں پیون ڈرنک لے کر آگیا۔ رانی نے جلدی سے کولڈ ڈرنک ختم کی۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی جانے سے پہلے روحیل نے میز کی دراز میں ہاتھ ڈالا۔

یہ لیں مس رانیہ آپ کی پہلی ماڈلنگ کا معاوضہ دس ہزار روپے آپ کاؤنٹ کر لیں۔

شکریہ...... رانی نے جلدی سے نوٹ پرس میں رکھ لیے۔

یہ تو بہت معمولی رقم ہے اگر آپ اسی طرح ماڈلنگ کرتی رہیں تو ایسے لاکھوں روپے آپ کے ہاتھوں میں ہوں گے۔

او کے سر...... اللہ حافظ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گئی۔ باہر کار میں فریحہ اس کی منتظر تھی۔ اسی نے رانی کو گھر پر ڈراپ کیا۔

آ گئیں تم اس کی اماں نے اسے دیکھتے ہی کہا وہ مشین پر سلائی میں مصروف تھیں۔

جی اماں آ گئی میں بہت تھک گئی ہوں۔ وہ چور نظریں بغیر نظریں ملائے جلدی، جلدی کمرے میں گھس گئی۔

مل گئی جاب کیا تنخواہ دیں گے۔

اماں! سانس تو لینے دو ابھی تو میں آئی ہوں اور آپ ہیں کہ سوال پر سوال کر رہی ہیں۔

مل گئی ہے جاب مجھے فریحہ کے کزن کے آفس میں۔

سچ مجھے تو کوئی امید نہیں تھی اب تجھے نوکری مل گئی ہے۔ تو گھر کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔

اماں مجھے روز، روز آفس بھی جانا نہیں ہو گا۔ کام کی نوعیت کے لحاظ سے میرے باس بلائیں گے۔

اچھا اماں نے نہ سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ ربیعہ بہن کے لیے کھانا لا نا۔

میں منہ ہاتھ دھو لوں پھر کھانا کھاؤں گی وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

اسے شدید بھوک لگ رہی تھی گھبراہٹ میں اس نے وہاں کچھ نہ کھایا تھا۔ رات میں اس نے الماری میں سے پرس نکالا اتنے سارے نوٹ اکٹھے دس ہزار وہ بے یقینی سے نوٹ دیکھ رہی تھی۔

اس نے ایک نظر صومیہ اور ربیعہ پر ڈالی وہ بے خبر سو رہی تھیں۔ ان سے تو میں بہت کچھ خرید سکتی ہوں۔ اپنے لیے بہت خوبصورت اور حسین سوٹ بلکہ اماں اور بہنوں کے لیے بھی ان کی پسند کے سوٹ لے سکتی ہوں۔

اماں کے سامنے تو اصل رقم بتا بھی نہیں سکتی انہیں شک ہو گا۔ اگر میں نے اس فیلڈ سے وابستہ کسی سے شادی کر لی تو میری قسمت چمک جائے گی۔ پھر تو بنگلہ، کار، سب میرا مقدر ہو گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے

روحیل کا چہرہ آ گیا۔ کیا ہوا جو وہ اس سے عمر میں بڑا تھا تھا تو پیسے والا وہ اپنے حسن کے نشے میں سرشار تھی۔

پھر اس نے وہ میگزین نکالا اور اسے الٹ پلٹ کرنے لگی۔ یہ میگزین اسے فریحہ نے دیا تھا۔ اس میں مختلف ماڈلز کے اسٹائل تھے۔ بقول فریحہ کے ان کی ادائیں دیکھ کر وہ ماڈلنگ کی دنیا کو فتح کر سکتی ہے۔ مستقبل کی پلاننگ کرتے وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اس دن کے بعد سے روحیل نے بہانے، بہانے سے اپنے روم میں بلانا شروع کر دیا۔ روحیل کی زبانی اپنے حسن کی تعریفیں سن کر رانی اپنے آپ کو ملکہ حسن سمجھنے لگی تھی۔

اب اسے ماڈلنگ سے زیادہ روحیل سے دلچسپی تھی۔ یہ تم مجھے ہر وقت سر، سر کیوں کہتی ہو ڈائریکٹ نام لیا کرو۔ اس نے پیار بھری نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

سر...... آپ کی اور میری پوزیشن میں بہت فرق ہے۔

میں اس فرق کو نہیں مانتا۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں دل کی گہرائیوں سے تم کو چاہتا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنا بنا لوں۔

یہ بات آپ اس سے پہلے کتنی ماڈلز کو کہہ چکے ہیں۔

دیکھو رانیہ تعریف تو میں نے اور ماڈلز کی بھی کی ہیں مگر ان کو اپنی مسز بنانے کا میں نے کبھی نہیں سوچا۔ تبھی تو میں نے شادی نہیں کی میں تو اپنے آئیڈیل کی تلاش میں رہا ہوں۔ تم سے مل کر میرے آئیڈیل کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔ میں تمہیں دیکھے بنا ایک دن نہیں گزار سکتا۔

روحیل کی زبانی اپنی تعریفیں سن کر رانی دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔

میرا ارادہ بہت جلد تم سے شادی کا ہے۔ تمہارے گھر والے ہماری شادی پر اعتراض تو نہیں کریں گے۔ روحیل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

نہیں ان کو کیا اعتراض ہو گا۔ اگر ہوا تو میں منا لوں گی۔ رانی بے اختیار بول اٹھی۔

مگر میرے لیے تو گھر والوں کو راضی کرنا خاصا مشکل ہو گا۔ خیر تمہاری خاطر میں یہ کام بھی کر لوں گا۔

اتنے میں یاسر آ گیا تو روحیل اس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

مس رانیہ آپ اگلے شوٹ کے لیے تیار ہیں۔ سیمی نے رانی سے کہا۔

سیمی مجھے آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔ ہاں بولو۔

پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے خاصی دیر نہیں کر دی تم نے باس کے روم میں سیمی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

آپ نے مجھے جو ڈریس پہننے کو دیا ہے میں وہ پہن کر ماڈلنگ نہیں کر سکتی۔

اوہو تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے اس سے پہلے تم نے نیم عریاں ڈریسز نہیں پہنے ہیں۔

مگر یہ ڈریس تو حد سے زیادہ اوور ہے۔ میں یہ پہن کر بے ہودہ پوز نہیں دے سکتی۔

ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ میں سر سے کہہ دیتی ہوں تم تیار نہیں ہو، کسی اور کو بک کر لیں۔ یہ کہہ کر وہ انٹرکام پر روحیل سے بات کرنے لگی۔

"جائیں آپ کو سر بلا رہے ہیں۔"

ابھی تو تم میرے روم میں تھیں تب تو تم نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی اب اچانک تمہارا موڈ کیوں بگڑ گیا ہے۔

روحیل نے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سر میں آپ سے بات کرنے ہی آئی تھی۔ مگر آپ نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔ آپ کو پتہ تو ہے میں گھر والوں کی مرضی کے بغیر یہ کام کر رہی ہوں۔ میرے گھر

والے اگر مجھے اس طرح کے ڈریس میں دیکھ لیں گے تو ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔

جب تم اس فیلڈ میں آئی ہو تو یہ سمجھ لو یہاں سب کچھ چلتا ہے۔ اگر تم اتنی ہی پارسا تھیں تو اس پروفیشن میں قدم کیوں رکھا۔

رانی، روحیل کے لہجے پر حیران ہو گئی۔

تھوڑی اپنے اندر لچک پیدا کرو میں ہوں ناں تم کو اپنانے کے لیے۔

کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی ہونے والی بیوی اس طرح کے ڈریسز پہن کر لوگوں کے سامنے آئے؟

میں جس سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہوں، وہاں ان باتوں کو برا نہیں سمجھا جاتا اور تمہارے متعلق میں اتنا جانتا ہوں کہ تمہارے گھر والوں کو تو یہ بھی نہیں پتہ کہ تم ماڈل گرل بن چکی ہو۔ تمہارے گھر والے تو اسی بات پر تمہیں گھر سے باہر نکال دیں گے کہو تو میں تمہاری کچھ فوٹو گرافس تمہارے گھر اور محلے میں پوسٹ کر دوں۔ میرے لیے یہ مشکل نہیں تمہارے چہرے کے ساتھ کسی اور کا جسم پوسٹ کرنا روحیل اپنی اوقات پر اتر آیا تھا۔

مس رانیہ اب تمہیں میرے اشاروں پر چلنا ہو گا۔ ورنہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ آر یو انڈر اسٹینڈ......؟

رانی کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اس نے خود کو بے بس محسوس کیا۔ سوچ کیا رہی ہو۔ گلیمر کی دنیا کے مزے لو۔ روحیل نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنے سے نزدیک کرنا چاہا۔

وہ ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کو عجیب گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس کی کوشش جلد سے جلد گھر پہنچنے کی تھی۔

تم اتنی جلدی آ گئیں کہہ کر تو گئی تھیں کہ بہت دیر لگے گی۔ اماں نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ بیڈ پر بیٹھ کر سینڈل اتارنے لگی۔ اماں اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئیں۔

یہ کیا ہے انہوں نے فیشن میگزین اس کے سامنے کیا۔ یہ مجھے تمہاری الماری سے ملا۔ کم بخت غارت ہو اس قسم کے بے ہودہ میگزین تمہیں ملے کہاں سے ضرور فریحہ نے دیئے ہوں گے۔ کم بخت تجھے شرم نہ آئی یہ دیکھتے ہوئے۔ خدا کی لعنت ہو گی ان عورتوں پر اب تو مجھے تجھ پر شک ہو رہا ہے۔

سچ بتا تو کہاں جاتی ہے نوکری کے لیے؟ آنے دو تمہارے ابا کو ان کو سامنے بٹھا کر بات کرتی ہوں۔ جا کر تیرا آفس دیکھ کر آئیں مجھے تمہارے لچھن ٹھیک نہیں لگ رہے دیکھتی نہیں تیری ان حرکتوں کا اثر بہنوں پر کیا پڑے گا۔

رانی کے دل کا غبار آنسوؤں کی شکل میں امڈ پڑا۔ اندر سے پریشان تو وہ پہلے سے تھی۔

اب بیٹھی کیا ٹسوے بہاتی رہے گی۔ منہ سے بھی کچھ پھوٹ ہمیں نہیں چاہیے ایسی کمائی۔

اماں اب ان باتوں کا کیا فائدہ میں نے تم سے اور ابا سے چھپ کر ماڈلنگ شروع کر دی ہے۔

اماں جاہل تو تھیں لیکن شرم و حیا کا مطلب اچھی طرح سے جانتی تھیں یعنی تو بھی ان بے ہودہ عورتوں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ میری بیٹی تو کس گمراہی میں پڑ گئی ہے۔ اماں نے ماتھا پکڑ لیا اور بے دم سی ہو گئیں۔

اماں میں نے ترستی ہوئی زندگی سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا تھا مجھے نہیں پتہ تھا کہ میں نے کس راستے کا انتخاب کیا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے تمام باتیں اماں کو بتا دیں۔ اس وقت اسے اماں جیسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔

ہم غریب ہیں مگر عزت تو ہے اور غریب کے لیے عزت ہی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔ عزت گنوا کر دولت کس کام کی جو لوگ ان عورتوں کی تصویریں

دیکھتے ہیں نا ان کی عزت کوئی نہیں کرتا۔ سب ان کی تصویریں دیکھ کر دل بہلاتے ہیں۔

کاش تو نے یہ کام کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا ہوتا۔ شرم و حیا کا سودا کر کے بھلا کوئی عزت دار ہوا ہے۔ آج کے بعد تو گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔ تیرے باپ کو پتہ چل گیا تو وہ میرے ٹکڑے کر دے گا۔ بڑی بیٹی کی حمایتی بنتی تھیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں۔ چھپانے میں میرے لیے مشکل ہے۔ تیری اس حرکت پر کیسے پردہ ڈالوں۔

رات کو سب کھانے کے لیے بیٹھے تو رانی نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔ اس میں ابا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ جس وقت سے وہ آئی تھی اپنے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ دل میں وہ الگ روحیل کی دھمکیوں سے خوف زدہ تھی۔ اگر اس نے جو کہا اس پر عمل کر دیا۔ تو وہ باہر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ جس محلے میں وہ رہتی تھی وہاں کے لوگ اس کے گھر والوں پر الگ انگلیاں اٹھاتے۔ میں نے جس راستے کا انتخاب کیا وہ غلط تھا۔ میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں اپنی زندگی کو ختم کر لوں یہ سوچ کر وہ چپکے سے اٹھی۔ خالی الذہن تو وہ پہلے تھی۔ اس نے ڈھونڈ کر مچھر مار دوا نکالی ابھی وہ شیشی کھول رہی تھی کہ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹی تو اماں کھڑی تھیں۔

یہ تو کیا کرنے جا رہی تھی؟ مرنا چاہتی ہے، کیا ہو گیا میری بچی کو؟ اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو یہ نہ سوچا اس طرح کی حرام موت مرنے کے بعد ہمارا کیا تماشا بنتا۔

اماں نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ رانی کو لگا جیسے ماں کے وجود سے لگتے ہی اس کے وجود کو ٹھنڈک میسر آ گئی ہو۔

اماں میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں میں نے ساری بات تو تمہیں بتا دی تھی۔

کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تمہیں جس آدمی نے دھمکی دی ہے وہ صرف تمہاری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے کہ تمہارے ماں، باپ کو علم نہیں ہے۔ وہ تجھے بلیک میل کر کے اپنے ہاتھوں کھلونا بنانا چاہتا ہے۔ اب اگر وہ تجھ سے کسی قسم کے رابطے کی کوشش کرے تو صاف کہہ دینا جو دل میں آئے کر لے میرے ماں، باپ کو سب پتہ ہے۔ ماں، باپ کو اعتماد میں نہ لینے کی وجہ سے تجھ پر یہ مصیبت آئی ہے۔ میں نے تو تیرے ابا کو بتا دیا ہے وہ کہہ رہے تھے تجھے گھر سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ شکر کر تو اس آدمی کے ہاتھوں اپنی عزت گنوانے سے بچ گئی۔

اماں! اماں! مجھے معاف کر دو۔ اماں میں بہک گئی تھی۔ فریحہ نے مجھے جو لالچ دیا۔ سبز باغ دکھائے۔ میں ان خوابوں کے تصور میں ایسا کھوئی کہ میں نے آپ کو دکھ دیا۔ میں آپ کی مجرم ہوں۔ میں نے آپ کو اور ابا کو دھوکا دیا ہے۔ مجھے سزا دیجیے میں غلط راستے پر جا رہی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بس اب چپ ہو جا میری کوئی نیکی کام آئی ہے جو اللہ نے تجھے مزید تباہ ہونے سے بچا لیا۔ اب کسی الٹی سیدھی حرکت کی ضرورت نہیں۔

اماں! میں تمہیں اب مزید کیا دکھ دوں گی میں تو سنہرے مستقبل کے خواب دیکھنے میں بہک گئی تھی۔ مگر اب جاگ گئی ہوں۔ میرا ارادہ آپ کو دکھ دینے کا نہیں تھا۔ میری تقدیر ہی خراب ہے۔

تو نے جو کیا غلط کیا۔ اب تقدیر کو الزام دینے کا کیا فائدہ۔ میں تیری ماں ہوں تجھے اس طرح کی موت کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ اماں نے اسے اپنے وجود سے چمٹا لیا اور رانی کو لگا اس کے سارے دکھوں کا بوجھ اماں نے اٹھا لیا ہو۔ ماں کی ممتا کے دروازے تو ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

☆☆☆

ایک مرد، ایک کہانی

ایم اشفاق بٹ

دنیا مکافات عمل ہے
انسان دوسروں کو اذیت پہنچاتے وقت
یہ قطعاً نہیں سوچتا کہ اسے اپنے گناہوں
کی سزا دنیا اور آخرت میں بھگتنا ہوگی۔

ایک شخص کی داستان عبرت جو خود کو ناقابل شکست سمجھتا تھا

پڑنے لگی ہے تم پہ زمانے کی اب نظر
جلنے لگے ہیں لوگ، میرے انتخاب سے

آج میں 80 کے پیٹے میں ہوں اور زندگی کی شام ہونے کو ہے یہ وہ عمر ہوتی ہے جب گھر والے بھی بوڑھا سمجھ کر ہر قسم کے فرائض سے سبکدوش کر دیتے ہیں۔

ایک وقت ایسا تھا جب میں جوان تھا لیکن میرے مالی حالات بہت عرصے بعد ٹھیک ہوئے تھے جہلم میں ایک چھوٹی سی ایجنسی تھی جو لوگوں کو مختلف ممالک بھجواتی تھی میرے مالی حالات کچھ خاص نہیں تھے۔ میں نے اس ایجنسی سے رابطہ کیا تو ایک ہفتے کے اندر اندر انہوں

نے مجھے دوبئی بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔
دوبئی میں مجھے ایک بڑی اچھی کمپنی میں ڈرائیوری کی نوکری مل گئی کمپنی کی گاڑی کمپنی کی مہیا کردہ رہائش تھی۔ میں کمپنی کے ورکرز کو جہاں کام ہو رہا ہوتا تھا لے جاتا تھا اور شام کو دیر سے واپس اپنے کمرے میں آتا تھا۔ دوبئی میں کام کرتے میرا چوتھا سال تھا کمپنی والوں نے مجھے اپنی گاڑی بھی لے دی تھی۔ مجھے اپنے کسی ذاتی کام سے کہیں آنا جانا ہوتا تو میں اپنی گاڑی پر جاتا۔

ایک دفعہ رمضان میں میں رات کو لیٹ اپنے کمرے میں آ رہا تھا کہ مجھے نیند کا ایک جھونکا سا آیا تو مجھے ایک زور دار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میری گاڑی اشارہ توڑ کر ایک بڑے ٹرک سے ٹکرا گئی۔

میرے منہ سے ہائے کی آواز نکلی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو ہسپتال کے ایک بیڈ پر پڑے دیکھا۔ میری دونوں ٹانگوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور دونوں ٹانگوں میں ناقابل برداشت درد محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ٹانگوں کو اوپر اٹھانا چاہا لیکن ٹانگیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔ قریب کھڑے ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میری دونوں ٹانگوں پر پلستر کیا گیا ہے۔

میری دونوں ٹانگیں سیدھی نہیں ہو رہی تھیں ڈاکٹر کہنے لگا۔

اگر آپ کی ٹانگیں ٹھیک ہو بھی گئیں تو ہمیں افسوس ہے کہ آپ ان پر کبھی کھڑے نہیں ہو سکیں گے۔ ڈاکٹر آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ میرے کان پھٹ رہے تھے۔

کیا میں اتنا مجبور ہو جاؤں گا کہ وہیل چیئر پر باقی زندگی گزارنا پڑے گی۔

اختر صاحب آپ کی ریڑھ کی ہڈی میں ایسی چوٹ آئی ہے کہ شاید اب آپ کی ٹانگیں آپ کے جسم کا بوجھ نہ سنبھال سکیں۔ جکڑی ہوئی ٹانگوں نے ذہن کو آزاد کر دیا میری آنکھوں سے آنسو تھم ہی نہیں رہے تھے۔

مجھے اکیلا چھوڑ کر جب ڈاکٹر باہر نکلا تو میرا ضمیر جو سویا ہوا تھا جاگ اٹھا ایک درد بھری چیخ نکلی جو میرے ضمیر کے سوا کوئی نہ سن سکا۔

اسلم میرا بہت اچھا دوست تھا میرے والدین بچپن میں ہی اللہ کے پاس چلے گئے تھے۔ وزیر آباد کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں تنہا جب روتے روتے سو جاتا تھا تو اسلم میرے لیے کھانا لیے کھڑا رہتا تھا۔ پڑھائی میں، میں اور اسلم اتنے اچھے نہیں تھے۔ اسلم کے والدین نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے جہاں اسلم گاڑیوں کی مرمت کا کام سیکھنے جایا کرتا تھا مجھے استاد سے بات کر کے اسی ورکشاپ میں ڈال دیا۔

اسلم بہت ہی بھولا بھالا اور شریف لڑکا تھا۔ میں اس کی نسبت زیادہ ہوشیار تھا۔ میرے بچپن کی محرومیوں نے یہی سکھایا تھا کہ صرف اپنے فائدے کی بات سوچو میں خود غرض بن گیا تھا لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی کہ اسلم سے مجھے پیار بھی بہت تھا۔ سولہ سال کی عمر میں ہی ہم دونوں نے مکمل کام سیکھ لیا ایک دن میں نے اسلم کے والدین سے بات کی کہ اگر ہم دونوں استاد سے علیحدہ کام شروع کر دیں تو ہمیں بڑا فائدہ ہوگا۔ اسلم کا نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن جس کی وجہ سے میں اسلم کے ساتھ ان کے گھر میں ہی رہتا تھا۔

اسلم کے والدین مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھتے تھے اور میں بھی انہیں اپنے ماں باپ ہی سمجھتا تھا۔ اسلم کے والدین فوراً مان گئے۔ لیکن جہاں ہمارے استاد کی ورکشاپ تھی وہاں پر ایک ہی ورکشاپ چل سکتی تھی۔ دوسری ورکشاپ کی وہاں گنجائش نہیں تھی۔ اسلم کے چچا ملتان میں رہتے تھے۔ ایک دن ہم دونوں انہیں ملنے کے لیے گئے تو اسی وقت چچا سے بات کی کہ اگر ہم یہاں ایک چھوٹی سی دوکان لے کر ورکشاپ کھول لیں تو آپ ہماری کیا مدد کریں گے۔

چچا نے کہا ادھر چاندنی چوک میں میری ایک ذاتی دکان خالی پڑی ہے اور اردگرد کوئی ورکشاپ بھی نہیں ہے اس لیے تم لوگ اسی دکان میں ورکشاپ بنا لو اپنے استاد کی اجازت سے۔

میں نے اور اسلم نے ورکشاپ بنا لی۔ ورکشاپ اسلم اور میری محنت سے بہت اچھی چلنے لگی۔ جوں جوں ورکشاپ چلنے لگی ہم بھی جوان ہونے لگے اور حسین خواب دیکھنے لگے۔ اسلم کا اور میرا ذہن شادی کے بارے میں بہت مختلف تھا۔

میرے ذہن میں ایک مخصوص لڑکی کا چہرہ ہر وقت گھومتا رہتا تھا جو بھرپور جوان خوبصورت گوری چٹی اور لبی ہو لیکن اسلم کا خیال تھا کہ جہاں کہیں اس کے والدین چاہیں گے وہ وہیں شادی کرے گا۔ اس بات پر میں اکثر اسلم کا مذاق اڑایا کرتا تھا کہ تمہارے والدین تو بس گاؤں میں ہی کسی دیہاتی لڑکی سے شادی کر دیں گے۔ جسے اپلے تھاپنے اور روٹیاں پکانے کے سوا کچھ نہیں آتا ہوگا اور جب میں اپنے خیالات اسلم کو بتاتا کہ میں تو ایسی لڑکی سے شادی کروں گا کہ اندھیرے میں بھی اس کا رنگ چمکتا ہوا نظر آئے گا تو اسلم خاموشی سے مسکرا دیتا۔

ورکشاپ چلتی رہی اور ہم جوان ہو گئے اسلم کی نسبت میرا قد زیادہ لمبا تھا اور مجھے پینٹ شرٹ پہننے کا بہت شوق تھا۔ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا اسلم کے والدین آتے رہتے تھے۔ جب بھی ہم گاؤں جاتے تو اسلم کے والدین ہماری شادیوں کا قصہ چھیڑ دیتے۔

آہستہ آہستہ اسلم نے اور میں نے مل کر ورکشاپ کے ساتھ ایک اور دکان خرید لی۔ اس میں ہم نے گاڑیوں کے ٹائر اور ٹیوب کی دکان بنا لی۔

ہم دونوں کی نیت اچھی تھی اس صاف نیت کی وجہ سے ہم دن بدن ترقی کر رہے تھے۔ اسلم کے والدین نے اسلم کو شادی کے لیے کہا لیکن اسلم کی سوچ ان سے مختلف تھی۔ اس کی ضد صرف یہ تھی کہ جب تک اختر کی شادی نہیں ہوگی وہ شادی نہیں کرے گا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے قائل کیا کہ میرے خیالات شادی کے بارے میں بہت مختلف ہیں۔

جب تک مجھے میری پسند کی لڑکی نہیں ملے گی۔ میں شادی نہیں کروں گا۔ ادھر میں نے اسلم کے والدین کو بھی سمجھا دیا کہ آپ پہلے اسلم کی شادی کر دیں میری باری آئے گی تو میں آپ کو اپنی پسند بتا دوں گا۔ اسلم کے والدین نے گاؤں کی ایک لڑکی دیکھ رکھی تھی۔ اسلم گاؤں سے ہو کر آیا تو بہت شرماتے شرماتے اس نے مجھے بتایا کہ اگلے ہفتے چاند کی پہلی تاریخ کو اس کی منگنی ہے۔

"اسلم تم نے گوگی کو دیکھا بھی ہے۔ جس سے تمہاری منگنی ہو رہی ہے یا بس نام سن کر شادی کر رہے ہو؟" میں نے اسلم سے پوچھا۔

اسلم یہ سن کر سنجیدہ ہو گیا......

"دیکھو اختر ماں باپ جو کرتے ہیں اولاد کی بھلائی کے لیے کرتے ہیں گوگی جیسی بھی ہے اچھی ہی ہوگی۔"

میں نے ہنس کر اسے کہا اچھا اچھا وہ گوگی جو بچپن میں ہمارے ساتھ گلیوں میں کھیلا کرتی تھی۔ کیا وہ جوان ہو گئی ہے۔ پھر میرے ذہن میں گوگی کا بچپن کا معصوم سا چہرہ ابھرا۔ گول مٹول سی، موٹی موٹی آنکھیں اور ہلکے ہلکے سنہری بال۔

میں نے اپنی سوچ کے مطابق سمجھ لیا کہ گوگی اب کافی خوبصورت ہو گئی ہوگی۔ اسلم منگنی کروا کے واپس آ گیا بہت خوش تھا اس بار بھی وہ گوگی کو دیکھ کے نہیں آیا تھا۔ شادی طے پا گئی بڑی عید کے چوتھے دن بارات جانی تھی۔ چچا اور میں ملتان سے عید سے ایک دن پہلے ہی وزیر آباد اپنے گاؤں پہنچ گئے۔ اسلم اور اس کے گھر والے بہت خوش تھے۔ عید سے اگلے دن چچا کے ایک پڑوسی کا فون آیا کہ چچی گاؤں آنے کے لیے جس بس

میں آ رہی تھی۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور چچی گوجرانوالہ کے ایک ہسپتال میں شدید زخمی ہے۔ چچا کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ چچا نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا میرا دل تو نہیں مان رہا تھا کہ اسلم کی خوشیوں میں شامل نہ ہوں لیکن چچا کے مجھ پر بہت احسانات تھے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اسلم کی خوشیوں کو ادھورا چھوڑ کر چچا کے ساتھ گوجرانوالہ ہسپتال آ گیا۔ پہلی دفعہ اسلم کی مجھے بہت یاد آئی میں اسلم کی شادی پر بہت خوش تھا۔

کچھ روز ہسپتال میں رہنے کے بعد چچی کی ٹانگ پر پلستر باندھ کر فارغ کر دیا گیا۔ ہم چچی کو لے کر ملتان آ گئے۔ چچا سے میں نے اجازت لی اور اپنے گھر آ گیا دروازہ کھلا ہوا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلم اور گوگی بھی آ گئے ہیں۔ اسلم جھاڑو پکڑ کر گھر کی صفائی کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر میرے گلے لگ گیا۔ میں نے پہلا سوال کیا کہ گوگی کہاں ہے نام تو اس کا شائستہ تھا لیکن سبھی گوگی کہتے تھے؟

اسلم کہنے لگا ابھی وہ اپنے والدین کے پاس رہے گی کچھ دنوں کے بعد جا کر لے آؤں گا۔ اس بات پر میں اسلم کو خوب تنگ کرتا رہا کہ شادی تمہاری گوگی کے ساتھ ہوئی ہے یا کہ اس کے والدین کے ساتھ۔ اسلم میری باتیں سن کر مسکراتا رہا۔

ایک دن ہماری دکان میں چوری ہو گئی چور سارا سامان لے اڑے اب ہم دونوں کے پاس پیسے نہیں تھے دکان میں ڈالنے کے لیے کچھ پیسے چچی کے علاج پر خرچ ہو گئے اور باقی اسلم کی شادی پر خرچ ہو گئے تھے۔

اب ہماری ورکشاپ پہلے کی نسبت کم ہی چلتی تھی کافی کافی دن فارغ بیٹھے رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ کہ ہمارے اردگرد اور بھی ورکشاپیں بن گئی تھیں۔

ہماری ورکشاپ بند ہو گئی میں نے اور اسلم نے علیحدہ علیحدہ ورکشاپ میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک دن میں نے اسلم کو کہا کہ جا کر گوگی کو لے آئے۔ ورنہ لوگ باتیں بنانے لگیں گے۔ اسلم یہ کہہ کر گاؤں چلا گیا کہ کل گوگی کو لے آؤں گا۔

اگلے روز میں صبح صبح اٹھ کر اسلم کے لیے الگ کمرہ سجا کر ورکشاپ چلا گیا۔ شام کو جب میں آیا تو اسلم آیا ہوا تھا۔

اس نے بتایا کہ گوگی میرے کمرے میں سرخ جوڑا پہنے اپنے بھائی کا انتظار کر رہی ہے۔ میں نے اسلم کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں گوگی کو بھابی نہیں بلکہ گوگی ہی کہوں گا۔ اسلم مجھے ساتھ لے کر آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ گوگی جو چارپائی پر بیٹھ کر سبزی بنا رہی تھی ایک دم کھڑی ہو گئی۔ فوراً اس نے سرخ دوپٹہ اپنے سر پر لے لیا۔

اسلم نے میرا تعارف کروایا۔

''لو گوگی تمہارا بھائی اختر آ گیا۔'' گوگی نے سلام کیا اور بولی ظاہر ہے اختر آپ کا بھائی ہے تو میرا بھی بھائی ہی ہے۔ اس نے یہ بات بہت آہستہ آہستہ شرماتے ہوئے کہی۔

اس نے نظریں اٹھائیں تو میرے ذہن میں گھومتی ہوئی خوبصورت سفید گوری چٹی اور لمبی سی لڑکی کی تصویر بالکل واضح ہو گئی۔ میں چند لمحے تک گوگی کو دیکھتا رہا۔ گوگی نے جب مجھے اتنی غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے محسوس کیا تو فوراً اپنی موٹی موٹی آنکھیں نیچے کر لیں۔

پہلی دفعہ مجھے اپنے اندر جلنے کی بو محسوس ہوئی۔ اتنی خوبصورت لڑکی اور اسلم نہیں نہیں...... گوگی تو میرے لیے ہے۔ اسلم اس کے ہرگز قابل نہیں۔

اسلم سے مجھے نفرت سی ہونے لگی اور گوگی سے محبت، بھائی جان بیٹھ جائیں گوگی کے ان الفاظ نے مجھے احساس دلایا کہ میں اسلم کے کمرے میں اس کی بیوی جسے مجھے بہن سمجھنا چاہیے کے سامنے کھڑا ہوں۔

گھبراہٹ میں، میں صرف اتنا کہہ سکا کہ گوگی مجھے بھوک لگی ہے۔ ذرا جلدی سے کھانا بناؤ اتنا کہہ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ جتنی دیر گوگی کھانا بناتی رہی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا۔ میں نے بڑا یقین دلایا اپنے آپ کو کہ یہ اسلم کی بیوی ہے جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اسلم کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگا۔ اوٹ پٹانگ خیالات ذہن میں آنے لگے۔ جی چاہ رہا تھا کہ اسلم کو قتل کر کے گوگی کو بھگا کر کہیں دور لے جاؤں۔ کسی طور اپنے آپ پر قابو نہیں پا رہا تھا۔

اختر بھائی کھانا کھا لیں۔ گوگی کی خوبصورت آواز سنائی دی۔ باہر صحن میں اسلم اور گوگی زمین پہ چٹائی بچھا کر کھانا رکھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ جذبات نے ہلچل مچائی ہوئی تھی۔ میرے اندر کا شیطان پوری طرح جاگ گیا تھا۔ جلدی جلدی کھانا کھا کر ان دونوں کو رشک و حسد سے دیکھتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

اب دن بدن رات بھر یہی سوچ تھی کہ گوگی کے ساتھ مراسم کیسے بناؤں اس کا حل یہی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلم کو راستے سے ہٹایا جائے کاروبار تو ویسے ہی تباہ ہو گیا تھا۔ میری بدنیتی نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اسلم صبح جلدی کام پہ نکل جاتا اور رات کو دیر سے گھر لوٹتا میری موجودگی میں اسے گوگی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ کیونکہ بظاہر میں گوگی کو بہن سمجھتا تھا۔

پھر میری کافی کوششوں کے بعد گوگی میری بات کو سمجھی کہ میں کیا چاہتا ہوں ہوا کچھ یوں کہ ایک دن میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں ورکشاپ سے جلدی گھر آ گیا۔ اس دن میں نے پہلی دفعہ گوگی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ابھی اسلم کے گھر آنے میں بہت دیر تھی۔ میں تو بس اسی موقع کی تلاش میں تھا گوگی نے روتے ہوئے کہا۔

اختر بھائی اسلم کتنا لاپروا ہے جب سے میں گاؤں سے آئی ہوں کبھی مجھے بازار نہیں لے کر گیا۔ سارا دن گھر پڑی رہتی ہوں اور رات کو بھی کوئی پیار کی بات نہیں کرتا میں فوراً اس کی کمزوری کو پا گیا تھا۔

گوگی تم رو کیوں رہی ہو میں تو شروع سے ہی سمجھ گیا تھا کہ تمہارا اور اسلم کا جوڑ ہی فضول ہے۔ کہاں تم جیسی خوبصورت اور گوری چٹی لڑکی اور کہاں اسلم جیسا کالا اور چھوٹے قد کا آدمی...... میں نے کمال کی اداکاری سے گوگی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ تمہاری اتنی خوبصورت آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ تمہارے گال رونے کی وجہ سے سرخ ہو گئے جو کہ اور بھی خوبصورت لگ رہے ہیں۔

عورت کردار کی کتنی ہی مضبوط ہو اپنی تعریف سننا اس کی کمزوری ہوتی ہے۔ میرا یہ وار بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ گوگی روتے روتے مسکرانے لگی

گلابی ہونٹ تھوڑے سے کھلے تو اس کے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت نظر آئے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا گوگی میری جان تمہارے تو دانت ہی انسان دیکھتا رہے تو ساری عمر گزر جائے۔

گوگی بھی مکمل طور پر میرے تعریفی جملوں سے پگھل چکی تھی۔ اختر ایک بات کہوں...... اس نے پہلی دفعہ مجھے صرف اختر کہا۔ کاش تم مجھے اسلم سے پہلے مل جاتے۔ میری بدقسمتی اختر تم کہاں تھے وہ بالکل میری شیطانی باتوں میں آ گئی تھی۔

گوگی کوئی بدقسمتی نہیں اب بھی ہم اسلم کو اعتماد میں رکھتے ہوئے اپنی خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ میں نے بڑے لگاوٹ بھرے انداز میں کہا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی گوگی فوراً اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے بیماروں جیسی اداکاری کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ اسلم اندر آ گیا۔ میں

کھانستا ہوا اپنے کمرے میں جانے لگا تو اسلم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ پکڑتے ہی اسلم پریشان ہو گیا۔ تمہیں تو بخار ہے۔ چلو میرے کمرے میں وہیں لیٹ جانا یہ کہتے ہوئے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔

گوگی اس طرح لیٹی ہوئی تھی کہ جیسے اسے کچھ خبر نہیں کہ میں اور اسلم اس کے کمرے میں آئے ہیں، اسلم نے گوگی کو آواز دی۔

''گوگی تمہیں معلوم ہی نہیں اختر اپنے کمرے میں بخار میں پڑا ہوا تھا۔''

اسلم پہلی دفعہ گوگی سے ذرا سخت لہجے میں بات کر رہا تھا میں اپنے آپ کو بڑا چالاک آدمی سمجھ رہا تھا کہ اسلم میری خاطر اپنی بیوی کو ڈانٹ رہا ہے۔ میں نے اس کو بھی اسلم کی بے وقوفی اور اپنی عقل مندی سمجھا۔

عورت کا نشہ بہت عجیب ہوتا ہے۔ اس نشے میں ہر بدبو خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو فاتح عالم سمجھتا ہے۔ عورت ہی کے نشے نے 1912ء میں اتنے بڑے جہاز کو سمندر میں غرق کر دیا تھا۔ جس کے آج تک آثار نہیں ملے۔ میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے کسی کے جذبات کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اسلم کے ساتھ اب میرا کوئی رشتہ نہیں تھا۔

اس لیے مجھے کوئی غم نہیں تھا کہ میرے اور گوگی کے تعلقات کے بارے میں جب اسلم کو پتہ چلے گا تو کیا ہو گا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میری زندگی کا مقصد ہی گوگی کو حاصل کرنا ہے۔ اسلم کے تمام احسانات میرے ذہن سے گوگی کا پیار داخل ہوتے ہی نکل گئے تھے۔ اب میرے لیے گوگی ہی سب کچھ تھی۔

گوگی گھبرا کر اٹھی اور بولی......

''کہاں ہیں اختر بھائی؟'' جونہی اس نے اختر بھائی کہا میری رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا میں فوراً سمجھ گیا کہ گوگی میرے شیطانی جال میں آ گئی ہے۔ اس نے اسلم کے سامنے دانستہ مجھے بھائی کہا تھا۔ بس اس دن کے بعد سے میں اور گوگی لوگوں کے سامنے بہن بھائی ہوتے اور علیحدگی میں صرف آدم و حوا۔

میں اور گوگی دنیا جہاں سے بے خبر بہت دور نکل گئے۔ گوگی اور میں نے ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں وعدے کیے۔ گوگی بہت خوش تھی۔ وہ دن بدن نکھرتی جا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں گوگی کو بہت چاہنے لگا ہوں۔

گوگی نے محلے میں ایک دو نوجوان لڑکیوں سے دوستی کر لی تھی۔ گوگی نے اپنے اور میرے تعلقات کے بارے میں ان لڑکیوں کو بتا دیا۔ آہستہ آہستہ یہ بات پورے محلے میں پھیل گئی کہ اختر اور گوگی کے ناجائز تعلقات ہیں۔ اسلم تک یہ بات پہنچی لیکن اس کے ماتھے پر شکن تک نہ پڑی وہ ہمیشہ محلے داروں کو ہی جھوٹا کہتا۔

ایک دن وہ قیامت ٹوٹ پڑی کہتے ہیں کہ برائی کا انت بہت برا ہوتا ہے۔ جس کا میں نے اور گوگی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسلم کی ایک پھوپھی زاد بہن گاؤں سے ملتان ہم سب کو ملنے آئی۔ وہ صرف ایک رات ہمارے پاس رہی اگلے روز اس نے صبح واپس جانے کو کہا۔ اسلم نے کہا کہ وہ اسے گاؤں چھوڑ آئے گا۔ اسلم نے گوگی کو بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ لیکن گوگی نے بیماری کا بہانہ بنا لیا۔

اسلم تیار ہونے لگا۔ میں نے کہا اسلم گوگی کی سہیلیاں دن کو اس کے پاس ہوتی ہیں۔ اور میں بھی شام کو جلدی آ جاؤں گا۔ اس لیے تم فکر مت کرو۔

میں صبح اسلم کی موجودگی میں ہی گھر سے ورکشاپ جانے کے لیے نکل آیا اور باہر ایک جگہ پر بیٹھ کر اسلم اور اس کی پھوپھی زاد کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ گوگی کو میں پہلے ہی سمجھا آیا تھا کہ جونہی وہ لوگ گھر سے نکلیں گے میں گھر آ جاؤں گا۔

اسلم اور اس کی بہن ایک گھنٹے بعد میرے سامنے اڈے کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ وقت مجھے آج تک یاد ہے۔ میں ایک بادشاہ کی طرح گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ذہن پر خمار سا طاری تھا دل جھوم رہا تھا۔ میں اپنے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوا، اللہ دیکھ رہا تھا۔ مگر میری آنکھیں بند تھیں۔ میرا ذہن نشے میں دھت اور جسم سن ہوا جا رہا تھا۔ میں دروازہ بند کیے بغیر گوگی کے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ گوگی بھی بڑے آرام سے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ آنے والے حسین لمحات کا تصور لیے ہوئے حقائق سے بے خبر وہ کچھ گنگنا رہی تھی۔

میں بھی اس کے ساتھ جا کر لیٹ گیا۔ ہم دونوں کے ذہنوں پر ایسا پردہ پڑا کہ ہم نے باہر والے دروازے کو بھی بند نہ کیا۔ ہم دنیا جہاں سے بے خبر ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے کہ اندر کمرے والا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اسلم ہم دونوں کو نظر آیا۔ پھر مجھے اتنا یاد ہے کہ ملتان کے ایک بہت ہی گندے ہوٹل کے بدبو دار کمرے میں صرف اتنا یاد آیا کہ دروازہ اچانک ہی کھلا تھا اور آواز سنائی دی تھی۔

''اسلم آپ واپس کیوں آ گئے؟''

اور پھر یہ بھی یاد آیا کہ میں تقریباً اسلم کو دھکا دے کر کمرے سے باہر نکلا اور اس ہوٹل میں آ کر دم لیا جب ہوش ٹھکانے آئے تو بھی گوگی کی یاد دل سے نہ گئی۔

اتنا بڑا حادثہ ہونے کے باوجود میں کمرے میں پڑا یہی سوچتا رہا کہ گوگی کو کیسے وہاں سے نکالوں۔

اگلے روز میں دوپہر کو چادر میں منہ چھپائے اپنی گلی میں چلا گیا۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ بے غیرتی جب سوار ہوتی ہے تو انسان اپنے آپ کو دلیر سمجھنے لگتا ہے۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا گوگی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے چہرے سے ذرا سی چادر ہٹائی گوگی جیسے میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کہا اختر اندر آ جاؤ میں نے پوچھا اسلم کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ وہ صبح ہی گاؤں چلا گیا ہے اور مجھے چھوڑ گیا ہے۔ میں نے پوچھا تم کو کیوں چھوڑ گیا ہے؟

گوگی نے مجھے کہا تا کہ میں تمہارے ساتھ بھاگ جاؤں میں نے حیرانگی سے کہا لیکن ہم جائیں گے کہاں کہیں بھی چلے جائیں گے۔ بس اب میں اسلم کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ گوگی مچل کر میری بانہوں میں گر گئی۔

گوگی نے اپنا زیور پیسے اور اپنی قیمتی چیزیں اٹھا کر ایک بیگ میں ڈالیں اور میرے ساتھ گھر سے نکل آئی۔ کچھ جمع پونجی میرے پاس بھی تھی گوگی کو ساتھ لے کر محلے سے نکل آیا۔ دل تھوڑی دیر پریشان ہوا۔ میں یہ شہر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ایک انجانی منزل کی طرف نکل رہا تھا۔ مگر یہ سب ذرا سی دیر کے لیے تھا۔

مجھے گوگی مل گئی تھی مجھے اب کسی کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میری وہی منزل تھی اور انسان اپنی منزل پر پہنچ جائے تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے اسے ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح ایک سایہ دار درخت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور منزل پا لینے کا نشہ بھی عجیب نشہ ہے۔ گوگی کو اپنے ساتھ دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے منزل خود بہ خود چل کر میرے پاس آ گئی ہو حالانکہ گوگی کو اور مجھے منزل کا پتہ نہیں تھا کہ اب ہم نے جانا کہاں ہے ہم ملتان سے ایک ٹرین میں بیٹھ گئے ہمیں نہیں پتہ تھا کہ ٹرین کتنی دیر چلتی رہی تھی ہم جس اسٹیشن پر اترے وہ جہلم تھا۔ جہلم ابھی تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ جہلم پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ یہی شہر ہمیں پناہ دے سکتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ایک کمرہ لیا ایک رات گزارنے کے بعد محسوس ہوا کہ ہوٹل میں بغیر

نکاح کے ایک دن بھی رہنا کتنا خطرناک ہے۔

نکاح فوری طور پر نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اسلم نے ابھی اسے طلاق نہیں دی تھی۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اسلم گاؤں سے واپس چلا گیا ہے یا کہ نہیں؟ اور کیا اس نے گوگی کو طلاق دی ہے یا کہ نہیں۔

ہوٹل میں رہتے ہمارا پانچواں دن تھا ایک دن میں بازار آیا تو مجھے ایک نوجوان نے آواز دی......

استاد آپ جہلم میں...... یہ آواز اور وہ نوجوان میری ورکشاپ جو ملتان میں تھی اس ورکشاپ میں کام کرنے والے ایک لڑکے کی تھی۔ وہ میرا شاگرد نعیم تھا۔ میں نے اسے ساری بات بتا دی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ مجھے ایک مکان کرائے پر لے کر دو اور کسی ورکشاپ میں کام بھی دلواؤ اس نے مجھے ایک مکان بھی لے کر دے دیا اور ایک ورکشاپ پر بھی لگوا دیا۔ میں نے اسے کہا کہ نعیم کسی طریقے سے یہ پتہ چلاؤ کہ کیا اسلم نے گوگی کو طلاق دے دی ہے یا کہ نہیں۔

نعیم نے کہا استاد ایک ہفتے میں آپ کا کام ہو جائے گا۔

ایک ہفتہ گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا نعیم ایک دن گھر آ گیا۔ اختر استاد آپ کا کام ہو گیا ہے۔ اسلم نے گوگی کو طلاق دے دی ہے اور ملتان چھوڑ کر واپس گاؤں چلا گیا ہے۔ میری اور گوگی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ جب ہم نے یہ سنا تو...... اب ہم وہ حسین خواب دیکھنے لگے۔ جب ہم دنیا کی نظروں میں میاں بیوی بننے والے تھے۔ دو تین روز کے بعد ہم نے باقاعدہ رجسٹرڈ میاں بیوی بن گئے۔

جہلم میں میرا بہت اچھا کام تھا۔ رات گئے تک کبھی کبھی کام کرتا جہلم میں آئے ہوئے تقریباً تین سال گزرے تھے کہ مجھے راولپنڈی ایک ضروری کام سے جانا پڑا۔ وہاں میرا تعارف ایک باہر بھیجنے والی ایجنسی سے ہوا۔ میں نے واپس جہلم آ کر پاسپورٹ وغیرہ مکمل کر کے راولپنڈی بھجوا دیے۔ تین سالوں میں ہمارے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا میری بڑی شدید خواہش تھی۔ بچوں کی لیکن گوگی کو بچوں سے الرجی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ بچوں کے بعد جسم میں خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے کافی دفعہ اس بارے میں بات بھی کی لیکن گوگی نے ہر دفعہ ہنس کر ٹال دیا۔

آخر میں گوگی کو چھوڑ کر دوبئی چلا گیا۔ ایک کمپنی میں ڈرائیوری کے ویزے پر...... شروع شروع میں، میں جب فون کرتا تھا تو گوگی کے پیار بھرے الفاظ اگلے فون تک میرے کانوں میں رس گھولتے رہتے۔

ایک سال بعد میں چھٹی آیا آ کر اپنا مکان بنوایا۔ بہت اچھی قسم کا میں ہر سال پاکستان چھٹی آتا اپنی گوگی سے ملنے۔ دوبئی میں ایکسیڈنٹ ہونے سے پہلے میں چھٹی گزار کر آیا تو میں نے گوگی میں بڑی تبدیلی دیکھی جتنے پیسے میں نے اسے بچانے کے لیے بھیجے تھے۔

اس نے ان پیسوں سے اپنا سونا بنوا لیا تھا۔ اکثر میری چھٹی کے دوران وہ شام کو دیر سے گھر آتی۔ ہر دوسرے تیسرے دن اسے کوئی تکلیف ہو جاتی اور ڈاکٹر کا بہانہ بنا کر دو تین گھنٹے گھر سے باہر گزار کر آتی۔

وہیل چیئر پر جب مجھے بٹھا کر میری کمپنی نے پاکستان واپس بھیج دیا اس دن بھی گوگی گھر پر نہیں تھی۔ نوکرانی گھر پر تھی۔ میں نے گوگی کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگی صاحب جی وہ تو انسپکٹر خالد کے ساتھ باہر گئی ہوئی ہیں اور یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ اس کی بات سن کر وہیل چیئر گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جو کچھ میں نے اسلم کے ساتھ کیا تھا وہ قدرت میرے ساتھ کر رہی تھی۔ مکافات عمل شروع ہو چکا تھا۔ عشق کا بھوت چند لمحوں میں اتر گیا۔

اسلم کے تمام احسانات مجھے یاد آنے لگے۔ کہ کس طرح اس نے مجھے سہارا دیا پر میں نے اس کے ساتھ کیا، کیا تھا۔ جب دنیا لٹتی ہوئی محسوس ہوئی تو میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ گوگی کو اب گھر میں نہیں رکھوں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میرا تو کوئی بچہ بھی نہیں جو میری دیکھ بھال کرے گا۔ میرے گناہوں کی سزا مجھے ملنی شروع ہو گئی تھی۔ شادی کے پانچ سال بعد بھی میں اولاد جیسی نعمت سے محروم تھا۔ یہ سوچ کر ایک کرب اور محرومی کا احساس میرے چہرے پر گہرا ہو گیا۔

پلٹ کر اپنی گزری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتا تو میرے اس خیال کو مزید تقویت ملتی یہ میرے گناہوں کا ہی نتیجہ تھا کہ میں اولاد جیسی نعمت سے محروم تھا۔

گوگی شام کو دیر سے واپس آئی مجھے دیکھ کر اس نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ میری ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ کر بہت روئی بار بار مجھ سے یہ پوچھتی رہی یہ کیا ہو گیا۔ اختر میری جان کمال کی اداکاری کی گوگی نے میرا دل نرم پڑ گیا۔

میں نے سوچا ہوسکتا ہے کہ نوکرانی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو یا شاید میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا جب رات کو میں نے گوگی سے بڑے پیار سے پوچھا...... گوگی یہ انسپکٹر خالد کون ہے۔ اختر میری جان انسپکٹر خالد بہت اچھا انسان ہے۔ جہلم تھانے میں وہ لگا ہوا ہے۔ گوگی نے اس کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیے۔ پھر ایک دن اس نے میرا تعارف انسپکٹر خالد سے کروایا۔ اچھا خوبصورت جوان آدمی تھا۔

انسپکٹر خالد نے گھر آنا جانا شروع کر دیا گھر کے کام کاج انسپکٹر خالد ہی کرتا تھا۔ اکثر گوگی اس کے ساتھ باہر سیر کرنے چلی جاتی تھی۔ ایک دن میں غسل خانے میں وہیل چیئر پر بیٹھا منہ دھو رہا تھا کہ مجھے انسپکٹر خالد کی آواز سنائی دی۔

گوگی میری جان چھوڑو بھی اب ضد کو پہلے تو میں نے تمہیں کبھی اس لیے مجبور نہیں کیا تھا کہ اختر دوبئی میں تھا۔ اور ہم آزادی سے اسی گھر میں عیش سے رہتے تھے۔ لیکن اب یہ لنگڑا کباب میں ہڈی بن گیا ہے۔ وہ بڑے پیار سے گوگی کی منتیں کر رہا تھا۔ اس لیے اب میں صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ مکان کی بات میں نے کر لی ہے کل ہم جہلم سے بھاگ کر کراچی چلے جائیں گے۔

گوگی کی اتنی سی آواز سنائی دی اچھا میری جان میں صبح تک انتظام کر لوں گی مجھے سنبھلتے سنبھلتے بھی چکر آ گیا اور میں وہیل چیئر سے زمین پر گر گیا گوگی میرے پاس چیختی چلاتی ہوئی آئی کیا ہوا میری جان......

اور بڑے پیار سے مجھے بستر تک لے گئی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

ڈاکٹر کو بلایا تو اس نے نیند کی گولیاں اور انجکشن لگا کر مجھے تسلی دی کہ پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ ذہنی دباؤ بہت زیادہ ہے۔ تھوڑا آرام کریں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس کے بعد تو مجھے کچھ پتہ نہ چلا ڈاکٹر کب گیا جب اگلے دن دوپہر کو میری آنکھ کھلی تو گوگی جا چکی تھی۔ میرے پوچھنے پر نوکرانی نے انسپکٹر خالد اور میری بیوی گوگی کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ جیسے جیسے نوکرانی بتا رہی تھی۔ تو میرے ذہن میں ملتان کی فلم چلتی جا رہی تھی۔ میں نے اسی دن اخبار میں گوگی کو طلاق کا اشتہار دے دیا۔

اب بڑھاپے میں قدم رکھا ہے۔ اسلم کا کچھ پتہ نہیں اور نہ ہی میں نے پتہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ زندگی رینگ رینگ کر گزار رہا ہوں۔ یقیناً جس عذاب سے میں گزر رہا ہوں گوگی بھی اسی عذاب سے گزر رہی ہوگی۔ کیونکہ مجھے زندگی کے اس موڑ پر یقین ہو گیا ہے۔ کہ اللہ دیکھ رہا ہے اب زندگی کے آخری ایام پورے کر رہا ہوں پتہ نہیں کب دم نکل جائے۔ اب تو ہر لمحہ ہونٹوں پر ایک ہی دعا رہتی ہے۔ میرے اللہ مجھے معاف کر دے۔

☆☆☆

سلسلے وار ناول

قسط نمبر-2

ریشم

تحسین انجم انصاری

عورت خوشبو ہے، روشنی ہے، محبت ہے، وہ ہر ایک کے لیے
نرم و ملائم جذبے بُنتی ہے، مگر اس کی اپنی زندگی ریشم کے
اس کیڑے کی مانند ہے جو دوسروں کے لیے
ریشم بُنتے بُنتے خود اپنے آپ کو فنا کر ڈالتا ہے۔

معاشرتی ناہمواریوں کی ترجمان ایک پُر اثر تحریر

تو نے الفاظ کی تاثیر کو پرکھا ہی نہیں
نرم لہجے سے تو پتھر بھی پگھل سکتے تھے

عادل اور ریشم دونوں نے چونک کر مسز شیرازی کی طرف دیکھا۔ عادل نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا......

"کیا بات ہے ماما......؟ آپ ایسے پریشان کیوں ہو گئیں......؟"

مسز شیرازی خالی خالی نظروں سے ریشم کو دیکھ رہی تھیں...... بڑی مشکل سے انہوں نے خود پہ قابو پایا...... اور عادل کے ہاتھ پہ ان کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی۔

"یونہی ذرا چکر سا آ گیا تھا بیٹا...... وہ میری کتاب...... وہ اٹھانے کو جھکیں تو عادل نے فوراً انہیں تھام کر اوپر کیا...... اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا راکنگ چیئر تک آ کر انہیں آرام سے بٹھا دیا...... اسی عرصے میں ریشم کتاب اٹھا کر ادھر آ چکی تھی۔

"کیا ہوا آنٹی...... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی......" اس کے چہرے پہ فکر مندی اور تشویش تھی۔ جو مسز شیرازی کو بھلی لگی۔

"لڑکی یقیناً دردمند دل کی مالک ہے۔" انہوں نے سوچا اور آنکھیں موندھ لیں...... جسم جیسے بے جان سا ہو گیا تھا۔ اپنا بوجھ اٹھانے کی سکت نہ تھی۔ عادل پریشانی سے گھٹنوں کے بل کرسی کے پاس بیٹھ گیا۔

"ماما...... سچ بتائیں کیا بات ہے...... پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔" وہ آنکھیں کھول کر بمشکل مسکرائیں۔

"ہر بات کبھی نہ کبھی تو پہلی بار ہوتی ہے ناں...... عمر کا تقاضا ہے۔"

"عمر کی بات نہ کریں ماما......" وہ جوش سے بولا۔ لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ اسے حقیقتاً تکلیف پہنچی ہے۔

"ابھی تو آپ اتنی ینگ ہیں...... ویسے بھی آپ اپنی عمر سے دس سال کم لگتی ہیں کوئی بھی آپ کو دیکھ کر میری ماں نہیں سمجھتا...... سب سمجھتے ہیں آپ میری بڑی بہن ہیں۔ مجھے ہی بتانا پڑتا ہے کہ آپ میری ماما ہیں...... کیوں ریشم میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں......؟" ریشم دلکشی سے مسکرائی۔

"عادل ٹھیک کہہ رہے ہیں آنٹی...... آپ اتنی خوبصورت ہیں اور اتنی کم عمر لگتی ہیں......" مسز شیرازی شفقت سے مسکرائیں۔

"اب تم دونوں بچے اتنے شریر ہو کہ میرا دل رکھنے کی خاطر میرے منہ پہ جھوٹ بول رہے ہو...... میں اس کی اجازت بالکل نہیں دوں گی۔"

"قسم سے ماما...... میں جھوٹ نہیں بول رہا...... ابھی بھی آپ اتنی پرکشش پرسنیلٹی کی مالک ہیں کہ کوئی بھی پروفیسر یا ریٹائرڈ فوجی افسر آپ کو اپنا دل پیش کر سکتا ہے۔"

"شرم کرو عادل...... وہ بے اختیار جھینپ گئیں...... اپنی ماں کے بارے میں اول فول بک رہے ہو...... حد ادب ملحوظ خاطر رکھا کرو......"

"یہ حد ادب درمیان میں کہاں سے آ گئی...... آپ تو میری بہترین دوست ہیں اور دوستوں کے درمیان ایسی حدود نہیں ہوتیں...... میں نے جو بھی کہا ہے اس میں ایک فیصد بھی جھوٹ نہیں ہے۔ کبھی تنہائی میں غور کیجئے گا......" پھر اس نے شرارت سے ماں کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔ میں تو شادی کر کے اپنی بیوی کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا آپ میرے جانے کے بعد تنہا رہ جائیں......"

"اوہ...... مسز شیرازی جنہوں نے بڑی حد تک خود پہ قابو پا لیا تھا خوش دلی سے مسکرائیں۔

"تو تم لڑکی کو رخصت کروا کر یہاں لانے کی بجائے رخصت ہو کر لڑکی کے ساتھ اس کے گھر چلے جاؤ گے......؟"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے...... اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے...... اس کی آنکھوں میں بے پناہ شرارت تھی جبکہ ریشم چپکے چپکے مسکرائے جا رہی تھی۔ ماں بیٹے کا دوستانہ رشتہ اسے محظوظ کر رہا تھا۔ تبھی اس کی نظر راکنگ چیئر کے پاس پڑی ٹیبل پہ گئی...... وہاں چائے کا کپ بھرا رکھا تھا جیسے ابھی ایک سپ بھی نہ پیا گیا ہو......"

"ارے آنٹی آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی...... آپ اجازت دیں تو اسے گرم کر کے لا دوں......" وہ تمیز سے بولی۔

"ماما دوبارہ سے گرم کی ہوئی چائے نہیں پیتیں ریشم...... چائے کے معاملے میں ماما کا ذوق بہت اعلیٰ ہے...... کتنی پتی ڈالنی ہے...... کتنی دیر دم لگانا ہے...... یا دم نکالنا ہے...... پھر کتنا دودھ ڈالنا ہے...... کوئی ایسی ویسی چائے نہیں پیتیں میری ماما......"

"تو میں تازہ چائے بنا لاؤں......" اس نے سوالیہ نگاہیں عادل پہ ڈال کر سادگی سے پوچھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے...... ساتھ میں میرے اور اپنے لیے بھی بنا لینا......" وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولا...... اور پھر فکر مندی سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا...... جبکہ ریشم متذبذب نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ کچن کس طرف ہے۔

انداز میں جھجک بھی تھی اور معصومیت بھی...... مسز شیرازی نے پیار سے بیٹے کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی۔

"میرے بھولے اور بدھو بیٹے اس کو ساتھ لے کر کچن میں جاؤ...... اسے کیا الہام ہو گا کہ کچن کدھر ہے اور میرے لیے کیسی چائے بنانی ہے......؟" عادل کھسیانی ہنسی ہنس کر جلدی سے اٹھا اور وہ اور ریشم ساتھ ساتھ چلتے کچن کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک نظر پیار سے دونوں کو ساتھ ساتھ چلتے دیکھا اور جیسے ہی وہ نظروں سے غائب ہوئے۔ نڈھال ہو کر سر کرسی کی بیک سے لگایا اور آنکھیں موندھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگیں...... آج ایک لڑکی نے ایک لفظ بول کر انہیں برسوں پیچھے دھکیل دیا تھا...... اس دنیا میں بھیج دیا تھا جس کے بارے میں وہ سوچنا بھی چاہتی تھیں لیکن سوچنے کی ہمت نہ پاتی تھیں۔

☆☆☆

سائرہ کی آنکھ کھلی تو دس بج چکے تھے۔ عالم کمرے میں نہیں تھا...... اور اسے زبردست بھوک لگی تھی۔ آج بھی یقیناً عالم نے نیچے جا کر ناشتہ کر لیا ہو گا اور اسے کچھ کھانے کے لیے جانے کیا کیا جتن کرنے پڑیں گے...... بے اختیار ہی آنکھوں میں آنسو آ گئے...... کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی...... کمرہ خوبصورتی سے آراستہ تھا...... مگر اسے اپنے گھر میں اپنا کمرہ یاد آ گیا......

اس کا کمرہ اسے کے تیز مزاج اور چلبلی طبیعت کی بنا پر سرخ رنگوں کے امتزاج سے سجا تھا بیش قیمت دبیز ایرانی قالین...... بھاری سرخ پردے...... صوفے اور بیڈ کی فرل اور چادریں اس نے پنک کلر کی رکھوائی تھیں تا کہ کمرہ ایکدم سے چیختا چلاتا نظر نہ آئے...... سائیڈ ٹیبل پہ رکھا ہوا خوبصورت ٹیبل لیمپ بھی قیمتی پنک پتھر سے بنا تھا اور شیڈ پنک ویلوٹ کا تھا...... بیس پہ سرخ ویلوٹ کے کپڑوں میں ملبوس رقاصہ کھڑی تھی جو ایک بٹن دبانے سے رقص کرنے لگتی۔

آج وہ ناشتے کے لیے کسی بھی معمولی چیز کو قبول کر سکتی تھی۔ لیکن اپنے گھر میں اس کے ہزاروں نخرے تھے۔ وہ دن اسے بھولے نہ تھے جب وہ ناشتے کی میز پہ نخوت بدتمیزی سے ملازمین کو ڈانٹ دیا کرتی تھی۔ ان کے بنائے ہوئے آئٹمز بے خوف و خطر ریجکٹ کر دیا کرتی تھی۔ امی فکر مندی سے اسے دیکھتے ہوئے ڈانٹنے لگتیں تو ابو اس کی ڈھال بن جایا کرتے۔

"کیوں ڈانٹتی ہو میری لاڈلی کو بیگم...... اگر اس کا دل نہیں چاہ رہا یہ سب کھانے کو تو کیوں مجبور کرتی ہو...... وہ جو چاہے گی بن جائے گی...... کوئی کمی تو نہیں کسی چیز کی جو تمہیں اعتراض ہو...... سب کچھ میری بیٹی ہی کا تو ہے۔"

"آپ نے ہی اسے بگاڑ رکھا ہے...... سر پہ چڑھا لیا ہے...... تمیز اور فرماں برداری نام تک کو نہیں ہے اس میں...... نوکروں سے یوں بدتمیزی سے بولتی ہے جیسے وہ انسان نہ ہوں جانور ہوں......"

"بیگم کیوں ناراض ہوتی ہو...... ابھی بچی ہے...... آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔"

"بچی......؟ بچی نظر آتی ہے یہ آپ کو...... گریجویشن کمپلیٹ کر لے گی ایک سال ہیں اور آپ کی نظروں میں ننھی بچی ہی رہے گی......؟" آج امی زیادہ ہی غصے میں تھیں اور سچ بھی یہی تھا کہ اسے بگاڑنے اور ضدی، خودسر اور بدتمیز بنانے میں سارا قصور اس کے باپ کا ہی تھا۔ جس پہ وہ جان چھڑکتے تھے۔

اکلوتی بیٹی تھی۔ اسے دیکھتے ہی روح سیراب ہو جاتی تھی۔ دل میں سکون اتر آتا۔ روشنی سی چار سو بکھر جاتی اگر اسے ذرا سی تکلیف بھی ہو۔ اس کی کوئی خواہش ادھوری رہ جائے۔ کوئی امی کے قصور پہ اس کو ہلکا سا بھی ڈانٹ دے ان سے برداشت ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ تو بس اس پہ محبتیں لٹانے کے عادی تھے اور دل و جان سے لٹاتے آ رہے تھے۔ میانہ روی کے بارے میں تو انہوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اعتدال کس چڑیا کا نام ہے یہ وہ صرف اسی وقت سوچتے تھے جب بیٹوں نے کوئی غلط کام کیا ہوتا اور انہیں اچھے اور برے میں تمیز سکھانے کے لیے سبق دینا پڑتا۔

"آپ بیٹی سے برتاؤ کے وقت انصاف سے کام نہیں لیتے...... سب بچوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا چاہیے...... اور یہ تو لڑکی ذات ہے...... اس کی پرورش تو زیادہ احتیاط کی متقاضی ہے...... آخر کو اسے اگلے گھر جانا ہے...... وہاں یہی اخلاق اور طور طریقے لے کر جائے گی...... یوں بدتمیزی اور خودسری کے مظاہرے کرے گی...... تو آپ کو تو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سارا الزام ماں کی تربیت پہ آئے گا......"

"اف امی...... وہ بدتمیزی سے بولی...... بس بھی کریں یہ لیکچر...... آخر میں نے کیا کیا ہے جو آپ وعظ کرنے بیٹھ گئیں...... میرا جو دل چاہتا ہے کھاؤں گی اور جو نہیں چاہتا ہرگز نہیں کھاؤں گی...... وہ نخوست سے بولی۔

غرور اور تکبر اس کے لہجے کے علاوہ ہر لفظ سے ٹپک رہا تھا۔ امی نے بے بسی اور کچھ جتاتی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا...... انہیں بھی اچھا تو نہ لگا تھا...... مگر جہاں لاڈلی بیٹی کا معاملہ ہو وہاں نظر چرا جاتے......

"اور آپ ہر وقت مجھے اگلے گھر کا طعنہ نہ دیا کریں...... مجھے کہیں نہیں جانا اپنے جان سے پیارے ابو کو چھوڑ کر...... میں ہمیشہ ان کے پاس رہوں گی۔" اس نے اٹھ کر ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور اپنا سر ان کے سر سے لگا لیا...... ابو تو جیسے فوراً ہی پگھل گئے اور اٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"میری بیٹی کہیں نہیں جائے گی...... اس کے لیے گھر داماد ڈھونڈوں گا...... ایسا قابل اور ہونہار لڑکا ڈھونڈوں گا کہ دنیا دیکھتی رہ جائے...... تم دیکھ لینا بیگم پھر تمہارے گلے شکوے سب دور ہو جائیں گے......"

بیگم نے ٹھنڈی سانس بھری...... اور بے حد فکر مندی سے باپ بیٹی کے پیار کو دیکھا...... پریشانی سے بولیں۔

"تو پھر ایسا داماد ڈھونڈیے گا جو بیٹی کی گز بھر لمبی زبان اور بدتمیزیوں کی برداشت کرنے کی ہمت رکھتا ہو......"

"امی آپ نے تو میری بھوک ہی ختم کر دی...... میں کچھ نہیں کھاؤں گی...... روزی سے کہیے گا...... میری چائے کمرے میں دے جائے۔" وہ ناگواری سے منہ بنا کر زور زور سے زمین پہ پاؤں مارتی چلی گئی تو شوہر نے خاموشی سے اسے دیکھا۔

"بھوکا بھیج دیا نا میری بیٹی کو...... کیسی ماں ہو تم...... بیٹی بھوکی ہی اندر چلی گئی اور تم پہ ذرا اثر نہیں ہوا۔"

بیگم نے افسوس سے انہیں دیکھا وہ اتنی غم زدہ تھیں کہ کوئی بھی جواب دینے سے گریز کیا......

سائرہ نے ٹھنڈی سانس بھری...... وہ سب لاڈ پیار...... وہ ساری حکمرانیاں وہ سب نعمتیں ٹھکرا کر میں آج یہاں پڑی ہوں تو یہ ضرور میرے گناہوں کی سزا ہی تو ہے...... میں اچھی بیٹی نہ تھی اچھی بہن بھی نہ تھی...... نہ ماں باپ کی عزت کی اور نہ بھائیوں کی...... یہ میرے گناہ ہی تو تھے جنہوں نے میری آنکھوں پہ پٹی باندھ دی اور مجھے عالم کی اصلیت نظر نہ آئی۔ یہ میرے گناہ ہی تو تھے جنہوں نے مجھے عالم کی خوبصورتی اور وجاہت میں جکڑ کر اس سے محبت کرنے پہ مجبور کر دیا۔ اپنے ماں باپ سے ٹکر لینے ان کی نافرمانی کرنے اور ان کی عزت کو خاک میں ملا دینے پہ مجبور کیا...... تاکہ میں اپنے کیئے کے نتائج بھگت سکوں...... اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو آ گئے...... جو پھسل کر گالوں پہ آ گرے۔

دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا...... سائرہ نے بے اختیار ادھر دیکھا۔ وہ امیر بیگم تھیں...... آنکھوں میں خشونت لیے۔ دونوں کولہوں پہ ہاتھ رکھے کسی تھانیدارانی کی طرح اسے گھور رہی تھیں...... جانے کیا بات تھی کہ انہیں دیکھتے ہی سائرہ کی جان ہوا ہو جاتی...... دل کسی خوفزدہ پرندے کی مانند کانپنے لگتا اور جسم بے جان ہو جاتا......

"کون مر گیا ہے جو یوں سوگ میں آنسو بہا رہی ہو......؟"

ماں باپ کے گھر ذرا ذرا سی بات پہ پٹاخ پٹاخ جواب دینے والی سائرہ کو عالم کی ماں کے سامنے کوئی جواب نہ سوجھتا تھا۔ زبان جیسے گنگ ہو جاتی اور ہونٹ یوں خشک ہوتے جیسے عرصہ دراز سے پانی کو ترس رہی ہو۔

"کیا گونگی ہو گئی ہو......؟" انہوں نے آنکھیں دکھائیں...... یا پھر بہری ہو گئی ہو۔ جو میرا سوال سنائی نہیں دیا...... میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے مہارانی...... سارا دن تخت پہ بیٹھ کے عیش کرتی ہو...... جیسے کسی دیس کی شہزادی ہو......

سائرہ نے خوفزدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"وہ میں بس آ ہی رہی تھی نیچے......" بمشکل اس کے ہونٹوں سے آواز نکلی۔

"نیچے......؟ نیچے کیا کرنے آ رہی تھی...... تمہارا وہ نکھٹو شوہر تو اپنا پیٹ بھر کر دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کے لیے نکل گیا ہے۔ جانے کب واپس آئے رات بھی ہو سکتی ہے...... تم سارا دن کیا کرو گی...... کیا صرف اس کے انتظار میں گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک سنو گی یا پھر کچھ کرو گی......؟"

"جی...... کیا مطلب......؟" اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے انہیں دیکھا۔

"بالکل ننھی بچی ہو بھئی تم تو......" وہ طنزیہ انداز میں کہتی ہوئی سامنے صوفے پہ بیٹھ گئیں...... ماں باپ نے عقل کی کوئی بات بھی سکھائی ہے...... یا صرف ناز برداریاں ہی کی ہیں...... کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے...... کہ آخر تم نے اگلے گھر بھی جانا ہے......؟"

"ان کی نظر میں اگلے گھر کا یہ تصور نہیں تھا......" پرانی عادتیں چھوٹتی نہیں اس لیے بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" وہ غضبناک ہو کر کھڑی ہو گئیں...... کیا کمی ہے اس گھر میں...... کتنے دنوں سے تم یہاں ہو...... تمہیں کیا نہیں ملا...... ہاں لیکن اس گھر کے بھی کچھ اصول ہیں...... یہاں رہنے کے لیے ذرا محنت کرنی پڑتی ہے اور محنت بھی ایسی نہیں کہ ہم تم سے جسمانی مشقت چاہتے ہیں...... صرف زبان ہی ہلانی ہے تمہیں اپنے اماں باوا کے سامنے...... چند الفاظ ہی تو منہ سے نکالنے ہیں...... اور زبان کی تو تم ہمیشہ سے تیز رہی ہو۔ سنا ہے الفاظ کے نشتر تمہاری نوک زبان پر ہر وقت دھرے رہتے تھے۔ تو اب وقت آ گیا ہے مہارانی...... انہیں استعمال کرنے کا...... دیکھنا یہ ہے کہ تم کتنی مہارت سے انہیں استعمال کرتی ہو...... اتنا سلیقہ تمہارے ماں باپ نے تمہیں عطا کیا ہے یا نہیں...... کوئی سمجھ بوجھ تم میں ہے یا نہیں...... اور یہ یقین کر لو...... میں زیادہ دن انتظار نہیں کروں گی...... اگر تم اپنا کام نہ کر سکیں تو تم دونوں کو اس گھر سے نکال باہر کروں گی۔"

وہ جیسے اچانک آئی تھیں...... ویسے ہی اچانک واپس چلی گئیں...... سائرہ تو بس پتھر کے بت کی مانند بیٹھی رہ گئی۔ وہ کیا کر سکتی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیے تھا...... اس ہفتے دس دن کے عرصے نے اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیے تھے۔ نہ وہ واپس جا سکتی تھی اور نہ ہی مستقبل کے لیے امید کی کوئی کرن نظر آ رہی تھی۔ اس کے تصور میں آتے سے باپ کا چہرہ آ گیا اس کا پورا وجود جیسے کانپنے لگا۔ کیا نہیں تھا اس چہرے پہ...... غصہ، اذیت، مایوسی، جلال، بے عزتی کا احساس اور اس کی شکل آئندہ کبھی نہ دیکھنے کا اٹل فیصلہ...... وہ پوری جان سے کانپ گئی...... اس نے تو کچھ سوچا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھا تھا...... اپنے کیے گئے فیصلے کا ادراک ہوا تو یوں لگا جیسے پچھلے دس دن خواب تھے۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اتنی عجلت اور ناسمجھی میں وہ یہ کیا کر بیٹھی تھی۔ وہ کس قدر بے وقوف تھی۔ اور اب جبکہ عالم کی محبت کا پول بھی کھل چکا تھا۔ تو اس کے دل میں امید کی ننھی سی کرن نے بھی دم توڑ دیا تھا۔

ہاں...... اب اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہ اس کے گناہوں کی سزا ہے۔ اللہ میاں نے اس کے لیے جو رسی دراز کی تھی وہ اچانک کھینچ لی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر روئے...... اتنا روئے اتنا روئے کہ اس کے تمام گناہ دھل جائیں...... لیکن اس کی بجائے وہ بے آواز روتی رہی...... اس کے رونے کی آواز نیچے ان ظالم لوگوں تک جائے یہ اسے گوارا نہیں تھا...... ابھی اتنی عزت نفس باقی تھی...... عزت نفس......؟ کیا واقعی عزت نفس تھی اس میں...... ابھی بھی...... اتنے سارے تلخ حقائق سے پردہ اٹھنے کے باوجود...... اپنے بے رنگ اور لاحاصل مستقبل کے باوجود...... زندہ رہنے کی کوئی آس نہ ہونے کے باوجود...... سب کچھ اتنی اچانک اور اتنی جلدی ہو گیا تھا کہ اسے یوں لگا وہ تیز رفتاری سے چلتے چلتے اچانک کسی گہرے گڑھے میں جا گری ہو......

☆☆☆

چائے بہت خوشگوار ماحول میں پی گئی...... مسز شیرازی کے لیے چائے تھی جبکہ عادل اور ریشم دونوں نے اپنے لیے کافی بنائی تھی۔ اس عرصے میں عادل کے چٹکلے اور ریشم کا دھیمے لہجے میں کچھ شرماتے اور کچھ جھجکتے ہوئے باتیں کرنا مسز شیرازی کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

وہ گاہے گاہے چائے کے سپ لیتے ہوئے غور سے اس پیاری سی لڑکی کو دیکھتی رہیں جو بار بار منہ پہ آئے بالوں کو پیچھے کر رہی تھی۔ ایسے میں اس کے چہرے پہ ہلکی سی جھنجلاہٹ انہیں بہت بھائی......

"تمہارے بال بہت خوبصورت اور سلکی ہیں ناں اس لیے بار بار کیچر سے نکل آتے ہیں......" انہوں نے اس کے بالوں کی تعریف کی تو وہ جھینپ گئی۔

"امی بھی یہی کہتی ہیں......"

"تو بیٹا...... میں نے تو اس نالائق کو کہا تھا...... تمہاری پوری فیملی کو انوائیٹ کرے...... تو پھر آپ لوگوں نے ہماری دعوت قبول کیوں نہیں کی۔ یا پھر اس نالائق نے کہا ہی نہیں......"

"نہیں آنٹی انہوں نے کہا تھا...... لیکن امی اکثر یہاں آتی ہیں تو انہوں نے بہت سی سہیلیاں بنا رکھی ہیں...... تو ابھی ان کا کام ختم نہیں ہو رہا...... اصل میں میری امی بہت سوشل ہیں...... جہاں جاتی ہیں منٹوں میں ان کے دوست بن جاتے ہیں۔"

"تو ہمارے لیے بھی وقت نکال لیں...... ایک دوست اور سہی۔"

"کیوں نہیں آنٹی...... وہ مسکرائی تو اس کے خوبصورت ڈمپل نمایاں ہوئے......"

"میں امی کو ضرور لاؤں گی...... وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ ان فیکٹ مجھے یقین ہے آپ دونوں کی بہت اچھی دوست ہو جائے گی......"

مسز شیرازی نے عادل کی طرف دیکھا...... وہ خاموش بیٹھا منہ پھلائے باہر دیکھ رہا تھا۔ ان کی گفتگو میں بالکل حصہ نہیں لے رہا تھا۔

"یہ تم نے منہ کیوں پھلا رکھا ہے عادل......"

"اس لیے کہ میں آپ سے ناراض ہوں...... اس کا منہ کچھ اور پھول کر کپا ہو گیا۔"

مسز شیرازی اور ریشم کو اس کا مضحکہ خیز چہرہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی...... بڑی مشکل سے قابو کر کے بولیں۔

"میرا بیٹا کیوں ناراض ہے مجھ سے......؟"

"آپ کا یہ نالائق بیٹا اس لیے ناراض ہے کہ آج کی تاریخ کے اندر آپ اسے چار بار نالائق کہہ چکی ہیں......"

"اور پانچویں بار آپ نے خود ہی کہہ دیا......" ریشم شرارت سے بولی۔

"سوری بیٹا...... ناراض مت ہو...... جو بھی کہا ہے پیار سے کہا ہے......"

"اچھا آنٹی میں اب چلتی ہوں...... امی منتظر ہوں گی...... آج بھی ایک دعوت پہ جانا ہے......" ریشم نے تکلف کیا تو جواباً عادل نے اسے گھورا۔

"لڑکی ...... یہ ایک ذمہ دار مرد کی مردانگی کے سراسر خلاف ہے کہ وہ ایک دوشیزہ کو تنہا جانے دے...... ہم تمہارے محافظ ہیں...... اور چھوڑ کر ہی آئیں گے......"

"لیکن آنٹی جو اکیلی ہو جائیں گی...... ان کی طبیعت......"

"میری طبیعت کا فکر مت کرو بیٹا...... میں اب ٹھیک ہوں......"

"آر یو شور ماما......" عادل فکرمندی سے جھکا۔

"ویری...... ویری شور......"

"تو میں یوں گیا اور یوں آیا......" اس نے چٹکی بجائی اور دونوں ہنستے ہوئے گھر سے نکل گئے...... مسز شیرازی سوچوں کے بھنور میں کچھ ایسے پھنسیں کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا...... وہ تو جب عادل نے واپس آ کر

زور سے سلام کیا تو وہ چونک گئیں...... وہ آتے ہی ان کے قریب کارپٹ پہ بیٹھ گیا...... اور ان کے گھٹنے پہ کہنی ٹکا دی۔

"ماما...... آپ مجھے کتنا بے وقوف سمجھتی ہیں......؟" انہوں نے چونک کر اسے دیکھا...... اور فکر مند سی ہو گئیں۔

"میں اپنے بیٹے کو بے وقوف کیوں سمجھوں گی...... میں تو جانتی ہوں کہ جناب اتنے عقل مند ہیں کہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں......" وہ شرارت سے بولیں۔

"اچھا...... وہ مسکرایا...... تو اگر آپ ریشم کے نام سے چونکی نہیں تھیں تو اس کا مطلب ہے آپ کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی...... میں بہت فکر مند ہوں ماما......"

"ارے میری جان...... کیوں خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو......"

"میں کچھ خوامخواہ نہیں کہہ رہا...... آپ کو اپنا مکمل چیک اپ کروانا ہوگا...... اور یہ میرا آرڈر ہے...... مجھے سمجھ میں نہیں آتا ڈاکٹر عدنان آخر کہاں غائب ہو گئے ہیں...... کتنے روز سے نظر نہیں آئے۔"

"وہ اپنے والدین سے ملنے امریکہ گئے ہوئے ہیں......" وہ بے اختیار بولیں عادل پہلے تو چونکا اور پھر معنی خیز انداز میں ماں کی طرف دیکھا۔

"بہت خبر رہنے لگی ہے آپ کو ڈاکٹر صاحب کی...... پھر تو یہ بھی پتہ ہوگا کہ واپس کب تشریف لا رہے ہیں......"

"اتوار تک آجائیں گے......" وہ بے اختیار بولیں پھر اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"اوہ تو یہ بھی آپ کو بتا گئے ہیں......" وہ شوخی سے بولا...... کب بتایا آپ کو......؟

"جانے سے پہلے آئے تھے ہمارے گھر...... پتہ تو ہے تمہیں......"

"ہاں پتہ تو ہے ماما...... لیکن میں سمجھا تھا کہ شاید وہ میرے موچ زدہ پاؤں کو چیک کرنے آئے ہیں...... مجھے کیا پتہ تھا کہ اپنے پروگرام کا حساب کتاب دینے آئے ہیں......"

"شرم کرو عادی...... اپنی ماں سے ایسی باتیں کرتا ہے کوئی بیٹا......"

"ماما کچھ بیٹے ایسے بھی ہوتے ہیں...... جو اپنی انا سے زیادہ اپنی ماں کی تنہائیوں اور اپنے بیٹے کے لیے دی گئی قربانیوں کا زیادہ احساس کرتے ہیں۔ آپ نے ساری عمر میرے لیے برباد کر دی...... اور میں آپ کا ذرا سا خیال بھی نہ کروں......" وہ بہت جذب اور عزت واحترام سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"اپنے بیٹے کی پرورش کر کے عمر گزارنے والی ماں کی زندگی کبھی برباد نہیں ہوتی عادی...... میں خوش قسمت تھی کہ تم میرے پاس تھے...... اپنی ویران زندگی میں بہاروں کے رنگ بکھیرنے کے لیے...... ورنہ اگر تم بھی نہ ہوتے تو میں کہاں جاتی...... میں تو مر ہی جاتی......"

"مریں آپ کے دشمن......" عادل نے جلدی سے ان کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اب تو آپ نے میری پرورش کر لی...... اچھا خاصا کڑیل جوان بن گیا ہوں...... اب آپ کو اپنے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔ کل کو میری شادی ہو گی...... میں اپنی بیوی میں گم ہو جاؤں گا...... پھر دس گیارہ عدد بچے ہوں گے ان میں مصروف ہو جاؤں گا...... میرے پاس تو آپ کے لیے وقت ہی نہیں ہوگا...... تو ایسے میں آپ کو کسی ایسے شخص کی ضرورت ہو گی...... جو آپ کی تنہائیاں دور کر سکے۔ آپ کے دکھ سکھ کا ساتھی ہو...... آپ کو وہ خوشیاں دے سکے جس کی آپ اصل میں حقدار ہیں۔ میرا کیا پتہ میں جاب کے سلسلے میں جانے کہاں ہوں......؟"

مسز شیرازی نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تو کیا...... تم بھی...... اپنے باپ کی مانند مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے......" بے اختیاری کے عالم میں ان کے منہ سے نکلا اور پھر خوفزدہ ہو کر انہوں نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔ جیسے کسی قسم کے کوئی بھی الفاظ منہ سے باہر آنے سے روکنا چاہتی ہوں۔

"اپنے باپ کی مانند......" عادل نے حیران ہو کر انہیں دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں درد کے سائے پھیل گئے...... کچھ دیر تک وہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ جبکہ مسز شیرازی عالم اضطراب میں منتظر تھیں کہ وہ کچھ تو کہے۔ آخر کافی دیر بعد اس کے لب کھلے۔

"میرے باپ...... یعنی میرے والد تو وفات پا چکے ہیں ناں......؟" پتہ نہیں وہ سوال تھا کہ امید کا کوئی جگنو جو اس کے لہجے میں تھا۔

"ہاں...... لیکن چھوڑ کر تو چلے گئے نا اکیلا...... ہمیشہ کے لیے......" وہ جلدی سے بولیں۔

وہ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا...... بے حس وحرکت...... ماما کو بالکل نہ دیکھا خلا میں کسی غیر مرئی نکتے کو گھورتا رہا...... پھر ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"اچھا ماما...... میں نماز پڑھ کے آتا ہوں...... مسجد میں جا رہا ہوں......" اور ان کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے گھر سے نکل گیا...... مسز شیرازی بری طرح پچھتائیں...... آنسوؤں کی کتنی ہی لڑیاں ان کے کے چہرے کو دھونے لگیں۔

☆☆☆

دونوں بیٹوں، بہوؤں اور پھر ان کے پوتے پوتیوں کی وجہ سے سارا دن گھر خوشیوں کا گہوارہ بنا رہتا۔ ہر دم بچوں کے دم سے رونق رہتی...... جو دھیرے دھیرے ابدالی اور آمنہ کے دلوں کو آباد کر رہی تھی۔ شاد کر رہی تھی۔ احد کے فری اور ارسی ذرا بڑے ہوئے تو فہد کے شہریار اور مریم ایک ساتھ ہی اس دنیا میں آگئے۔

جڑواں بچوں کی اپنی ہی رونق اور کشش ہوتی ہے۔

ایک کو ریحانہ سنبھالتی تو دوسرا دادی یا تائی کی گود میں سو رہا ہوتا اور اگر شہریار کے ساتھ ریحانہ مصروف ہوتی تو مریم دادی کی گود میں کھیل رہی ہوتی جیسے احد اور فہد میں محبت تھی۔ اسی طرح روحینہ اور ریحانہ بھی بہنوں اور دوستوں کی طرح رہتیں۔ کوئی رنجش، کوئی شکوہ نہ تھا ایک دوسرے سے۔ آمنہ نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے پورا گھر بہوؤں کے اختیار میں دے دیا تھا۔

پورے پانچ سال تک روحینہ نے انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔ ساس نے پیار اور شفقت کے علاوہ بھروسے اور اعتماد کی دولت بھی عطا کی۔ یوں بھی کام تو کوئی ہوتا نہ تھا۔ ہر کام کے لیے ملازم موجود تھے۔ لیکن ان کی دیکھ بھال کرنا۔ ان پہ نظر رکھنا تو گھر کی خاتون کا کام ہوتا ہے۔ ورنہ ملازموں کے ہاتھوں بھی گھر تباہ و برباد ہوتے دیکھے ہیں۔ روحینہ عقل مند لڑکی تھی۔ ملازموں کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کے ساتھ ساتھ انہیں کام میں کوئی کوتاہی کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی...... اور مالک کی آنکھ اگر ملازم کو دیکھ رہی ہے تو ملازم بھی چوکنا رہتا ہے اور اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ آمنہ بہت خوش تھیں کہ روحینہ نے پورے گھر کا نظام خوش اسلوبی سے سنبھال لیا ہے۔

ورنہ اب وہ خود کو اس قبل نہ پاتیں کہ اس ذمہ داری سے احسن طریقے سے نمٹ سکتیں...... اپنا ہوش نہیں تھا، گھر

کو کیسے دیکھتیں ملازموں پہ کیسے نظر رکھتیں...... وہ خدا کا لاکھ شکر ادا کرتیں کہ انہیں روحینہ جیسی بہو ملی ہے...... اور جب فہد کی شادی ہوئی تو انہیں ایک ہی فکر تھی کہ ان کی دونوں بہوؤں میں اچھے تعلقات ہوں...... محبت اور دوستی کے رشتے استوار ہوں تا کہ ان کی ہنستی بستی جنت یوں ہی پھلتی پھولتی رہے۔ ان کی دعا قبول ہوئی۔ روحینہ نے کھلے دل اور محبت بھری بانہوں سے ریحانہ کا استقبال کیا۔ ریحانہ اس سے بھی زیادہ صلح جو نرم خو اور محبت کی روشنی سے منور تھی۔ یوں پہلے دن ہی محبت کا رشتہ استوار ہو گیا۔ جو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

آج ناشتے کی میز پہ خوب گہما گہمی تھی...... فری آج پہلی بار سکول جا رہی تھی۔ چھٹیوں کے بعد روحینہ تھوڑی نروس تھی۔ فری کا لنچ باکس تیار کر کے رکھ لیا تھا۔ اس کا ناشتہ بھی تیار تھا۔ بس فری موجود نہ تھی۔ دادا، دادی، احد اور فہد مزے سے ناشتہ کرتے ہوئے بوکھلاہٹ پہ مسکرا رہے تھے۔ تبھی ریحانہ فری کو تیار کیے گود میں اٹھائے مسکراتے ہوئے ڈائننگ روم میں داخل ہوئی۔

"لیجئے بھابی...... آپ کی صاحبزادی نک سک سے تیار ہیں۔ اب آپ انہیں ناشتہ کروا دیجئے...... اور اگر آپ زیادہ نروس ہیں تو یہ خدمت بھی میں انجام دینے کے لیے تیار ہوں......"

"پاگل ہوئی ہو کیا......" انہوں نے گھور کر ریحانہ کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا بھابی...... کوئی غلطی ہو گئی......؟" ریحانہ حیران ہوئی، ابدال آمنہ، احد اور فہد بھی سوالیہ نظروں سے روحینہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"کچھ تو سوچا کرو...... اس حالت میں اس نومن کی دھوبن کو گود میں اٹھانے کی کیا تک ہے...... کچھ سمجھا کرو...... اور خیال رکھا کرو ان باتوں کا...... کوئی نقصان ہو گیا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کر سکوں گی......"

"اوہ...... ریحانہ بے اختیار جھینپ گئی...... وہ چار ماہ کی پریگننٹ تھی...... شہریار اور مریم کے بعد پانچ سال کے بعد خدا نے اسے پھر سے اپنے فضل و کرم سے نوازا تھا۔

"بھابی...... یہ نومن کی دھوبن کسے کہا......؟ اس نے بات کا رخ موڑنے کو مصنوعی غصے کا اظہار کیا...... میری اتنی پیاری گڑیا سی بیٹی ہے......"

"ماما...... نومن کی دھوبن کیا ہوتی ہے......"

"پھر کبھی پوچھ لینا...... پہلے اپنا انڈہ اور ٹوسٹ ختم کرو جلدی سے پھر دودھ بھی پینا ہے...... پہلا دن ہے دیر سے نہیں پہنچنا......"

"کھا تو رہی ہوں......"

"کھا تو رہی ہو...... لیکن اتنی آہستہ آہستہ...... ارسی نے جان بوجھ کر لقمہ دیا...... تو فری نے منہ بنایا......

"ماما بھائی تنگ کر رہا ہے......"

"میں نے کیا کیا ہے......" ارسی سکون سے بولا۔ میں تمہاری طرح ست تھوڑی ہوں تم فورتھ گریڈ میں آ گئی ہو...... پھر بھی چچی تمہیں تیار کرتی ہیں...... ماما ناشتہ کرواتی ہیں...... مجھے دیکھو خود ہی تیار ہو گیا ہوں اور خود ہی ناشتہ کر رہا ہوں...... تم سے پہلے ختم کروں گا۔

"بری بات ارسی...... بہن کو یوں نہیں کہتے...... اسے اصل میں عادت ہو گئی ہے نا مجھ سے تیار ہونے کی اور ماما کے ہاتھ سے ناشتہ کرنے کی...... اس لیے ہم اس کی مدد کر دیتے ہیں۔"

"تو کوئی میری مدد کیوں نہیں کرتا......؟" اس نے منہ پھلا لیا۔
"اس لیے کہ تم میرے بہادر بیٹے ہو......فہد نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا......تم خود ہی سب کچھ کر لیتے ہو......تم میرے سپر مین ہو......"
"چچی دیکھیں نا چچا ارسی کی سائیڈ لے رہے ہیں......"
"نہیں میری جان ایسا نہیں ہے...... آپ بس جلدی سے ناشتہ ختم کرو...... اور کسی بات کی طرف دھیان نہ دو...... ورنہ لیٹ ہو جاؤ گی......" ریحانہ نے اسے پیار کیا...... دادی اور دادا کی آنکھیں خدا کے حضور تشکر سے جھک گئیں۔

خدا خدا کر کے دونوں بچے سکول روانہ ہوئے تو دونوں سکون سے ناشتہ کرنے بیٹھ گئیں...... احد اور فہد بھی جا چکے تھے...... احد بچوں کو سکول ڈراپ کرتے تھے آفس جاتے ہوئے رستے میں سکول آتا تھا...... ڈرائیور بچوں کو ڈراپ کرتے ہوئے احد کو آفس لے جاتا...... روحینہ خالی ڈرائیور کے ساتھ بچے بھیجنے پہ راضی نہیں ہوتی تھی...... انہیں شوہر اور دیور کے علاوہ کسی غیر آدمی پہ بھروسہ نہیں تھا۔ اسی لیے احد کو ساتھ جانا پڑتا...... ابدال خوش تھے کہ اسی بہانے احد جلدی اٹھ کر تیار ہو جاتے ہیں ورنہ دیر تک سوئے رہتے۔
"ایک سال بعد شہری اور مریم بھی اسی طرح سکول جانے لگیں گے۔ پھر سب کام صبح صبح کرنے ہوں گے...... ابھی تو صرف پری سکول جاتے ہیں...... دیر تک سوتے رہتے ہیں۔" ریحانہ ناشتہ ختم کر کے اٹھنے لگیں تو روحینہ نے روک لیا۔
"تم کہاں چلیں حانی...... دودھ تو پیا نہیں......"
"بھابی آج دل نہیں چاہ رہا...... پلیز رہنے دیں ناں......"
"نہیں...... ایسے نہیں چلے گا...... دودھ تو پینا پڑے گا......"
"فہد...... حانی نے مدد کے لیے شوہر کی طرف دیکھا...... انہوں نے فوراً چہرہ پھیر لیا۔"
"بھابی کا کہا مانو حانی...... میں اس معاملے میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا......"
"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے روحینہ......" آمنہ بھی بولیں۔
"سب میرے خلاف متحد ہو گئے ہیں......" ریحانہ نے برے برے منہ بناتے ہوئے کہا۔
"محترمہ سب آپ ہی کا فائدہ چاہتے ہیں...... زیادہ مظلوم مت بنئے۔"
"آپ بھی......؟" ریحانہ آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی۔
"اف...... یہ عورتیں اور ان کے آنسوؤں کے خطرناک ہتھیار...... لو بھئی ہم تو چلے اس سے پہلے کہ اس طوفان میں ڈوب جائیں......" فہد کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے تو ریحانہ فٹافٹ دودھ پی کر پیچھے بھاگی۔
"ریحانہ آرام سے......" روحینہ بے اختیار بولی۔ بھاگنے کی کیا ضرورت ہے......"
ریحانہ دل ہی دل میں اتنی محبتوں پہ ناز کرتی بچوں کے کمرے میں آ گئی...... شہری معصوم فرشتوں کی طرح بے خبر سو رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ انہیں گدگدانے لگی۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اٹھنا تھا اور انہیں اٹھانے کے لیے اسے ایسے ہی حربے استعمال کرنے تھے۔ اٹھتے اٹھتے تیار ہوتے اور ناشتہ کرتے کرتے پری سکول کا وقت ہو جاتا...... سکول

صرف تین گھنٹوں کے لیے ہوتا تھا۔

ملازم نے یونیفارم تیار کر کے لٹکا دیئے تھے۔ جوتے بھی چمکا دیئے تھے۔ بس ننھے شہزادوں کی نیند کھلنے کا انتظار تھا۔ تبھی فہد اندر داخل ہوئے۔

"اٹھے نہیں دونوں ابھی......"

"کہاں اٹھے ہیں...... آفت کے پرکالے ہیں دونوں...... سارا دن ادھم مچائے رکھتے ہیں۔ ایک منٹ کے لیے چین سے نہیں بیٹھتے...... پھر رات کو دونوں کی ٹانگوں میں درد ہوتا ہے۔ فضلو سے دبواتے ہیں دونوں...... تب کہیں جا کر سوتے ہیں۔"

ریحانہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"اور آپ کو کیا نہیں مل رہا جناب......" وہ شوخی سے بولی۔

"تم......" وہ برجستہ بولی۔

آپ کے سامنے ہے آپ کی خادمہ......

"خادمہ......؟ کہاں ہے......" انہوں نے ادھر ادھر دیکھنے کی ایکٹنگ کی "مجھے تو کہیں نظر آ رہی ہے......"

"یہ رہی...... آپ کی نظر کمزور ہے کیا......" اس نے ایک ادا سے فہد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پہ رکھا تو وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"یہ تو ہمارے دل کی ملکہ ہے...... ہمارے دل پہ حکومت کرتی ہے......" فہد نے دونوں بازو اس کے گرد پھیلا کر اسے اپنے قریب کیا...... حانی کا دل بے اختیار ہونے لگا۔

"سچ......؟" وہ بڑی بڑی روشن آنکھیں ان کی آنکھوں میں ڈال کر نرمی سے بولی۔

"تمہیں شک ہے کیا......؟" وہ جواباً اسی انداز میں بولے۔

"ہوں...... اس نے روشن چہرے سے ہوں کو تھوڑا لمبا کیا...... ہے تو...... تھوڑا سا......"

"وہ کیوں......؟ کیا ہم سے کوئی غلطی ہو گئی......"

"کوئی ایک غلطی......؟" وہ شوخ تر ہوئی...... آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"اچھا تو یہ بات ہے...... آپ کو ہم سے کئی شکایتیں ہیں...... ذرا ہم بھی تو سنیں کوئی ایک بتائیں تو ہم کچھ عرض کریں......"

"اب اتنا ٹائم تو ہے نہیں ہمارے پاس...... وہ ایک دم سے پلٹی اور زیر لب مسکرائی۔ اصل میں ہمارے جگر کے ٹکڑے ہماری توجہ چاہتے ہیں...... وہ اٹھ گئے ہیں اور ہمیں انہیں تیار کرنا ہے۔"

"یہ بہانہ نہیں چلے گا...... اب تو آپ کو بتانا پڑے گا......" انہوں نے دوبارہ سے اپنے بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔

"پاپا...... میری ماما کو چھوڑ دیجئے......" موموایک دم ہی پیچھے سے رعب دار آواز میں بولی تو فہد گھبرا کر پیچھے ہٹے...... ریحانہ کے دلفریب زندگی سے بھرپور قہقہے نے اس کا چہرہ اور روشن بنا دیا۔

"آخر بیٹی کس کی ہیں...... پاپا پہ رعب نہیں جمائیں گی تو اور کیا کریں گی...... شہری بیٹا آپ بھی اٹھ جاؤ اب......" وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

رانی نے باہر خوبصورت وسیع وعریض لان میں روحینہ اور ریحانہ کے لیے چائے رکھ دی تھی۔ ساتھ میں لوازمات بھی تھے۔ آمنہ اور ابدال اس وقت آرام کر رہے تھے۔ وہ دونوں شام کی چائے شاذ و نادر ہی لیتے تھے۔ فہد اور احد ذرا دیر سے آتے تھے اس لیے چائے آفس میں ہی پی لیتے۔ فری اور ارسی ٹیوٹر کے ساتھ مشغول تھے۔ جبکہ مریم اور شہریار لان کے ایک کونے میں بچھی خوبصورت نرم اونی رنگا رنگ دھاگوں سے بنی کارپٹ پہ اپنی کلرنگ بکس اور کلرز پھیلائے انہماک سے تصویروں میں رنگ بھرنے میں مصروف تھے۔

روحینہ نے دونوں کو دیکھا پھر خوبصورت ہرے بھرے لان اور قسم قسم کے نایاب پھولوں کو دیکھتے ہوئے نظر ریحانہ پہ رک گئی۔ وہ لان کے ایک طرف بنے فوارے اور خوبصورت سنگ مرمر کے مجسمے پہ نظریں جمائے جانے کس سوچ میں ڈوبی تھی۔ آج کل وہ سیدھے طریقے سے آرام سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس لیے اس کے لیے خاص طور پہ وہاں ایزی چیئر رکھوائی گئی تھی۔ اسے اتنا گم دیکھ کر روحینہ نے اس کے چہرے کے آگے ہاتھ ہلایا۔

"کہاں گم ہو حانی......؟ کیا سوچ رہی ہو......؟"

ریحانہ نے چونک کر اسے دیکھا اور چائے کا ایک سپ لے کر سنجیدگی سے بولی۔

"امی اور ابو کے بارے میں سوچ رہی تھی......"

"کیا سوچ رہی تھی۔ جو اتنی سنجیدہ ہو رہی ہو......؟" روحینہ حیران ہوئی۔

"پتہ نہیں بھابی...... شاید یہ میرا وہم ہے......"

"کیا...... کچھ بتاؤ تو......"

"کیا آپ نے کبھی نوٹ نہیں کی یہ بات...... امی ابو اتنے خاموش اور اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہیں...... ساس اور سسر والی تو کوئی بات ہی نہیں ان میں...... ہر بات اور ہر معاملہ ہم دونوں پہ چھوڑ رکھا ہے...... بزنس بھی سارے کا سارا بیٹوں کے سپرد کر رکھا ہے...... کسی معاملے میں نہیں بولتے...... کوئی مشورہ نہیں دیتے۔" ریحانہ سنجیدہ تو تھی ہی لیکن ساتھ میں اس کے چہرے اور آنکھوں میں پریشانی اور فکرمندی کے سائے تھے۔

"تو تمہیں تو خوش ہونا چاہیے حانی...... ساس بہو کے جھگڑوں کے بارے میں جو داستانیں مشہور ہیں اور اس کے علاوہ حقیقت میں بھی ہم نے جو کچھ دیکھا ہے۔ اس پہ غور کیا جائے تو ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ہمیں اتنے اچھے ساس سسر ملے ہیں......"

"وہ تو ٹھیک ہے بھابی...... جانے کیوں ریحانہ کی آنکھیں نم ہو گئیں...... اللہ انہیں سلامت رکھے لیکن جو بات مجھے پریشان کرتی ہے وہ یہ ہے...... مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے...... انہیں کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے...... ہر بات کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ جیسے...... جیسے خدانخواستہ ان کے دل مر چکے ہوں...... انہیں زندگی سے محبت ہی نہ رہی ہو...... آپ سمجھ رہی ہیں نا بھابی میرا کیا مطلب ہے...... وہ یوں جی رہے ہیں جیسے زندگی کے دن پورے کر رہے ہوں......"

روحینہ نے پرسوچ انداز سے ریحانہ کی طرف دیکھا۔

"شروع شروع میں جب میں شادی کے بعد یہاں آئی تھی تو میں نے محسوس تو کیا تھا کہ دونوں بہت کم گو اور خاموش طبع ہیں۔ ایک دوسرے سے ضرورت کے مطابق ہی بات چیت کرتے ہیں...... فہد اور احد سے بھی اس طرح

گفتگو نہیں کرتے جیسے نارمل ماں باپ کرتے ہیں...... اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی......"

"وہ کیا......؟" ریحانہ کی بے چینی اور بے تابی قابل دید تھی۔

"امی ابو تو ایک طرف میں نے کبھی فہد اور احد کو بھی بھائیوں کی طرح مذاق کرتے یا ایک دوسرے سے شرارت کرتے نہیں دیکھا...... دونوں چپ چپ رہتے تھے...... بزنس کے علاوہ کبھی کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے...... ہاں فہد کبھی کبھی بچگانہ موڈ میں نظر آتا تھا۔ لیکن احد کی سنجیدگی کے آگے وہ بھی خاموش ہو جایا کرتا......"

"ایسا کیوں ہے بھابی...... ایک نارمل فیملی میں ایسا نہیں ہوتا......"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو......" میں نے ایک بار امی ابو کے بارے میں احد سے یہی سوال کیا تو پہلے تو انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا...... پھر بے تحاشا سنجیدہ ہو گئے۔

"بس وہ دونوں ایسے ہی ہیں...... کم گو اور خاموش طبع......"

"اور آپ...... آپ بھی تو ایسے ہی ہیں...... اتنا کم بولتے ہیں...... میرے ساتھ بھی اس طرح ہنسی مذاق نہیں کرتے جیسے شوہر اپنی بیویوں سے کرتے ہیں...... انہیں چھیڑتے ہیں بات بات پہ تنگ کرتے ہیں......"

"سمجھ لو میں بھی ایسا ہی ہوں...... وہ اتنی سنجیدگی سے بولے کہ ان کے سرد لہجے میں میں اندر تک کانپ گئی۔" لیکن پھر آہستہ آہستہ انہوں نے خود کو بدلنا شروع کر دیا...... شاید یہ میرے سوال کا نتیجہ ہی تھا۔ کیونکہ میں نے انہیں بتا دیا کہ ہمارے گھر میں تو ایسا ماحول نہیں ہوتا اور میں تو اتنی گھٹن میں زندگی نہیں گزار سکتی...... دھیرے دھیرے میں نے اپنی محبت سے انہیں بدلنے پہ مجبور کر دیا...... پھر فری کی آمد نے خوشگوار اثر ڈالا...... ارسلان کی پیدائش پہ تو وہ باقاعدہ ایک نارمل اور ہنس مکھ انسان نظر آ رہے تھے...... وہ بدلے تو اس کا اثر فہد پہ بھی ہونا شروع ہوا...... وہ کہتے ہیں ناں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے تو احد کو دیکھ کر فہد بھی خوش رہنا شروع ہو گیا...... وہ یوں بھی فطرتاً ہنس مکھ ہے۔ چلبلا اور شرارتی...... زیادہ دیر اپنے خول میں بند نہ رہ سکتا......"

"ہاں...... لیکن بھابی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں خول میں بند کیوں ہوئے...... اور سچی بات بتاؤں ان کے خود کو خول میں بند کرنے کا گہرا تعلق امی اور ابو کی سنجیدگی اور خاموشی سے ہے...... مجھے تو پکا یقین ہے......"

وہ کچھ دیر خاموش کچھ سوچتی رہی...... روحینہ بھی جیسے کڑیوں سے کڑیاں ملانے کی کوشش میں تھی۔

"کوئی بھی شادی شدہ جوڑا ایسے زندگی نہیں گزار سکتا...... سوائے اس کے کہ انہیں ایک دوسرے سے نفرت ہو...... یا ان کی شادی بہت غلط انسان سے ہو گئی ہو...... لیکن میں نے دیکھا ہے خاموش رہنے کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی بے حد کیئر کرتے ہیں۔ امی کو ذرا سی تکلیف ہو جائے تو ابو ان کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ ایسا ہی امی کے ساتھ ہے ابو کو کچھ ہو تو امی کتنا پریشان ہو جاتی ہیں...... بس ایک ہی وجہ نظر آتی ہے۔ دونوں کی اس حالت کی......"

روحینہ نے سوالیہ نظروں سے ریحانہ کی طرف دیکھا۔

"امی ابو کی آنکھوں اور چہرے پہ غم اور درد کی گہری چھاپ نظر آئی ہے مجھے...... لگتا ہے ان کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ گزر چکا ہے۔ جو ان کے لیے ناقابل برداشت تو تھا لیکن اسے برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا ان میں...... اور شروع شروع میں احد بھائی اور فہد بھی اسی غم کے زیر اثر تھے...... لیکن آپ کے اور میرے آنے کے بعد اور پھر ہمارے بچوں کی پیدائش کے ساتھ ساتھ وقت نے ان کے زخموں پہ مرہم رکھ دیا...... پوتے اور پوتیوں نے امی ابو کو بھی تھوڑا بدل دیا ہے یا پھر ان کے لیے بھی وقت سب سے بڑا مرہم ثابت ہوا ہے...... پتہ نہیں کیا ہے لیکن میرا

دل ان کے لیے بہت درد محسوس کرتا ہے۔ میں ان دونوں سے بہت محبت کرنے لگی ہوں بھابی...... اور ان کا یوں دل گرفتہ رہنا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا......"

"تم نے کبھی فہد سے بات کی......"

"ہاں کی تھی لیکن انہوں نے سپاٹ لہجے میں مجھے چپ کروا دیا...... کہ وہ اس قسم کی کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے...... آئندہ گریز کروں......"

"اس کا مطلب ہے...... کوئی بات ہے ضرور......"

"ہاں...... لیکن میرا خیال ہے ہمیں کریدنا نہیں چاہیے...... کیونکہ یہ سبجیکٹ بہت تکلیف دہ ہے ان کے لیے...... ہم انہیں تکلیف پہنچانے یا ان کا دکھ بڑھانے کا تصور نہیں کر سکتے...... امی ابو سے زیادہ سے زیادہ پیار و محبت سے پیش آنا اور ان کو پوری توجہ دینا، ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا ہی ہمارا فرض ہے...... احد بھائی اور فہد تو ہماری زندگی کے ساتھی ہیں...... ہمیں پوری کوشش کرنی چاہیے کہ کوئی ایسی بات نہ کریں کہ کوئی بھولی بسری بات ان کے دکھ بڑھانے کا موجب ہو......"

"ماما...... مایا...... شہری میرے کلرز توڑ رہا ہے...... پلیز اسے روکیے......"

ریحانہ بے اختیار اٹھی اور ان کی طرف بھاگی۔ حالانکہ آرام سے اٹھنا اس کے لیے کافی مشکل تھا۔

"آرام سے جانی...... احتیاط سے پلیز......" روحینہ کی آواز پہ وہ مسکراتے ہوئے آہستہ ہو گئی...... اور مریم اور شہریار کے قریب پہنچ کر ان کا جھگڑا نمٹانے لگی۔

☆☆☆

وہ ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ جی بھر کر رو لینے اور اپنی قسمت کا ماتم کرنے کے بعد بھوک برداشت کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ نیچے جانا اس سے بھی زیادہ مشکل...... آخر کرے تو کیا کرے...... کمرے میں بے چینی اور بے بسی سے چند چکر کاٹنے کے بعد اس کا ازلی غصہ عود کر آیا...... اس نے نیچے جانے کا فیصلہ کر لیا...... آخر یہ میرے شوہر کا گھر ہے...... میرا بھی اس پہ حق ہے...... میں کیوں ڈر کر یوں بھوکی بیٹھی رہوں...... اس طرح بی ہیو کروں گی تو باقی عمر کیسے گزرے گی......؟

یوں وہ آدھی سیڑھیاں ہی طے کر پائی تھی کہ سامنے لاؤنج میں امیر بیگم تخت پہ بیٹھی نظر آئیں...... وہ پان کی گلوری منہ میں ڈال رہی تھیں کہ سیڑھیوں کے درمیان میں متذبذب کھڑی سائرہ پہ نظر پڑی...... ایک معنی خیز سی مسکراہٹ ان کے چہرے پہ پھیل گئی...... بہادر بننے کا جو فیصلہ سائرہ نے کیا تھا...... اس کا جانے کیا ہوا...... اس کی تو سانس ہی سوکھ گئی...... خشک ہونٹوں کو تر کرنے کو زبان پھیری۔

امیر بیگم کی بھانجی عالیہ کی اس پہ نظر پڑی تو وہ طنزیہ ہنسی۔

"تو صبح ہو گئی بیگم صاحبہ کی...... تمہارے گھر میں کیا صبح اتنی دیر سے ہوتی ہے......"

"بھئی ان کے گھر سورج نے اپنا الگ وقت مقرر کر رکھا ہو گا۔" قاسم کی بیوی حنا نے فیشن میگزین کی ورق گردانی کرتے کرتے ایک بے پروا نظر اس کی طرف اچھالی......

"آہا...... مامی نیچے آ گئیں...... لبنیٰ اس کی طرف دوڑی...... اور اس سے لپٹ گئی۔ سائرہ نے پیار سے اسے لپٹا لیا۔

"آج سکول سے چھٹی ہے لبنیٰ......" اس نے یونہی پوچھ لیا......تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"ارے مامی......آپ کو پتہ ہی نہیں آج اتوار ہے......"
"ان کو اپنا پتہ نہیں ہے...... اور کچھ کیا جانے گی یہ......" ساس پھر طنز سے بولیں۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور کچن کی طرف بڑھی۔ جو سامنے نظر آ رہا تھا۔
"کدھر جا رہی ہو شہزادی......" امیر بیگم کی آواز آئی تو وہ رک گئی۔
وہ......وہ میں ناشتہ کرنے جا رہی تھی......وہ منمنائی۔
"واہ...... یہ ناشتے کا وقت ہے بیگم صاحبہ...... عالیہ نے طنزیہ انداز سے کہا۔ اب تو ہمارا کک دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہا ہے......" کک کے نام پہ جانے کون سی دکھتی رگ پہ ہاتھ آ گیا۔
"تو میں کیا کروں......وہ بے اختیار نخوت سے بولی...... میں نے ناشتہ نہیں کیا۔ تو مجھے ناشتہ کرنا ہے......"
"تم مجھ سے ایسے بات کرو گی......تم ہو کیا......؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی...... عالیہ چلائی میں بھی دیکھتی ہوں تم کیسے جاتی ہو کچن میں......" وہ بپھر کر اٹھی۔
"عالیہ جانے دو اسے...... امیر بیگم نے موقع کی نزاکت بھانپ لی...... کچھ بھوک اور کچھ اپنے گھر کی یاد نے اسے زخمی شیرنی بنا دیا تھا۔
مگر خالہ......؟
"میں نے کہا نا جانے دو...... امیر بیگم کا لہجہ قطعی تھا...... عالیہ مجبوراً خاموش ہو گئی۔ اندر جا کر اس نے پراٹھے اور آملیٹ کا آرڈر دیا اور وہیں رکھے ٹیبل اور چیئر پہ بیٹھ کر ڈٹ کر کھایا...... پیٹ بھر گیا تو جیسے ازلی سرکشی دم توڑ گئی...... ڈرتے ڈرتے باہر آئی تو امیر بیگم نے خشونت سے بھری نظروں سے اسے دیکھا۔
"آج تو عالیہ سے ایسے بات کر لی ہے...... آئندہ ایسا نہ ہو......"
وہ سنی ان سنی کر کے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی اور اپنے کمرے میں آ کر دم لیا...... اپنی جرات پہ وہ خود حیران تھی......لیکن قدرے اطمینان بھی تھا۔ پیٹ بھرا تو دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔ جو ہو چکا تھا اسے بدل نہیں سکتی تھی اور آنے والے وقت کے لیے اسے کوئی خوش فہمی نہ تھی۔
اگر عالم ساتھ ہوتا عالم کی محبت ساتھ ہوتی تو شاید وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر لیتی...... لیکن اب کب تک...... کتنے دن وہ ایسے رہ پائے گی...... نہ اپنے ہاتھ میں کوئی پیسہ تھا اور نہ ہی عالم کے پاس پھوٹی کوڑی...... اسے اپنا پرس یاد آیا جو نوٹوں سے بھرا رہتا تھا۔ کریڈٹ کارڈ الگ تھا اور ایک بڑے اکاؤنٹ کی چیک بک ہمیشہ اس کے پاس رہتی تھی۔ ایک دن میں وہ درجنوں جوتوں کے جوڑے اور قیمتی ڈریسز بلا جھجک بلکہ بنا مقصد ہی خرید لیا کرتی تھی......اور اب......؟ اب ایک وقت کا ناشتہ کرنے کے لیے نیچے جانا ایک امتحان سے کم نہ تھا۔
یہ اس کے اعمال ہی تھے جنہوں نے اسے عرش سے فرش پہ لا پھینکا تھا۔ وہ قیمتی محبتیں الگ جدا ہو گئیں...... وہ تہی دامن اور بے یار و مددگار ہو گئی...... آنکھوں سے خود ترسی میں ہی بے شمار آنسو نکل آئے اور وہ زار و قطار رونے لگی...... کہ اب رونے پہ ہی بس چلتا تھا اور رونا ہی قسمت میں رہ گیا تھا...... روتے روتے نیند کی دیوی جانے کب مہربان ہو گئی اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا...... پتہ نہیں کتنی دیر سوتی رہی تھی کہ کسی نے جھنجھوڑ کر اسے جگایا...... وہ گھبرا کر اٹھی اور سرخ آنکھوں سے سامنے دیکھا جو نیند کے مارے کھل ہی نہ رہی تھیں۔ سامنے عالم غضبناک چہرہ لیے کھڑا

تھا۔
"تمہاری ہمت کیسے ہوئی عالیہ آپا سے اتنی روڈلی بی ہیو کرنے کی......"
"کیا کیا میں نے......؟ گہری نیند سے اس انداز میں اٹھائے جانے پہ وہ مشتعل ہو گئی۔
"تم نے ان سے بدتمیزی سے بات کی......"
"وہ بلا وجہ مجھ پہ آوازیں کسے گی۔ طنز کریں گی اور میری اوقات یاد دلائیں گی تو ایسا ہی ہو گا۔" وہ ترکی بہ ترکی بولی۔
"وہ اماں کی منظور نظر ہیں...... اور تم...... تمہارے ہاتھ میں کیا ہے...... کہ تم یوں آپے سے باہر ہونے کا حق رکھو......"
"حق کی بات نہ کرو میرے ساتھ...... اگر میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے تو اس کی وجہ میرا نکھٹو شوہر ہے...... جو اتنے جھوٹ بول کر میرے ساتھ دھوکہ کرتا رہا۔"
عالم نے غصے سے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا...... لیکن اس نے انگلی سے اسے اشارہ کیا۔
"خبردار...... مجھ پہ ہاتھ اٹھانے کی غلطی نہ کرنا...... ورنہ میں پولیس کے پاس چلی جاؤں گی۔"
"ہونہہ...... پولیس کے پاس جاؤ گی......؟ عالم کا اٹھایا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا...... اپنے خاندان کی عزت کا جنازہ نکالو گی......؟"
"عزت کا جنازہ تو نکال چکی عالم...... اب تم یاد رکھنا...... میں سب کھو چکی ہوں۔ مجھے اور کچھ کھونے کا غم نہیں ہے کہ میں ڈرتی رہوں اور تمہاری مار کھاتی رہوں......"
اب اگر پولیس کے پاس جانے سے عزت جائے گی تو تمہاری جائے گی۔ امیر بیگم اور عالم کا نام بدنام ہو گا۔ اخباروں میں آئے گا......" عالم زچ ہو کر بیڈ پہ بیٹھ گیا۔
"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو سائرہ...... ایک چھوٹے سے قدم سے ہماری زندگی بدل سکتی ہے...... تم کیوں نہیں جاتیں اپنے والدین کے پاس......؟"
"اور تم کیوں کوئی کام نہیں کرتے...... تم ہائی لی کوالیفائیڈ ہو...... اچھا خاصا پیسہ کما سکتے ہو...... ہم آرام سے گزارا کر سکتے ہیں عالم......"
"کاش میں تمہیں سمجھا سکتا...... یہ ہماری خاندانی روایات کے خلاف ہے......"
"خاندانی روایات......؟" وہ حیران ہوئی۔ تم کیوں ان روایات سے چمٹے رہنا چاہتے ہو...... یہ روایات بے غیرتی اور بزدلی کی نشانی ہیں...... اور تم ان پہ فخر محسوس کرتے ہو۔ غرور ہے تمہیں ان پہ...... تم کیوں نہیں سمجھتے کہ گھر میں بیٹھے رہنا اور کوئی کام نہ کرنا مرد کی مردانگی کی توہین ہے۔ مرد کو خدا نے عورت کا کفیل بنایا ہے...... چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھنے اور عورت کی کمائی کھانے کے لیے نہیں جو مرد عورت کے میکے کی دولت پہ بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔
اپنے زور بازو پہ بھروسہ کرو...... پھر دیکھنا خدا تمہیں کیسے نوازتا ہے۔ میں تمہاری باتوں میں آ کر ایک غلطی کر چکی ہوں...... ماں باپ کی عزت خاک میں ملا چکی ہوں۔ اب مجھے واپس جا کر بھکاری بننے پہ مجبور نہ کرو...... ایک اور غلطی کرنے پہ نہ اکساؤ......"

وہ رو پڑی تو عالم اسے دیکھتا رہ گیا...... دل پہ تھوڑا اثر ہوا...... اس پہ ترس بھی آیا......
"تو میرے ساتھ شادی تمہارے نزدیک غلطی تھی......؟" اسے کوئی اور سوال نہ سوجھا۔
"تو کیا نہیں تھی......؟" اس نے برجستگی سے اس کا سوال اسی کو لوٹا دیا۔
"تمہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں۔"
"مجھے تو تھی عالم...... تمہیں نہیں تھی...... تم نے ڈرامہ کیا......"
"تو کیا اب نہیں ہے۔"
"اب......؟" اس نے نظریں پھیر لیں...... پتہ نہیں......" وہ کچھ دیر نہ جانے کیا سوچتی رہی...... پھر اذیت بھری نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔
"تم بتاؤ عالم...... تم جیسے مرد سے کوئی محبت کر سکتا ہے...... تمہارے پاس ہے کیا ایک اعلیٰ ڈگری اور ایک خوبصورت اور وجیہہ پرسنلٹی کے علاوہ...... اور یہ خوبصورت چہرہ اندر سے کتنا کالا ہے...... تمہارا دل، دل نہیں سینے کے اندر رکھا پتھر کا ایک ٹکڑا ہے۔ تمہارے خیالات اور نظریات اتنے گندے ہیں۔ یہ سب جان لینے کے بعد میں تم سے کیسے محبت کر سکتی ہوں...... ہاں...... میں اس سب کے باوجود تمہارے ساتھ بندھی ہوں تو یہ میری مجبوری ہے...... میں واپس نہیں جا سکتی...... بلکہ تمہیں اپنی سزا کے طور پہ قبول کر رہی ہوں۔ اب میرے ساتھ جو بھی ہو...... چاہے وہ تم کرو...... تمہاری ماں یا تمہاری آپی...... میں سب جھیلوں گی۔ اپنی سزا سمجھ کر...... میں اسی قابل ہوں...... مجھے اپنے کیئے کا خراج ادا کرنا ہے۔" اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اور چہرہ پتھر...... عالم نے ایک نظر اسے دیکھا اور سست روی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا...... آہستہ آہستہ نہ جانے کیا سوچتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا...... لاؤنج میں آ کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے کسی کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔
"دماغ درست کر آئے اس کا......؟" عالیہ آپا کی تیز آواز سے چونک گیا۔
"جی نہیں آپا......" وہ تھوڑی سی تیزی سے بولا۔
"اوہ...... یعنی اب تم بھی اس کے نقش قدم پہ چلنے لگے...... میاں تم تو اسی کی زبان بولنے لگے...... ہماری تو لگتا ہے اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں رہے گی......"
"کمال کرتی ہیں آپا...... کس بات پہ ڈانٹوں اسے...... ناشتہ کیوں کیا اس کے......؟"
"اور وہ جو ہمارے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئی...... وہ کس کھاتے میں جاتی ہے......؟"
"اگر آپ اسے نہ اکساتیں تو وہ بھی آرام سے گزر جاتی...... آپ کو طنز کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بھی کوئی ایسی گئی گزری نہیں ہے کہ آپ اس سے ایسا سلوک کریں...... بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے...... لاکھوں میں کھیلتی رہی ہے......"
"ہم نے تو ان لاکھوں کی ذرا سی جھلک بھی نہ دیکھی...... پھر کس بات پہ اتنی اکڑ......؟"
"اور دیکھیں گی بھی نہیں......" وہ زیر لب بولا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا میاں...... ذرا کھل کر بات کرو......"
اگر اس سے اس طرح کا سلوک روا رکھیں گی...... تو وہ بھی ہتھے سے اکھڑ جائے گی پھر امید بھی نہ رکھیں کہ کبھی لاکھوں کا منہ دیکھ سکیں گی۔"

''اے لو...... وہ بڑے انداز سے آنکھیں مٹکا کر بولیں...... دیکھ رہی ہیں خالہ...... سن رہی ہیں اس کی باتیں...... جیسے ہمیں ضرورت ہے اس کے لاکھوں کی۔ اے ہماری لبنیٰ کے ابا ہمارے لیے اتنا چھوڑ گئے ہیں کہ ہمیں کسی ایرے غیرے کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو تمہاری محبت میں سب کہہ رہے تھے۔ تمہاری ہی فکر تھی ہمیں......''

''نہ کریں آپ ہماری فکر آپا...... ہماری بیوی ہے ہم دیکھ لیں گے......''

''اتنا سر نہ چڑھاؤ میاں کو کہ کل کو سر پہ ناچنے لگے...... ہم نے دنیا دیکھی ہے...... تمہارے اور تمہاری بیوی کے تیور کچھ اچھے نہیں دکھ رہے ہمیں...... کیوں خالہ......؟''

''کبھی چپ رہنا بھی اچھا ہوتا ہے...... عالم کو زیادہ تنگ نہ کرو......'' امیر بیگم سروتہ چلاتے ہوئے مسلسل عالم کا جائزہ لے رہی تھیں...... وہ جانتی تھیں عالم کو زیادہ دیوار سے لگایا تو بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے...... یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں ہے۔ انہیں کوئی مضبوط پلان بنانا پڑے گا......

''لو خالہ آپ بھی ہمیں کو ڈانٹ رہی ہیں...... وہ ایک دم سے رونے لگیں...... آخر ہم نے کیا کہہ دیا...... عالم کی بھلائی کو ہی سب کہہ رہے ہیں......''

''نہ کرے کوئی ہماری بھلائی......'' عالم بیزاری سے بولا۔ یہ ہر وقت کی پلاننگ، ہر وقت کے جوڑ توڑ...... تنگ آ گیا ہوں ان سے...... اچھی بھلی جاب کر رہا تھا...... جیب میں پیسے ہوتے تھے...... خوامخواہ چھیڑ دی آپ نے...... اگر سائرہ ماں باپ سے پیسے نہیں حاصل کر پائی تو کیا میں آپ کا منہ دیکھتا رہوں گا ساری عمر......؟

''تمہیں پیسے چاہئیں بیٹا...... امیر بیگم پیار سے بولیں...... یہ لو کتنے پیسے چاہئیں انہوں نے اپنا پرس اٹھایا...... ہزار ہزار کے دس نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے یہ لو...... کچھ دن ان سے گزارا کرو...... پھر اور دے دوں گی...... جب تک سائرہ راہ پہ نہیں آتی۔ ان سے گزارہ کرو...... میرے پاس کمی تھوڑی ہے......''

''نہیں چاہئیں مجھے آپ کے پیسے......'' وہ بیزاری سے بولا اور بیرونی دروازے کا رخ کیا...... چند لمحوں میں وہ گھر سے باہر تھا۔ امیر بیگم کا ماتھا ٹھنکا...... آپا اور امیر بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا...... اور پھر رخ پھیر لیا...... آثار اچھے نہیں تھے۔

''اس لڑکے نے بچپن سے ہی مجھے مشکل وقت دیا ہے۔ اب جانے اس کے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ عالیہ تم میری مانو تو کچھ دن خوامخواہ میں سائرہ کے منہ مت لگو......''

''ہونہہ......'' عالیہ نے تیوری چڑھائی۔

لبنیٰ گڑیا سے کھیلتے ہوئے ذرا مسکرائی۔

ثناء نے فکرمندی سے اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔

جانے کیوں اس کا دل سائرہ کی بے چارگی پہ دردمندی سے دھڑکنے لگا۔

☆☆☆

مسز شیرازی نے دراز سے سبز رنگ کی وہ ڈائری نکالی...... جو اپنی وضع قطع سے پرانی لگ رہی تھی۔ رنگ جگہ جگہ سے خراب تھا اور اندر اوراق کا رنگ بھی تھوڑا سا بدلا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ غیر محسوس انداز میں کانپ رہے تھے۔ جب بھی وہ بہت زیادہ تنہا اور اداس ہوتیں...... یا ماضی کے دریچوں سے کچھ چہرے جھانک کر انہیں پریشان کرنے لگتے تو

بے اختیار ان کے قدم اس مقفل دراز کی طرف بڑھتے...... وہ ڈائری باہر نکالتیں...... اس پر نرمی سے ہاتھ پھیرتیں...... لیکن اسے کھولنے یا پڑھنے کی کوشش نہ کرتیں...... کبھی ہمت ہی نہ ہوئی...... ایک بار جو درد بھری داستان رقم کر دی تو اس کے بعد اسے دوبارہ پڑھنے کی ہمت پیدا کرنا ایک بہت بڑا مرحلہ تھا...... انہوں نے ڈائری واپس رکھ دی اور تصویروں والا موٹا لفافہ نکالا...... اور ایک ایک کر کے کتنی دیر تک تصویریں دیکھنے لگیں ہر تصویر پہ نرمی اور پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے کتنے ہی موتی نکلے...... اور دوپٹے میں جذب ہوئے...... وقت کا احساس نہ ہوا۔

دروازے پہ لگی گھنٹی کی آواز نے چونکا دیا تو جلدی جلدی سب کچھ دراز میں رکھ کر اسے مقفل کیا اور دراز کی چابی سیکرٹ جگہ پہ رکھ کر جلدی سے باہر آئیں۔ وہ ہر قیمت پہ یہ چیزیں عادی کی زندگی سے دور رکھنا چاہتی تھیں...... اس وقت تک جب وہ اپنی پڑھائی مکمل کر کے اپنے پاؤں پہ کھڑا نہیں ہو جاتا...... پھر اسے سب کچھ بتا دینے کا ارادہ تھا۔

دروازہ کھولا تو ڈاکٹر عدنان کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ان کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ دروازہ کھول کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ آنکھیں رونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔

''آپ تو اتوار کو آنے والے تھے......؟''

''اوہ...... وہ جو بے انتہا خوش نظر آ رہے تھے...... ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا...... اگر آپ کہتی ہیں تو واپس چلا جاتا ہوں...... حالانکہ میں صرف اور صرف آپ کی وجہ سے جلدی واپس آیا ہوں......'' انہوں نے صاف صاف اپنے جذبات کا اظہار کر دیا تو مسز شیرازی سنجیدہ ہو گئیں۔

''آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیں عدنان صاحب۔''

''وجہ جان سکتا ہوں......'' وہ بھی سنجیدہ ہو گئے۔

''وجہ آپ جانتے ہیں...... میں ایک جوان بیٹے کی ماں ہوں۔''

''میں جانتا ہوں مسز شیرازی...... انہوں نے جان بوجھ کر اسے اس طرح مخاطب کیا...... لیکن آپ کا بھی خوشیوں پہ کوئی حق ہے۔''

''تو میں خوش ہوں...... بہت خوش......''

''خوش......؟'' ڈاکٹر نے گہری نظر سے اسے دیکھا تو انہوں نے بے اختیار نظریں چرا لیں۔

''اگر آپ اتنا عرصہ تنہا رہنے کو خوشی قرار دیتی ہیں تو یہ خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ اپنے ہر ارمان، ہر جذبے کو تھپک تھپک کر سلا دیا ہے آپ نے...... اسے آپ زندگی کہتی ہیں...... کتنی بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں آپ......''

''ڈاکٹر صاحب...... پلیز آپ مجھ سے اس قسم کی باتیں نہ کیا کریں...... مجھے اچھی نہیں لگتیں یہ سب باتیں...... اور پھر میں تنہا کہاں ہوں...... میرا بیٹا عادل ہے نا میرے ساتھ...... میرے پیار کا مرکز...... میری آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر۔''

''زندگی صرف ایک بچے کو پال پوس کر بڑا کر دینے سے مطمئن نہیں ہوتی مسز شیرازی...... اسے کسی ایسے مرد کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو آپ کی زندگی کا ساتھی ہو...... آپ کے دکھ سکھ میں شریک ہو...... آپ کو وہ جذباتی سہارا مہیا کر سکے جس کی ہر عورت کو تمنا ہوتی ہے۔ ایک پیار کرنے والے مرد کی تمنا...... کیا آپ یہ کمی محسوس نہیں

کرتیں......؟" مسز شیرازی کا چہرہ پہلے سرخ ہوا اور پھر ایک دم پھیکا پڑ گیا...... چہرے پہ اذیت کے آثار نمودار ہوئے......لیکن انہوں نے خود پہ قابو پایا......

"اوہ...... میں بھی کس قدر اخلاق سے عاری خاتون ہوں...... اتنی دیر سے آپ دروازے پہ کھڑے ہیں اور میں نے اندر آنے کو نہیں کہا...... پلیز مجھے معاف کیجئے اور اندر تشریف لائیے...... وہ دروازے سے ہٹی تو وہ دھیمی چال چلتے اندر آ گئے......مسز شیرازی نے ہوادار کھڑکیوں کے پاس پڑے کین کے فرنیچر کی طرف اشارہ کیا......

"پلیز تشریف رکھیے......"

"اب بتائیے...... آپ کی کیا خاطر کی جائے......ٹھنڈا لیں گے یا گرم گرم چائے یا پھر کھانا کھائیں گے۔ ارے مجھے تو خیال نہیں رہا۔ اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہیں آپ کو بھوک تو لگی ہو گی......"

"کوئی بات نہیں میں کونسا پیدل آیا ہوں...... جہاز میں تھوڑا بہت کھالیا تھا۔ اب گرما گرم چائے کی طلب ہو رہی ہے؟"

"مگر آپ تو کافی کے شوقین ہیں...... پھر چائے کیوں طلب کی......؟" وہ حیران ہوئیں۔

"آپ کافی نہیں پیتیں...... اس لیے سوچا چائے پیئوں گا تو آپ ساتھ دیں گی......"

"یہ بات نہیں ہے...... میں اتنی بداخلاق بھی نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب آپ کے لیے کافی لے آؤں گی اور اپنے لیے چائے......اس طرح بھی ساتھ دیا جا سکتا ہے۔" وہ مسکرائی تو وہ بھی ہنس دیئے۔

"جیسی آپ کی مرضی......ہمیں تو بس ساتھ دینے والا چاہیے۔"

تھوڑی دیر میں وہ ٹرے تھامے آ رہی تھیں۔

"لیجئے جناب آپ کی کافی اور میری چائے اور ساتھ میں آپ کے پسندیدہ رولز...... اور بادام کا حلوہ......"

"اوہ آپ کو ابھی تک یاد ہے......؟" وہ بے انتہا خوش ہوئے۔

"کیا مطلب......؟ ابھی آپ نے پچھلے ماہ ہی تو بتایا تھا......اب ایسی خراب بھی نہیں ہے میری یادداشت......"

"پچھلے ماہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی محترمہ......" وہ بے انتہا سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر بولے۔ یہ تقریباً دس بارہ سال پرانی بات ہے۔ اور مان لیں کہ آپ کو اب تک یاد ہے۔

"میری یادداشت تو مثالی رہی ہے......مسز شیرازی نے ان کی سنجیدگی کو نظر انداز کر دیا...... بہت پرانی باتیں بھی یاد ہیں مجھے اب تک...... آپ ٹھیک سے کھا نہیں رہے۔

"آپ جو سامنے ہیں......" وہ بے ساختہ بولا۔ توجہ بٹ جاتی ہے......مسز شیرازی نے گھور کر انہیں دیکھا تو انہوں نے جلدی سے بات بنائی۔

"آپ چاہتی ہیں میں خوب پیٹ بھر کر کھاؤں...... اور آپ کو مجھے ڈنر نہ کرانا پڑے یہی بات ہے ناں......؟"

"ڈنر......؟ ......ڈنر کے وقت تو عادل......"

"یہ عادل کا ذکر خیر کس خوشی میں ہو رہا ہے ماما...... عادل اندر آتے ہوئے بولا۔ اور پھر ڈاکٹر عدنان کو بیٹھا دیکھ کر ایک دم سے خوش ہو گیا۔

"ارے ڈاکٹر صاحب آپ کب آئے......؟ ماما تو کہہ رہی تھیں آپ اتوار کو آنے والے ہیں......"

"تو آپ کی ماما آپ سے ہمارا ذکر بھی کرتی ہیں......؟"

"کوئی ایسا ویسا ذکر ڈاکٹر انکل...... عادل نے ایک رول اٹھا کر منہ میں ڈالا۔"

"ماما تو بس ہر وقت آپ کی باتیں کرتی ہیں...... کہ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے انسان ہیں......اسی بستی کے لیے فرشتہ رحمت ہیں جہاں اور کوئی ڈاکٹر آنا پسند نہیں کرتا...... بہت رحم دل ہیں......غریبوں کا مفت علاج کرتے ہیں...... اور امیروں سے بھی رحم دلی اور شفقت سے پیش آتے ہیں......" ایک رول کھا کر اس نے دوسرا اٹھا لیا۔

"عادی......" مسز شیرازی نے احتجاج کیا۔

"یہ احتجاج کس بات پہ ہو رہا ہے ماما......ڈاکٹر انکل کے رولز پہ ہاتھ صاف کرنے پہ یا پھر ان کی تعریفیں کرنے پہ......پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ڈاکٹر عدنان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"آپ ابھی تو نہیں جا رہے نا......؟ ڈنر پہ رک رہے ہیں ناں......؟" ڈاکٹر نے غور سے مسز شیرازی کی طرف دیکھا۔

"وہ اگر آپ کی ماما کو اعتراض نہ ہو تو......"

"ارے ماما کو کیا اعتراض ہو گا......" وہ خوش دلی اور شرارت آمیز لہجے میں بولا۔ وہ تو ایسے موقع ڈھونڈتی رہتی ہیں کہ لوگ ان کے کھانوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائیں...... آپ تو جانتے ہیں عورتیں تعریف کی شیدائی ہوتی ہیں۔"

"عادی......!" مسز شیرازی نے تادیبی نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے فوراً معصوم شکل بنا لی......

"میں نے کچھ غلط کہہ دیا ماما...... ڈاکٹر انکل کو ڈنر پہ نہیں رکنا چاہیے......؟"

"اف اس لڑکے کی زبان کتنی تیز رفتاری سے چلتی ہے......خود ہی سوال اور خود ہی جواب دوسروں کو تو بولنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔"

"اوہ آئی ایم سوری ماما......" اس نے شوخی سے کان پکڑ لیے۔ آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں......؟

"مجھے شاید واقعی ڈنر کے لیے نہیں رکنا چاہیے...... میں چلتا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے اٹھ گئے۔

"اچھا پھر کبھی ملاقات ہو گی۔" وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

"اوہ رکیے پلیز ......" وہ بے اختیار کہہ اٹھی ......اگر عادل اتنا زیادہ چاہ رہا ہے تو ڈنر ہمارے ساتھ کیجئے ناں......

ڈاکٹر عدنان زیر لب مسکرائے اور عادل کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"اب اگر آپ اتنا مجبور کر رہی ہیں تو انکار کرنا کفران نعمت ہی ہو گا۔ عادل کا مجھے یوں بھی بہت لحاظ ہے...... ماشاء اللہ بہت ہی فرماں بردار اور سعادت مند بچہ ہے۔" مسز شیرازی مسکراہٹ بمشکل روکتے ہوئے کچن کی طرف مڑ گئیں جبکہ عادل ڈاکٹر صاحب کی طرف مڑا۔

"ڈنر سے پہلے تاش کی بازی ہو جائے...... آج میں نے آپ کو ہرانے کا پکا ارادہ کیا ہوا ہے۔"

"ارے ہارے ہوئے کو کیا ہرانا......" وہ بے ساختہ بولے تو عادل نے چونک کر انہیں دیکھا۔

☆☆☆

امیر بیگم نے پان چباتے ہوئے لاؤنج میں بیٹھے لوگوں پہ نظر ڈالی۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ عالم بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھا۔ خوب پیٹ بھر کر ناشتہ کرنے کے بعد اب سستی سی چھا رہی تھی۔ اسے سائرہ کا خیال آیا......ابھی تک سو رہی تھی یا اپنی بے بسی پہ کڑھ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا اس پہ ترس بھی آ رہا تھا۔ ہمیشہ شہزادیوں کی

طرح حکم چلانے اوراپنے ملازمین کو جوتے کی نوک پہ رکھنے والی یوں کیسے خاموش ہے۔ کیا یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں...... ورنہ ایسی عادتیں جو اس میں پائی جاتی تھیں یوں غائب نہیں ہوتیں۔ مزاج کی خودسری، ہٹ دھرمی اور ضدی پن یوں دنوں میں غائب نہیں ہو جاتا...... وہ جس نے پورے رعب اور غرور کے ساتھ ساری عمر حکم چلایا ہو وہ یوں تو خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔

''دیور جی...... کن سوچوں میں کھوئے ہیں؟'' حنا نے اپنی نیل پالش چیک کرتے ہوئے بڑے انداز سے کہا تو عالیہ نے طنزیہ نظروں سے عالم کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا سوچیں گے حنا......؟ ان کی سوچیں تو آج کل ایک ہی نقطے کے گرد گھومتی ہوں گی کہ بیوی کے میکے سے مال ومتاع کب آئے گا۔ لیکن لگتا ہے بیوی کو کوئی پرواہی نہیں۔ کسی نواب زادی سے کم تھوڑی ہیں وہ......''

''نواب زادی سے کم کیوں ہوگی وہ......'' عالم چمک کر بولا۔ وہ تو شہزادی تھی اپنے گھر میں...... شاید اس کے نصیب پھوٹ گئے جو مجھ جیسے بدنصیب پہ نظر پڑ گئی۔

''واہ میاں واہ......'' امیر بیگم کی آواز آئی۔ بڑی طرف داری ہو رہی ہے بیوی کی...... ابھی تو ان تلوں سے تیل نکلا نہیں اور تم بن گئے جورو کے غلام...... کیا گھول کر پلا دیا اس نے...... نہ کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی......''

''اماں آپ بھی نہ بس جانے کیا نقطے نکال کر بیٹھ جاتی ہیں۔'' عالم زچ ہو کر بیزاری سے بولا۔

آپ نہیں جانتیں وہ کیا چھوڑ کر آئی ہے۔ وہ کیا تھی اور کن حالات کا شکار ہوگئی ہے۔ کچھ دیر تو لگے گی نا سنبھلنے میں...... ابھی تو وہ شاک میں ہے کہ وہ کیا کر بیٹھی ہے...... جب تک وہ اس شاک سے نکل نہیں آتی...... میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا...... آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔

''نہ میاں...... ہمارے پاس کوئی سارے زمانے کا وقت نہیں پڑا ہے...... اور نہ ہی ہم میں اتنا صبر ہے۔ ہم اتنا انتظار نہیں کر سکتے۔''

''تو پھر......؟'' عالم تلخ ہو گیا......

کیا کروں میں آپ ہی بتائیں......؟

''چلتا کرو اسے......'' وہ بے رحمی سے بولیں۔

''چلتا کروں......؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''آپ کا مطلب ہے گھر سے نکال دوں......''

''بالکل یہی مطلب ہے میرا......'' وہ نخوت سے بولیں۔

''ایسے کیسے نکال دوں......؟ کہاں جائے گی وہ بے چاری...... واپس تو جا نہیں سکتی ابھی۔''

''تو میاں یہ ہمارا مسئلہ کب سے ہو گیا...... اور تم...... تم اتنی حمایت کیوں کر رہے ہو اس کی......؟'' وہ بہت ناراضگی سے بولیں۔

''بیوی ہے وہ میری اماں......'' وہ دھیمے لہجے میں بولا...... اماں اگر زیادہ ناراض ہو گئیں تو وہ ایسا قدم اٹھا بھی سکتی تھیں...... اور اسے سارہ سے محبت نہ سہی دل میں کہیں ایک نرم گوشہ تو موجود تھا۔

''بیوی ہے تمہاری تو پھر وہ کرے۔ جس کے لیے تم اسے اس گھر میں لائے ہو۔ یا پھر تم بھول گئے کہ تمہاری زندگی

کا مقصد کیا ہے...... یہ شادی کن مقاصد کے حصول کے لیے کی گئی ہے۔ زیادہ ہمدردی جتانے کی کوشش کی تو آج ہی چلتا کروں گی اسے چٹیا سے پکڑ کے...... ذرا بھی رحم نہیں کروں گی۔''

''نانی...... مامی کی چٹیا تو ہے نہیں...... لبنیٰ تصویروں میں رنگ بھرتے بھرتے سر اٹھا کر مسکرائی۔ ان کے تو اتنے پیارے سٹائل میں کٹے ہوئے بال ہیں۔''

بچوں کے سامنے گھر میں کون سی باتیں ممنوع ہونی چاہیں...... اس گھر میں ایسا کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ ان باتوں کو ان کے مستقبل کے لیے ٹریننگ کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔

''تم چپ رہو...... آفت کی پرکالہ بنتی جا رہی ہو۔''

''خالہ میری بیٹی کو آفت تو نہ کہیں...... اکلوتی بچی ہے میری......'' عالیہ آنکھوں میں مصنوعی آنسو بھر کر بولی جو ایسے وقتوں میں بڑی آسانی سے آجاتے تھے۔ امیر بیگم بھانجی کی دل جوئی میں چند الفاظ کہنا چاہتی تھیں کہ اسی وقت چوکیدار دروازے پہ نمودار ہوا۔

''کیا بات ہے دینو......؟''

''وہ جی بیگم صاحبہ کے گھر سے گاڑی آئی ہے۔'' دینو کے ہاتھ میں چابیاں تھیں۔

''کون بیگم صاحبہ......؟''

''وہ چھوٹی بہو کے گھر سے بیگم صاحبہ......'' اس نے چابیاں آگے بڑھائیں۔

چند لمحوں تک لاؤنج میں سناٹا چھا گیا...... پھر چونکتے ہوئے امیر بیگم نے چابیاں لینا چاہیں لیکن دوسرے لمحے وہ عالم کے ہاتھوں میں تھیں...... امیر بیگم نے سکتے کے عالم میں اسے دیکھا...... تو وہ مسکرا دیا۔

''چلیں اماں...... دیکھیں تو سہی......'' سب باہر جانے کے دروازے کی طرف بڑھ گئے...... دروازہ کھلتے ہی سامنے چمچماتی بلیک مرسڈیز نے ان کی نگاہیں خیرہ کر دیں...... سب شیشوں سے اندر جھانکنے لگے۔ اندر دو بڑے سوٹ کیس، ایک بریف کیس ایک کمپیوٹر بیگ اور جیولری کے تین چار بڑے ڈبے تھے۔ کچھ سامان اگلی سیٹ پہ بھی تھا۔

''یہ سب شاید میک اپ کا سامان ہے۔'' حنا ڈبوں کو دیکھ کر بولی...... امیر بیگم ابھی تک کچھ نہ بولیں...... وہ خاموش تھیں اور عقابی نظروں سے سامان کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''ڈگی کھولو......'' وہ حکمیہ انداز میں بولیں...... عالم نے قفل کھول کر ڈگی کا دروازہ اوپر کیا...... وہاں بھی دو بڑے سوٹ کیس...... اور بے شمار جوتے پیک کیے پڑے تھے...... وہ جلدی جلدی دماغ میں پلاننگ کرنے لگیں پھر جلدی سے بولیں۔

''عالم...... سائرہ کو اس سامان کا بالکل پتہ نہ چلے اور گاڑی کا تو بالکل نہیں...... ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے اسے......''

''کیوں اماں......؟'' وہ کنفیوژ تھا۔

''بے وقوف ہی رہے نا تم سدا سے......'' انہوں نے طعنہ دیا...... یہ گاڑی اور سارا سامان یقیناً سائرہ کا ذاتی سامان ہے...... جو اس کے والدین نے کسی کام کا نہ ہونے کی وجہ سے بھیج دیا ہے۔

''لیکن اماں...... اتنی قیمتی گاڑی ہے...... وہ گاڑی بیچ کر پیسے وصول کر سکتے تھے......''

''جواب ہم کریں گے......'' اماں خوش ہو کر بولیں...... تبھی تو کہہ رہی ہوں...... سائرہ کو ہوا بھی نہ لگے......

گاڑی قیمتی ہے تو باقی سامان بھی قیمتی ہی ہوگا...... یہ کپڑے زیورات میک اپ کا سامان...... عالیہ، حنا اور ثناء...... سوٹ کیس کھول کر جو بھی تم لوگوں کو پسند ہو اس پہ قبضہ کرلو...... باقی بیچ دیں گے۔"

"لیکن اماں...... اس کے کپڑے ہم کیسے پہنیں گے...... اسے پتہ چل جائے گا......" ثناء افسردگی سے مسکرائی۔

"ارے چلتا ہے تو چل جائے...... بازار میں کیا ایک ہی قسم کی دو چیزیں نہیں مل سکتیں...... وہ کچھ کہے بھی تو صاف مکر جانا...... دیدہ دلیری سے انکار کردینا...... وہ کچھ کہنے کی جرأت تو کرے...... تم دیکھنا کیا حشر کرتی ہوں اس کا......"

عالم اس تمام عرصے میں اپنی اماں اور بہن بھابی کی باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا۔ ساری عمر ایسی ہی باتیں دیکھی تھیں...... ایسے ہی پلان بنتے سنے تھے...... پھر بھی وہ شاکڈ تھا بہت غیر محسوس طریقے سے اس نے ڈگی اور گاڑی لاک کی...... سب جوش و خروش میں باتیں کرتے اندر آرہے تھے...... گھر میں ہر چیز موجود تھی...... اور بہت کچھ خریدنے کی استطاعت بھی تھی...... پھر بھی وہ غیر کی چیزوں پہ یوں خوش ہو رہے تھے...... جس نے اپنے خون پسینے کی کمائی کا ایک نوالہ نہ کھایا ہو وہ اس نوالے کی قیمت کیا جانے...... وہ خون اور پسینہ بہائے جانے کے بعد ہاتھ میں آئی رقم کی خوشی کیسے محسوس کرسکتا ہے...... اندر آکر عالم نے ایک لمحہ ضائع نہیں کیا...... وہ تیزی سے اوپر سیڑھیاں چڑھ گیا...... سب باتوں میں مصروف تھے...... کس نے کیا لینا ہے اس کے متعلق بحث ہو رہی تھی۔

صرف ثناء خاموش بیٹھی افسوس سے سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ اور پھر اس کے ساتھ سب نے دیکھا عالم سائرہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا نیچے لا رہا تھا...... وہ بہت زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے کیا ہوا عالم، کیا کررہے ہو عالم کے الفاظ بہت دھیمی آواز میں نکل رہے تھے۔ شاید اسے عزت نفس پہ چوٹ پڑنے کا خدشہ تھا وہ اسی طرح کھینچتے ہوئے باہر کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"عالم کیا کررہے ہو......" اماں خوفزدہ ہوئیں۔

"عالم باہر مت لے جاؤ اسے......" عالیہ کی سانس رک گئی۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے عالم......؟" حنا بولی۔ لیکن وہ سب نہیں سن رہا تھا۔ باہر آکر اس نے ریموٹ سے گاڑی کا لاک آن کیا۔ وہ تو یہ بھی نہیں دیکھ رہا تھا کہ گاڑی دیکھ کر سائرہ کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئی تھیں اور اس کے لبوں سے سرگوشی کی مانند "میری گاڑی" کچھ سوالیہ اور کچھ کنفیوژ انداز میں نکلا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھ رہا تھا کہ گھر کے سب افراد کیا کیا تاثرات لیے کیسی کیسی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا...... سیٹ پہ رکھا سامان جلدی میں پیچھے پھینکا اسے سیٹ پہ دھکیلا...... دروازہ بند کیا اور بجلی کی سی تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا اور گاڑی سٹارٹ کرکے زن سے گیراج سے باہر نکل کر گاڑی روڈ پہ ڈال دی۔

"نمک حرام" امیر بیگم کا لہجہ غضبناک تھا...... اور سب کو سانپ سونگھ گیا تھا...... جبکہ سائرہ سیٹ پہ دم بخود بیٹھی...... ہراساں نظروں سے عالم کو دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

☆☆☆

افسانہ

تپتی دھوپ گزاری ہے

ناہید فاطمہ حسنین

قدرت کے رنگ بہت نرالے ہوتے ہیں
وہ لوگ جو خود کو وقت کا فرعون سمجھ کر
دوسروں کی تذلیل کرنا اپنا حق سمجھ لیتے ہیں
ان کی پکڑ دنیا اور آخرت میں بہت سخت ہوتی ہے۔

ایک عورت کا فسانہ جو اپنی خطاؤں کی سزا تنہا بھگت رہی تھی

ورنہ یہ تیز دھوپ چبھتی ہمیں بھی ہے
ہم اس لیے چپ ہیں کہ تو سائباں میں ہے

میلی کچیلی سی چٹیا میں گندھا پراندہ وہ بھی میلا ہی...... وہ تین تھیں اور تینوں جون کی تپتی دوپہر میں ایسے سکون سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں گویا کسی پارک میں فوارے کے کنارے...... انہی میں ایک چھمی تھی...... بڑی بڑی غلافی آنکھوں والی، نسبتاً صاف ستھری کہیں سے بھی تو ملنگنی نہیں لگ رہی تھی۔
کتنے پیسے جمع کر لیے، چھمی نے لاڈو کو کریدا، جو گود میں لیے کالے مگر گول مٹول سے بچے کے سر میں جوئیں دیکھ رہی تھی۔
. اج کمائی کتھے، نامراد روئے جاتا ہے، لاڈو نے بچے کے سر پر ہلکی سی چپت لگا دی۔
اور تو......اب وہ گود میں لیے بچے کو تھپکنے لگی۔
تبھی سگنل کی سرخ بتی جل اٹھی اور گاڑیاں قطار در قطار رکنے لگیں۔ تبھی دونوں گاڑیوں کی جانب بھاگیں اور لاڈو بچہ تھپکتی رہ گئی۔
گجرا لے لو صاب جی...... چھمی نے منت کی......
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے ذرا جو نوٹس لیا ہو البتہ برابر میں بیٹھی ادھیڑ عمر، میک اپ زدہ عورت کے چہرے کے تاثرات کچھ کچھ اسے سمجھ آئے تو اس نے کاروباری انداز میں بولا۔
بیم صیب (بیگم صاحب) کے ہاتھوں میں خوب جچیں گے، رات بھر کلائیاں مہکتی ہیں، لہجے میں اصرار چھایا تھا۔
کتنے کا دو گی...... آخر عورت بولی۔
صرف دس کے دو...... چھمی نے تیزی سے اس کی گود ہی میں گرا دیے۔ عورت نے تیزی سے دس روپے نکال کر اسے دیے جسے جھٹ اس نے قابو کیا اور سلام کرتی دوسری گاڑی کی جانب بڑھی وہ گاڑی بہت قیمتی و شاندار تھی۔ جس قماش کے شخص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی ہوئی تھی وہ ان جیسوں کو بخوبی پہچانتی تھی۔ وہ بھی ایک گھاگ تھی اس نے گجروں والا ہاتھ نیچے کر لیا۔ بہت آہستگی سے اس کے بازو کو چھوا اور خالی ہتھیلی پھیلا دی۔
"بابو اللہ کے نام پے کچھ دو...... سائیں، خیرات زکوۃ......صدقہ آپڑیں جان دا......"
قیمتی سوٹ میں ملبوس شخص کی آنکھوں میں حرص و ہوس کے سائے رقصاں تھے۔ اس نے چھمی کے ہاتھوں کو چھوتے ہوئے۔ دس روپے کا نوٹ نکالا ہی تھا کہ سگنل سبز ہوتے ہی وہ روپے دینے کے بجائے اس کی گوری میلی کلائی کو نوچتا ہوا زن چھو ہو گیا۔ حالانکہ چھمی نے بلو سگنل دیکھتے ہی نوٹ اچکنا چاہا تھا مگر وہ کمبخت زیادہ ہوشیار تھا......
"وے نامراد، جا تیرا بیڑا غرق...... ستیاناس......"
اس نے گاڑی والے کو لعنت دکھائی اور خود گاڑیوں کے ہجوم سے پانی کی طرح بہتی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔
سامنے اسے ویرا آتی نظر آئی اس کے ہاتھ میں بھٹا تھا جو شاید کسی نے آدھا کھا کر پھینک دیا تھا جسے اس نے اٹھا لیا تھا۔ وہ اگلے چوک پر ہوا کرتی تھی......
کیا ہوا...... وہ سر کھجاتی ویرا کے قریب آئی۔ بک گئے سارے......اس کا اشارہ گجروں کی طرف تھا۔
"ہاں......" ویرا بدستور بھٹا کھا رہی تھی۔
کتنے کے بکے......
بیس کم دو سو...... ویرا نے ماں کی طرف بھٹا بڑھایا۔ جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا۔
ہو وہ بھیک کتنی ملی۔
دو سو نوے......
چل خیر ہے......تو گھر جا......اب اس نے روڈ پر دوڑنے والی گاڑیوں میں مخصوص گاڑی کو تلاشا۔
اتنی جلدی کیوں؟ عصر کی اذان سنائی دی تو ویرا کو حیرت ہوئی کہ آج ماں اسے جلدی گھر کیوں بھیج رہی ہے...... حالانکہ وہ گھر مغرب کے بعد گھر جاتے تھے......

بھائی بیمار ہے ناں......اسے دیکھ لینا......
ہونہہ......ویرا کا منہ کڑوا ہو گیا......توں آنپ دیکھ لے، میں نئی جاتی......
فیر لگا واں دھپ...... اس نے غصہ میں اسے مارنے کو ہاتھ اٹھایا......
نیچے رکھ ہاتھ آنیڑاں (دنیا) جاتی ہوں...... وہ سگنل پر رکنے والی گاڑیوں کی جانب بڑھ گئی۔
وہ جس کی منتظر تھی اس کے پہنچنے کا وقت تو ہو ہی چلا تھا۔ اس نے اپنی رفتار تیز تر کر دی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتی روڈ کراس کر گئی تقریباً سو قدم چل کر چوڑی روڈ کے پاس آ کر وہ رک گئی...... چند منٹ کے بعد ہی ایک شاندار سیاہ مرسڈیز اس کے پاس آ کر رک گئی۔ آٹو میٹک لاک کھل گیا اور وہ چھپاک سے دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گئی۔ گاڑی میں کوئی انگلش میوزک چل رہا تھا اور بھینی بھینی مسحور کن مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا کر اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے ڈیش بورڈ سے پرفیوم نکال کر ویرا پر اسپرے کیا اور ساتھ ہی دو چابیاں اسے پکڑائیں۔ انگلش سانگ کے ساتھ اس کے لب بھی تھرا تھرا رہے تھے۔ کبھی وہ چٹکی بجاتا اور کبھی گانے کے دوران اسٹیئرنگ سے ہاتھ ہٹا کر تالی اور چٹکی بجاتا۔
وہ مسلسل گانے کے ساتھ ہم آواز تھا، کبھی گاتے گاتے اس پر جھکتا مگر فوراً ہی سنبھل کر اس پر اسپرے کر دیتا۔ کبھی وہ اسے دیکھ کر مسکراتا اور ایک آنکھ دبا کر سیٹی بجا دیتا وہ لجا جاتی اور خود میں سمٹ جاتی تھی۔
گاڑی بالکل اسموتھ رواں دواں تھی جیسے پانی پر بہہ رہی ہو۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی "فیصل انڈسٹریز" کے احاطے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے چھمی کو فاصلے پر اتار دیا۔ یہ انڈسٹری ڈیڑھ ہزار گز کے دو پلاٹس، جن کی پشت آپس میں ملی ہوئی تھی پر مشتمل تھی۔ انڈسٹری کا مین گیٹ آمدورفت کے لیے زیر استعمال تھا۔ فیصل کامران اسی سمت گاڑی بڑھا لے گیا جبکہ دوسرا گیٹ عام طور پر مقفل رہتا تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی ایک تنگ سا زینہ اوپر ایک بڑے اور کشادہ سے کمرے میں جا کر ختم ہوتا تھا۔
چھمی تیز تیز چلتی گیٹ تک پہنچی اس نے بنا شور کیے گیٹ میں لگی کھڑکی کے مقفل تالے کو کھولا اور زینے کے راستے اوپر بنے کمرے تک چلی آئی۔ یہاں کی چابی بھی فیصل کامران نے اسے دی تھی۔ اس نے اس دروازے کو بھی کھول کر اندر نفاست سے سجے کمرے میں قدم رکھا۔ کمرہ خوشبو میں بسا اور تیز روشنیوں میں پہلے سے نہایا ہوا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی لمبی اور گہری سانس اپنے وجود میں اتاری......
کمرے کے درمیان میں قیمتی بیڈ اور اس کے عین سامنے ڈریسنگ ٹیبل سامان آرائش سے مزین تھی۔ بیڈ کے ساتھ ہی انٹر کام اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر فون رکھا تھا۔ یقیناً جس کا سیٹ غیر ملکی تھا۔ برابر میں ٹی وی ریموٹ کنٹرول تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل سے ذرا پرے پلازمہ ٹی وی تھا۔ کچھ فاصلے پر روم ریفریجریٹر تھا۔ ایک سائیڈ پر کاوچ دھرا تھا۔ روم لائیٹ براؤن کارپٹ سے مزین تھا۔ پردے فرنیچر کی میچنگ کے تھے۔ غرض اس کشادہ کمرے میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ سینٹر ٹیبل پر انگلش اور غیر ملکی بے ہودہ رسالے رکھے تھے۔ کمرہ ایئر فریشنر کے سبب مہک رہا تھا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے ایئر فریشنر اٹھا کر کمرے میں دوبارہ اسپرے کیا کہ یہی فیصل بابو کا آرڈر تھا......اسے پرفیومز کی پہچان تو نہ تھی۔ اس نے ہاتھ آئے دو پرفیوم کاوچ پر رکھے قیمتی سوٹ پر اسپرے کیے، کہ یہ بھی فیصل بابو اسے ہمیشہ کی طرح سکھا چکے تھے۔
سوٹ کے اوپر حسب معمول پانچ ہزار کا نوٹ رکھا ہوا تھا...... شاید یہ اس کی اوقات تھی یا قیمت...... اب اسے روپوں سے کچھ خاص رغبت نہ رہی تھی بلکہ اب

اس کا سب کچھ فیصل بابو ہی تھے، یہ سوٹ لے کر ملحق باتھ میں چلی گئی۔

فیصل کامران امیر کبیر باپ کا اکلوتا عیاش بیٹا تھا جو ہفتے میں ایک مقررہ دن اسے یہاں لایا کرتا تھا۔ اس کے والدین اعلیٰ سوسائٹی کے آزاد فطرت افراد تھے جو کبھی جنسی مخالف سے دوستی کو بری نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔

دولت کی فراوانی اور والدین کی عطا کردہ آزادی و چشم پوشی کے سبب فیصل کامران نے بھی کسی درست راہ حیات کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ وہ نہ صرف نئی نئی لڑکیوں سے دوستی کر کے اس کمرے کو رونق بخشتا بلکہ اسے ایک لت یہ بھی تھی کہ وہ ہفتے میں ایک بار کسی نہ کسی فقیرنی یا پھول بیچنے والی کو پکڑ لاتا تھا...... یہ کمرہ اس نے اسی مقصد کے تحت سب سے الگ تھلگ بنوایا تھا......

"یار فقیرنی کا تو مزہ ہی الگ ہے۔" اکثر وہ دوستوں میں بیٹھ کر سگریٹ پھونک پھونک کر بیکریٹ بناتا۔

یار تو کس طرح کسی فقیرنی...... میرا مطلب ہے...... یہ کتنی گندی ہوتی ہیں۔ اس کے دوست عمران نے کراہت سے کہا۔

"گندی...... وہ ہنسا...... گندی کہاں جان...... انہیں پہلے ہی بتا دیا جاتا ہے کہ انہیں کتنی دیر خوشبو سے بھرے باتھ ٹب میں گزارنا ہے۔ پھر جب وہ نہا کر نکلتی ہیں تب تو میری جان...... چھب دیکھنے والی ہوتی ہے۔

پھر بھی یار فقیرنی تو فقیرنی ہوتی ہے...... عمران کو کسی طرح اس کی منطق ہضم نہ ہو رہی تھی۔

بندر کیا جانے ادرک کا مزہ...... اس کے قماش کے دوسرے دوست فرحان نے ایک آنکھ دبا کر قہقہہ لگایا اور ساتھ ہی فیصل کے ہاتھ پر تالی ماری۔ تب سب ہنسنے لگے۔

مگر یار آج کل تو دل و دماغ پر چھمی سوار ہے...... آفت ہے آفت...... دیکھ لو تو نظر نہ ہٹے...... سب سے بڑھ کر وہ صرف اور صرف میری ہے۔

رہنے دو ان فقیرنیوں کا کیا پتہ...... عمران نے شاید طے کر لیا تھا کہ وہ ہر بات کی مخالفت کرے گا۔

تجھے نہیں پتہ ناں...... وہ ایسی ہی تھی۔ شیشے میں اتارنے والا...... تیرا یار ہی ہے۔ فیصل نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور سگریٹ ایش ٹرے میں بجھائی۔

آج کل تو بس چھمی...... چھمی...... اور چھمی...... وہ خیالوں میں کھونے لگا۔

اور یہ سچ بھی تھا وہ آٹھ نو ماہ سے صرف اور صرف چھمی پر اکتفا کیے ہوئے تھا۔

چھمی کا اصل نام شمیم تھا وہ انتہائی پرکشش جسامت اور دلکش خدوخال کی مالک، درمیانے قد کی گوری چٹی چھبیس سال کی بھرپور عورت تھی۔ نہانے کے بعد عمدہ ملبوس میں وہ اس قدر دلکش و حسین لگتی کہ فیصل کامران اس کے حسن میں کھو سا جاتا وہ کسی طرف سے فقیرنی نہ لگتی تھی۔

فیصل کامران اس کی زندگی میں ناجائز راستے سے آنے والا پہلا مرد تھا۔ اس کا شوہر میکا ایک ہاتھ سے تقریباً معذور تھا۔ تیرہ سال کی ایک بیٹی اور پانچ سالہ ایک بیٹا اس کی کل کائنات تھے۔ میکا عموماً اپنی پہلی بیوی کے ساتھ ہوتا تھا جب کبھی اس کا دل چھمی پر آتا یا اس سے پیسے چھیننے ہوتے وہ اس کے پاس چلا آتا۔ باقی اس نے کبھی چھمی یا اس کے بچوں کا بوجھ اٹھانے کی کبھی زحمت گوارا نہ کی۔ بیٹی ویرا پھول بیچتی اور بھیک مانگتی جبکہ پانچ سالہ چھوٹو ایک چھوٹا سا وائپر لیے گاڑیوں کے پیچھے بھاگتا نظر آتا۔

ویرا جس حصے میں پھول بیچتی اور بھیک مانگتی تھی وہیں اس کی دوستی اخبار بیچنے والے ہندو لڑکے وکرم سے ہو گئی تھی۔ چھمی اگلے چوک پر اپنا دھندا کرتی کبھی کبھار دونوں ماں بیٹیوں کا ٹکراؤ بھی ہو جاتا تھا۔

عیاش طبع فیصل کامران نے جب پہلی بار چھمی کو دیکھا تو چھمی کے خوبصورت جسم پر اس کی رال بہہ نکلی اس نے محض پانچ سو کا نوٹ دکھا کر اسے قابو کر لیا اور پھر اسی روز سے ہفتے میں ایک بار ملنا ان کا معمول ہو گیا۔

نئے جوڑے کے ساتھ ساتھ دو ہزار سے پانچ ہزار تک اسے ملا کرتے تھے۔ شروع شروع میں چھمی پیسوں کے چکر میں آتی تھی مگر پھر اسے فیصل سے ایک خاص قسم کا انس ہو گیا تھا۔ خلوت میں فیصل کا والہانہ انداز جال میں پھانسنے کے لیے اس کی تعریفیں اس کے حسن کے قصیدے...... بس پھر وہ ہفتے کے اس خاص دن کا شدت سے انتظار کیا کرتی جبکہ ان کی ملاقات طے ہوتی۔

وہ نہا کر نکلی تو فیصل کامران پہلے ہی سے بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا اس کا منتظر تھا۔ وہ کسی انگلش میگزین کی ورق گردانی میں محو تھا آہٹ پا کر نظریں اٹھائیں تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ٹی پنک کلر کے سوٹ میں اس کا گورا چٹا رنگ ایسے دمک رہا تھا جیسے گلابی گلاب، ہوس آنکھوں میں ناچنے لگی تو اس نے اسے پکڑنا چاہا وہ لجا کر دور ہو گئی۔

وہ کچھ نہ بولا بلکہ پرشوق نگاہوں سے دور ہی دور سے اس کا نظارہ کرنے لگا......

خدا معلوم آج اس کا حسن دو آتشہ کیوں لگ رہا تھا فیصل کو یہ بات سمجھ میں نہ آ کے دے رہی تھی۔ تبھی وہ ادائیں دکھاتی شرماتی لجاتی اس تک آ گئی...... وہ جلدی سے سیدھا ہوا اسے برابر میں بیٹھنے کی جگہ دی۔

فیصل صاب ایک بات بولوں...... وہ خوامخواہ اپنے آنچل سے اٹکھیلیاں کرنے لگی۔

میری جان ایک کیا تو سو باتیں بول...... فیصل نے محبت سے اسے خود سے قریب کر لیا۔

اس کے والہانہ انداز پر چھمی کو الفاظ ہی نہ سوجھ رہے تھے۔ لگتا تھا وہ سب کچھ بھول گئی ہو۔

سنہرے موتی

☆ قرآن مجید دنیا میں سب سے زیادہ مقدس اور کثرت سے پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

☆ قرآن مجید میں لفظ "مکہ" آٹھ مرتبہ آیا ہے۔

☆ قرآن مجید کی "سورہ فاتحہ" کو "دیباچہ قرآن" کہتے ہیں۔

☆ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ "سورہ فاتحہ" قیامت کے دن لوگوں کی وکالت کرے گی۔

☆ "سورہ یٰسین" کو قلب قرآن کہتے ہیں۔

☆ "سورہ رحمٰن" کو "عروس القرآن" کہتے ہیں۔

(مسز نگہت غفار، کراچی)

بول...... بول ناں...... پیسے کم ہیں...... فیصل کی آواز خمار آلود تھی۔

نہیں...... نہیں جی...... اب وہ شرما کر اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

پھر......؟ کچھ اور چاہیے...... اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اسے دل میں بھر لے۔

نا جی...... نئی......

پھر بتاؤ کیا بات ہے؟ اس نے چھمی کو کچھ اور اپنے قریب کیا۔

وہ جی...... تم...... وہ جی تم باپ بننے والے ہو۔ بالآخر شرما کر اس نے کہہ ہی دیا۔

کیا......؟ وہ زور سے چیخا۔ لمحہ بھر میں اسے زوردار دھکا دیا۔

کیا کہہ رہی ہے تو......؟ پیار کی پری لمحے بھر میں اڑن چھو ہو گئی۔ منہ سے کف بہنے لگا۔ چھمی کا منہ کھلا کا

کھلا رہ گیا۔
آنا فانا تڑاخ کی آواز نے ساتھ ہی فیصل کا ہاتھ چھمی کے گالوں پر سرخ نشان چھوڑ گیا۔
کمینی، آوارہ، بدمعاش، بدذات، طوائف......
رنڈی...... نکل یہاں سے......! فیصل تو غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ وہ جلال میں بیڈ پر ہی کھڑا ہو گیا۔
چھمی لرز کر رہ گئی...... اسے مطلق علم نہ تھا کہ ایسا کیا کہہ دیا جس پر وہ آنا فانا بدل گیا۔
وہ تو پتہ نہیں کیا سمجھے بیٹھی تھی، اس خبر کے سنانے کے بعد جانے فیصل سے اس نے کیا امید، کیا آس کیا توقع باندھ لی تھی۔ تھپڑ کھا کر اس کی ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس کا ہاتھ اپنے گورے گورے گالوں پر ٹک گیا تھا۔
جانے کس کا پاپ میرے سر منڈھتی ہے، آوارہ بدچلن......
نہیں فیصل بابو...... میں آوارہ نہیں...... کسی کا پاپ نہیں یہ تمہارا ہی ہے یہ......
یہ تو...... وہ سسک اٹھی آگے کچھ بولا ہی نہ گیا۔
کمینی نکل یہاں سے...... اس نے بیڈ پر کھڑے کھڑے کئی لاتیں اسے رسید کر دیں۔
میرا...... میرا کہتی ہے...... دوسرے کا گناہ میرے سر ڈالتی ہے...... تو سمجھتی ہے میں تیرے جال میں آ جاؤں گا۔ اس نے غصے میں بری طرح لاتیں چلانا شروع کر دیں...... وہ چکرا کر بیڈ سے نیچے گر گئی۔
وہ مظلوم اور صنف نازک اتنی مار پر تڑپ اٹھی......
فیصل کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا وہ بیڈ سے نیچے کودا اسے بالوں سے پکڑ کر دروازے تک گھسیٹ کر لایا۔ لاک کھولتے ہی اس نے تیزی سے اپنا ریوالور اس پر تان لیا۔ وہ رونے لگی سہم کر ہاتھ جوڑ دیئے اور اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔
نکل یہاں سے دفع ہو اگر اپنی خیریت و زندگی چاہتی ہے تو زبان بند رکھنا ورنہ تیری لاش کا نشان تک کوئی نہ پا سکے گا...... وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ نوٹ ہاتھ سے گر چکا تھا۔
اسے اٹھا اور دفع ہو یہاں سے، نوٹ کی جانب اشارہ کر کے وہ اور زور سے دہاڑا۔ وہ الجھ کر گری اور خود ہی سنبھل گئی کہ اس کی دہاڑ پھر سنائی دی۔
دفع ہو جا اور پھر کبھی مجھے نظر نہ آنا...... وہ گھبرا کر تیز تیز قدموں سے نیچے کی جانب بڑھی پاؤں تو من من بھر کے ہو رہے تھے۔ چلا ہی نہ جا رہا تھا۔ مگر اپنا وجود گھسیٹنا اس وقت اسے دوبھر ہو رہا تھا۔
کافی فاصلہ پیدل ہی طے کر کے جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ سوچتی رہ گئی پل میں کیا سے کیا ہو گیا۔ لمحہ بھر میں وہ آوارہ، بدچلن اور طوائف ہو گئی؟
اور کیا وہ ''اکیلی'' یہ سب تھی اسے آوارہ اور طوائف بنانے میں فیصل کا کوئی کردار نہ تھا۔ جبکہ وہ صرف فیصل کی ہو گئی تھی جبکہ فیصل...... وہ تو پتہ نہیں کس کس اور کتنوں کے ساتھ بدچلن تھا...... آوارہ......
اور...... اور وہ راستے بھر روتی جاتی خود ہی آنسو پونچھتی جاتی۔ اپنی لاش اپنے کاندھے پر اٹھانا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسے آج اس بات کا احساس ہوا تھا۔
اب بھیک مانگنے یا پھول بیچنے سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ بس پیٹ کا ایندھن بھرنا تھا تو پھول بیچتی یا ویرا اور چھوٹو کے پیسوں پر گزارا کرتی۔
ہاں...... مگر کبھی کبھی نگاہیں فیصل بابو کو ضرور ڈھونڈا کرتیں۔ شاید اس نے اپنا راستہ بدل لیا تھا وہ اسے پھر کبھی نظر نہ آیا...... یہ اس کا اپنا قصور تھا جو اس نے خود کو خواب محل کی ملکہ تصور کر لیا تھا۔ آنکھ کھلی، خواب ٹوٹا، تو اس نے ریزہ ریزہ تو ہونا ہی تھا...... اور خواب محل کو تو ریت گھروندے کی طرح بکھرنا ہی تھا تب اس نے جانا کہ وہ تو ایک چٹیل میدان کے تپتے صحرا میں تنہا بھٹک رہی ہے......

کبھی منگتوں کے نصیب میں بھی شہزادے ہوئے ہیں، اس نے خود کو شہزادی کے روپ میں دیکھتے ہوئے یہ کیوں نہیں سوچا تھا، کھلی آنکھوں سپنا دیکھا ہی کیوں تھا اور سپنا بھی وہ جو کبھی اپنا نہیں ہو سکتا، سپنوں پر منگتوں کا حق ہوا ہے بھلا؟ سپنے بھی امیروں کی شہزادیوں کی میراث ہیں...... وہ ٹوٹ پھوٹ چکی تھی......
وہ اپنے نومولود گول مٹول انتہائی خوبصورت بیٹے کو خالہ امیرن کے گھر چھوڑ آئی جو محلے کی ان عورتوں کے بچے معاوضے پر رکھا کرتی تھی جو عورتیں گھروں میں ماسی کے فرائض انجام دیا کرتی ہیں۔ بھیک مانگنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ گجروں میں کچھ زیادہ کمائی نہ تھی۔ البتہ اس کی بیٹی ویرا خوب کماتی تھی۔ بیٹا بھی تھوڑا بہت کما ہی لیتا تھا۔ بیٹی کے ڈھیر سارے پیسے لانے پر کبھی اسے تشویش نہ ہوئی۔ چونکی تو وہ اس وقت جب ویرا تین دن تک گھر نہ پلٹی۔ اس نے سارے اڈے چھان مارے اسے ملنا تھا نہ وہ ملی ایک روز ویرا کی ساتھی لڑکی اسے فٹ پاتھ پر نظر آئی۔
نی ویرا کتھے......؟ اس نے اسے لپک کر جا لیا۔
میرے کو کیا پتہ؟ لڑکی نے بازو چھڑاتے ہوئے سر ہلانا شروع کر دیا۔
تیرے کو سب پتہ ہے...... اس نے دوبارہ اس کا بازو مروڑا۔
چھڈ، مینوں کی پتہ......
بولتی ہے کہ لگاؤں جھانپڑ...... اس نے کہتے ساتھ ہی بیچ بیچ دو تین تگڑے ہاتھ رسید کر دیے۔
بول کہ ہور لاواں...... اس نے اس کے بال پکڑ کر کھینچے...... لڑکی خود کو بچانے لگی۔
چھوڑ بتاتی ہوں...... اس نے دھیرے سے اس کے بال چھوڑ دیئے۔
او...... وکرم کے ساتھ بھاگی ہے......
ہا...... ہا...... اس نے اپنے سینے پر دو ہتھڑ مارے او جو ہندو ہے......
میرے کو کیا پتہ...... لڑکی کے ہاتھ میں جو گندی مندی سی لالی پاپ تھی وہ اس نے چوسنا شروع کر دیا۔
تیرے کو سب پتہ ہے کمینی...... وہ سر پکڑ کر وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ کم بخت، کم جات، مر جائے اللہ کرے، ایک ہندو نال دوڑ گئی...... اللہ کرے گڈی دے تھلے آ وے...... وہ وہیں رونے لگی......
ان لوگوں میں اولاد کی محبت کم ہی پرورش پاتی ہے۔ وہ روتے ہی مگر بہت تھوڑا، چاہے ان کی اولاد مر جائے یا بھاگ جائے...... وہ بھی روئی مگر اتنا ہی جتنا ان کی برادری میں رویا جاتا ہے، پھر صبر کر کے بقیہ دو بچوں میں مگن ہو گئی......
اس روز میکا گھر آیا تو لوگوں سے ویرا کے بھاگنے کا پتہ چلا گھر میں گھستے ہی اس نے چھمی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔
حرام زادی، ہیاجت نہ کر سکی...... بے غیرت...... اپنی ذمہ داریوں کو چھمی کے کھاتے میں ڈال کر دو چار تھپڑ اور رسید کر ڈالے۔
تو مر جاتی پر بھاگنے نہ دیتی...... جاتے جاتے اس نے پلنگ کی پٹی کے ساتھ چادر کے جھولے میں لیٹے ننھے وجود پر حقارت کی نگاہ ڈالی...... اس بدبخت کو بھی دنیا میں آنا تھا۔
اس کے کوسنے پر چھمی کو دل پر ایسے چوٹ لگی جیسے وہی اس کا اکلوتا بیٹا ہو۔
وہ کچھ اور آگے بڑھا تو چھوٹو زمین پر بیٹھا اپنی چپل درست کر رہا تھا۔ جاتے جاتے اس نے ایک دھموکڑا اس کی کمر پر بھی رسید کر دیا۔
''مرتے نہیں کمبخت......'' وہ سر جھکا کر رونے لگی۔
اس روز جمعہ تھا...... وہ پھول بیچنے جا رہی تھی راستہ کٹ کے نہ دیتا تھا لگتا تھا مسافت طویل تر ہو گئی ہے حالانکہ وہ روز ہی اس رستے میں عبور کرتی تھی۔ مسجد کے

لاؤڈ اسپیکر سے مولانا صاحب کی آواز بہت صاف و واضح سنائی دے رہی تھی۔ اسے طویل کھیل کا میدان عبور کر کے روڈ تک آنا تھا وہ اپنی ہی دھن میں مگن چلی جا رہی تھی۔ پھر نہ جانے کیسے اس نے مولانا صاحب کی آواز پر دھیان دیا......

''اللہ تعالیٰ بہت غفور و الرحیم ہیں۔ وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں اس لیے انہوں نے اپنے لیے ''ارحم الراحمین'' کا انتخاب کیا ہے۔ لوگو غور سے سنو! جب دنیا میں کوئی بندہ جرم کرتا ہے تو اس کے خلاف قانون کی کتاب کھل جاتی ہے۔ پھر وہ اپنے جرم کی سزا بھگت لیتا ہے لیکن دنیاوی قانون کی نظر میں وہ تمام عمر کے لیے مجرم لکھ دیا جاتا ہے۔ سزا بھگتنے کے بعد بھی وہ مجرم ہی رہتا ہے۔ جرم کی کتاب سے اس کا نام خارج نہیں کر دیا جاتا، مٹا نہیں دیا جاتا...... جب کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو پھر اسے جکڑ لیا جاتا ہے...... ہے ناں...... مگر میرے رب کے قانون کو دیکھیے...... وہ کس قدر غفور الرحیم ہیں، رحمٰن ہیں رحیم ہیں کہ جب بندہ توبہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے جب وہ سچی اور خالص توبہ کرتا ہے تو رحمت خداوندی جوش میں آ جاتی ہے اور حکم ہوتا ہے فرشتوں کو...... کہ اس بندے کے اعمال نامے میں سے گناہوں کو مٹا دو بس...... اب وہ پاک ہو گیا، بے گناہ ہو گیا۔ دنیاوی قانون کی طرح نہیں کہ ہر جرم پر سابقہ مجرم کی فائل کھول دی جائے، رب نے معاف کر دیا تو بندہ، نومولود کی طرح پاک ہو گیا۔ تو مسلمانو! رب سے مغفرت طلب کرتے رہو۔ توبہ کا در اس وقت تک کھلا ہے جب تک تم اپنی آنکھوں سے موت کا چہرہ نہ دیکھ لو...... پلٹ آؤ مومنو! نیکی کی طرف، بھلائی کی طرف، فلاح کی طرف، مغفرت کی طرف...... مولانا کی آواز پر کھیل کا طویل میدان عبور کر کے اس کے قدم خود بخود ست تو ہو ہی گئے تھے اب اس کے اندر نہ معلوم کیسی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ رک گئی......

لمحہ بھر میں تائب ہو گئی، انسان کو پلٹتے لمحہ ہی تو لگتا ہے۔

وہ بھی پلٹی اور محلے کی اس عورت کے پاس چلی آئی جس سے اس کی پرانی شناسائی تھی۔ راستے بھر وہ روتی اور مغفرت طلب کرتی رہی وہ روتی دھوتی دروازہ کھول کر اس ہمدرد عورت کے سامنے تھی۔

کیا ہوا جھمی تو پھول بیچنے نہیں گئی...... جھمی کچھ نہ بولی۔

رب کا واسطہ کچھ تے بول...... اس نے جھمی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

جھمی کے لب آپس میں جڑے ہوئے تھے مگر آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

کیا ویرا لوٹ آئی ہے...... اس نے سرگوشی کی۔

جھمی نے نفی میں گردن ہلا دیا۔

میں تجھے بابا صاحب کے پاس لے چلوں گی بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ایسا تعویذ...... نئی جانا میں نے کسی بابے کے پاس...... آنسو پونچھ کر وہ ذرا سنبھلی۔

فیر......؟ وہ بہت حیران ہوئی۔

تو مجھے بنگلوں میں نوکری دلا دے۔ تو، تو جاتی ہے ناں کام کرنے بنگلوں میں...... اس نے حق حلال روزی کمانے کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا......

لے، اے کوئی مشکل کم ہے، میں تے ڈر ہی گئی تھی...... وہ ہولے سے ہنسی۔

میں آج ہی سمیرا بی بی کی امی سے بات کروں گی۔ ان کی کام والی گاؤں چلی گئی ہے انہیں ضرورت ہے، کل سویرے آ جانا۔ دونوں چلیں گے۔

اگلے روز وہ نہا دھو کر صاف ستھری ہو کر آئی اور اس نے جھمی کو ایک بنگلے میں شام تک کے لیے لگا دیا۔ ادھر اس نے چھوٹو کو قریبی مدرسے میں پڑھنے بٹھا دیا۔ شام گئے جب وہ پلٹتی تو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے

جس کا نام بھی اس نے فیصل ہی رکھ دیا تھا، کو ساتھ لے آتی۔

اس روز بنگلے سے پلٹی تو مسجد کے سامنے روڈ پر رش لگا تھا۔ اچٹتی نگاہ ڈال کر آگے بڑھنے لگی۔

''خالہ جھمی'' کی آواز پر پلٹی تو اس کے محلے کا لڑکا تھا۔

کیا ہوا؟ وہ لڑکے کو استفہامیہ تکنے لگی۔

دیکھ تیرا بیٹا۔

کیا ہوا میرے بیٹے کو...... وہ چکرائی۔

چھوٹو مسجد سے نکلا ہی تھا کہ کسی گاڑی نے کچل دیا۔ لڑکے کے کہنے پر وہ بھاگتی ہوئی ہجوم کو چیرتی اندر جا گھسی جہاں اس کا چھوٹو خون میں لت پت مرا پڑا تھا۔

کیا ہوا اسے یہ کیسے مر گیا؟ وہ چیخ چیخ کر ہر ایک سے پوچھ رہی تھی۔

مگر کہیں سے اسے جواب نہ مل رہا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر سر میں خاک ڈالتی جاتی اور چیخوں سے آسمان سر پر اٹھاتی جاتی۔

پولیس آ چکی، ہجوم میں موجود ہر شخص اپنی بات کر رہا تھا اور وہ ہوش و خرد سے بیگانی چیخیں مار رہی تھی۔

پولیس اس کے مردہ بیٹے کو اٹھا رہی تھی تبھی اس نے ہجوم میں اپنے شوہر کو دیکھا جو پولیس سے کچھ بات کر رہا تھا۔ جو اسے سنائی نہ دے رہی تھی۔ پھر اس نے دیکھا اس کا شوہر پولیس وین میں بیٹے کی لاش کے ساتھ بیٹھ کر چلا گیا۔ ہجوم آہستہ آہستہ چھٹ گیا۔ اس کے محلے کی کچھ عورتیں اسے سہارا دے کر کھڑا کرنے لگیں اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

چھوٹو کی لاش کب لائی گئی کب وہ دفن ہوا۔ اس کا شوہر کتنے دن اس کی جھونپڑی میں رہا۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ اسے تو فیصل کا بھی ہوش نہ تھا محلے کی عورتیں فیصل کو دودھ میں پانی ملا ملا کر فیڈر سے پلاتی رہیں تاکہ یہ جان تو جی جاتے......

ایسا ہرگز مت کرو!

مت ملو: ان سے جو صرف مطلب کے وقت ملتے ہیں۔

مت چلو: ان کے ساتھ جو راستے میں دغا دیتے ہیں۔

مت جاؤ: ایسی جگہ جہاں برائیاں جنم لیتی ہیں۔

مت چکھو: ایسا ذائقہ جو زندگی کو پامال کر دے۔

مت سنو: ایسی بات جو زندگی کو منتشر کر دے۔

مت چنو: ایسا پھول جو زندگی کو ویران کر دے۔

مت سوچو: ایسی بات جو تمہیں اپنوں سے متنفر کر دے۔

مت بولو: کچھ ایسا کہ جو تمہیں شرمندہ کر دے۔

مت کھاؤ: جو حرام ہو ایسا نہ ہو کہ ہر لقمہ تمہارے لیے عذاب کا باعث بنے۔

مت کرو: ایسا عمل جو تمہیں وقتی خوشی دے۔

مت سو: اتنا کہ جو تمہیں غفلت میں مبتلا کر دے۔

(جنید شاہ، جھنگ)

ہوش و خرد کی دنیا میں تو اس وقت لوٹی جب اس کا شوہر کمرے میں موجود زنگ آلود ڈبوں میں سے اس کی تمام نقدی اور پلنگ کے گدوں میں چھپے تمام نوٹ لے اڑا......

وقت اگر ظالم ہے تو بہت بڑا مرہم بھی ہے۔ وقت کا سب سے بڑا کام گزرنا اور زخموں کو مندمل کرنا ہے۔ سو وقت نے اس کا زخم بھی مندمل کر دیا اور اس نے اپنے روٹین کے کام پھر نمٹانے شروع کر دیے۔ کہ جب تک مالک کا حکم ہے اسے جینا ہی پڑے گا......

وہ جس گھر میں ماسی کے فرائض انجام دیتی تھی وہاں اکثر درس تدریس کی محافل منعقد ہوا کرتی تھیں جنہیں وہ بہت ذوق وشوق سے سنتی تھی اور اختتام پر خوب رو رو کر گڑگڑا کر رب سے اپنے گناہوں پر مغفرت طلب کرتی تھی۔ اسے پورا پورا درس ازبر ہو جایا کرتا گو وہ بالکل ان پڑھ تھی لیکن اس کا ذہن بہت اچھا تھا۔ اس نے خود کو نمازی پرہیزگار بنالیا تھا۔

ایک روز سمیرا (مالکن کی بیٹی) اپنی ماں کو "بے اولاد جوڑے کو بچہ گود چاہیے" کے عنوان سے ایک اشتہار سنا رہی تھی...... تبھی اسے بہت اچھوتا سا خیال سوجھا...... وہ جھاڑن لیے سمیرا کے پاس آ گئی۔

چھوٹی بی بی ذرا مجھے بھی سناؤ......

کیوں تم کیا کرو گی؟

آپ سناؤ تو سہی کیا لکھا ہے؟ لجاجت بھرے لہجے میں رسان سے اس نے کہا اور سمیرا کے قدموں میں بیٹھ گئی، لکھا ہے......

"مسٹر خان حرا کو ایک عدد بچہ گود چاہیے جس کا وہ معاوضہ بھی ادا کریں گے۔" سمیرا نے سرسری سا اسے بتا دیا۔

"جی ذرا آپ میری بات کرا دیں میں اپنا بچہ دینا چاہتی ہوں۔"

"ہیں......" ماں اور بیٹی دونوں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔

وہ کچھ نہ بولی بس اپنی انگلی ہی مروڑتی رہی۔

تم کیسی ماں ہو......؟ مالکن بہت حیرت سے بولی۔

مگر وہ اب بھی کچھ نہ بولی اور اصرار کرتی رہی بالآخر سمیرا نے اس فیملی کو اپنے ایڈریس پر بلا لیا۔

"دراصل یہ بچہ مجھے کچرے کے ڈھیر سے ملا تھا میں اسے اٹھا لائی مگر میرا شوہر اسے پسند نہیں کرتا تھا وہ ہمیں بہت تنگ کرتا اس بچے سے تو بہت خار کھاتا تھا، اس لیے میں اسے کسی امیر جوڑے کو گود دینا چاہتی ہوں تاکہ یہ ہماری طرح غربت نہ جھیلے بڑا آدمی بنے۔" رات بھر بنی کہانی اس نے رٹو طوطے کی طرح سنا دی۔ مسٹر اور مسز خان مراد نے اس سے بہت سارے سوالات کیے۔ جس کے جوابات دے کر اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔

"معاوضے کے طور پر ہم تمہیں روپیہ بھی دیں گے۔ لیکن تم قانونی طور پر بھی اس بچے سے دستبردار ہو جاؤ گی۔ کچھ قانونی پیپرز ہیں جنہیں تم سائن میرا مطلب ہے انگوٹھا لگاؤ گی۔" مسٹر خان بہت بردباری سے اسے سمجھانے لگے۔

جی مجھے پیسے بالکل نہیں چاہیے بس جی میری شرط ہے......

شرط کیسی...... وہ دونوں حیران ہوئے۔

اس نے اپنی طے شدہ کہانی آگے بڑھائی۔

"وہ جی میرا شوہر اپنی پہلی بیوی کے ساتھ رہتا ہے میرے کوئی بال بچہ تو ہیں نہیں اس نے دانستہ جھوٹ بولا۔ میرا اس بچے کے سوا دنیا میں کوئی نہیں بس آپ مجھے اپنے گھر رکھ لیں صرف دو وقت کی روٹی دے دیجیے گا...... وہ رونے لگی۔ دوسری بات یہ کہ بچے کا نام فیصل ہی رہنے دیں۔"

فیصل کیوں؟

میرا ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جو مہینے بعد مر گیا اس کا نام فیصل تھا بس میں چاہتی ہوں یہ فیصل ہی کہلائے۔ پندرہ دن کی سوچ وبچار کے بعد خان فیملی نے چند شرائط کے بعد اس کی دونوں شرائط منظور کر لیں اور یوں وہ ان کے گھر کے سرونٹ کوارٹر میں منتقل ہو گئی۔ ان کا گھر ڈیفنس میں تھا۔ نوکروں کی ریل پیل تھی۔ اسے اندر آنے فیصل سے بات کرنے یا اسے پیار کرنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ بس اسے دو وقت کی روٹی اور کپڑا مل جاتا تھا۔

فیصل بڑا ہو گیا تھا۔ لان میں اکثر وہ اسے کھیلتا نظر آتا۔ اس کے ساتھ اس کی آیا ہر وقت رہتی لہٰذا وہ اسے

پیار تک نہیں کر سکتی تھی۔ بس وہ اسے چھپ چھپ کر دیکھتی اور آنکھیں سینک لیتی تھی۔ جب وہ سکول جا رہا ہوتا یا کہیں بھی خان فیملی کے ساتھ جا رہا ہوتا تب اس کا جی چاہتا اسے بانہوں میں بھر لے دل بھر کر پیار کرے کہ اس کی ممتا کو کچھ تو قرار آ جائے لیکن وہ اپنے وعدے کی پاسداری پر قائم تھی۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے، اکیلے کمرے میں رہتے اب اسے اکثر اپنے سارے بچے یاد آتے جس میں فیصل کا دکھ سب سے سوا تھا۔ جو چند گز کے فاصلے پر تھا مگر اس سے کوسوں دور تھا، پاس رہ کر بھی دور مگر اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا وہ اپنی اولاد سے قانونی طور پر دستبردار ہو چکی تھی اس کے بہتر مستقبل کے لیے یہ فیصلہ اس کا اپنا تھا۔

وہ عمر کی اس دہلیز پہ تھی جسے بڑھاپا کہتے ہیں۔ چہرے پر تفکرات نے ڈیرے جما لیے تھے۔ طرح طرح کی بیماریوں نے جسم میں جگہ بنائی تھی۔ مسٹر اور مسز خان چونکہ عرصے سے اسے دیکھ اور پرکھ چکے تھے لہٰذا اس پر اعتبار بھی کرتے تھے اور ہر طرح اس کا خیال بھی رکھتے تھے۔ اسے جیب خرچ بھی دیتے تو وہ ناں ناں کرتی رہتی...... وہ انتہائی قناعت پسند ہو گئی تھی۔

فیصل جوان ہو چکا تھا۔ انتہائی وجیہہ وخوبرو نکلا تھا۔ اس میں فیصل کامران کی مشابہت تھی وہ مسز خان کے ساتھ ان کی فرم سے منسلک ہو گیا تھا اور انہی کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ فیصل کے آفس جانے کے ٹائم دانستہ باہر نکل آتی اور بڑی حسرت سے اسے تکا کرتی اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی تھی لیکن کبھی وہ اس سے بات کرنے کی جسارت نہیں کرتی تھی جبکہ فیصل کبھی کبھار اس سے بات کر لیا کرتا تھا۔ اسے پوچھ لیتا وہ خوش ہو جاتی پھر اس رات اسے نیند ہی نہ آتی۔

ایک روز چوکیدار سے بھنک ملی کہ فیصل کی شادی طے ہو رہی ہے۔ نہ جانے کیسا بے قراری وبے چینی اس کے اندر در آئی تھی جس نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا تھا اور یہ بے چینی یوں ہی نہیں تھی...... بلکہ آنے والے مہمانوں میں ایک چہرہ اس بے چینی وبے کلی کا سبب تھا...... پھر اس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی...... چپ سادھ لی، دل کو دھیرے دھیرے سنبھالا اور سمجھایا اور بہت کچھ ہو جانے کا انتظار کیا۔ اس روز وہ لیٹی سوچوں میں گم تھی۔ ملازمہ نے اندر سے مٹھائی اور کچھ نمکین اسے لا کر دیا۔ وہ کھانستے کھانستے اٹھ بیٹھی یہ کیا ہے......؟ اس نے برتن ہاتھ میں سنبھال کر ملازمہ سے پوچھا۔

اپنے فیصل صاحب کی بات چیت کسی بہت بڑے صنعتکار کی بیٹی سے طے ہو گئی ہے۔

ملازمہ اطلاع دے کر جا چکی تھی اور وہ سوچوں میں گم دیوار کے سہارے ٹک گئی۔

بعض اوقات قدرت کس طرح مہرباں ہو کر اپنے بندے کو انتقام کے مواقع فراہم کر دیتی ہے۔ جس کا ناقص العقل بندے کو ادراک تک نہیں ہو پاتا، جو کچھ ہم نے سوچا تک نہیں ہوتا وہ پورا ہونے جا رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں۔ "رب کے بھید رب ہی جانے" اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔

قدرت کی مہربانی سے آج اس کا وہ انتقام پورا ہونا تھا جو ایک طویل عرصے سے اس کے اندر پل رہا تھا، جو اسے دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ جو اگرچہ سو چکا تھا مگر اچانک قسمت نے اسے جگا دیا تھا حالانکہ انتقام لینے میں اس کی کسی شعوری کوشش کا ہرگز کوئی دخل نہ تھا یہ سب مواقع تو قدرت نے ازخود ہی مہیا کیے تھے۔

آج لڑکی والوں کی مسز خان نے اپنے ہاں دعوت کی تھی وہ گھر سے باہر کچھ فاصلے پر پیڑوں کی باڑ میں چھپ کر کھڑی ہو گئی۔

تمام گاڑیاں آ چکی تھیں اس نے دیکھا ایک گاڑی

سے دلہن کے ماں باپ اترے جونہی ماں آگے بڑھی وہ لپک کر دلہن کے باپ کے قریب جا پہنچی۔

فیصل بابو ذرا میری بات سنئے...... ایک اجنبی عورت سے اپنا نام سن کر فیصل کامران بہت حیران ہوئے۔ سیاہ چادر میں لپٹا وجود تاریکی ہی کا حصہ لگ رہا تھا۔

تم کون ہو اور مجھے کیسے جانتی ہو؟ نہایت رعونت سے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھ کر پوچھا گیا۔ میں اسی بنگلے کے سرونٹ کوارٹر میں رہتی ہوں اگر آپ میری بات سن لیں تو مہربانی ہوگی اور پھر اس میں آپ ہی کا فائدہ بھی ہے۔

میرا فائدہ...... وہ بہت استعجاب سے بڑبڑائے۔

آپ یہ شادی نہیں کرسکتے...... قدرے ٹھہر کر اس نے کہا۔

What a non-senise انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔ یہی بات کہنے کو تم نے مجھے روکا ہے؟

وجہ نہیں پوچھیں گے آپ؟ اس نے ان کی بات قطعاً نظر انداز کر کے بڑے اعتماد سے کہا۔

میں چھمی ہوں...... وہ پوری کی پوری ان کے سامنے تھی۔

چھمی...... ؟ کون چھمی......؟ انہیں اپنا ماضی تو یاد ہی نہ تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کا حال ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

میں چھبیس سال پہلے پھول بیچنے والی منگتی چھمی ہوں جو فیصل انڈسٹری آیا کرتی تھی۔

فیصل کامران کو تو جیسے ننگا تار چھو گیا وہ لڑکھڑائے مگر پل بھر میں سنبھل گئے۔

تو میں کیا کروں، میں کسی چھمی ومی کو نہیں جانتا، بس تم یہ بتاؤ یہ شادی کیوں نہیں ہوسکتی۔ ان کی آواز کے ارتعاش نے بتا دیا کہ ان کا اعتماد متزلزل ہوا ہے۔

اس لیے کہ بہن اور بھائی کی شادی اسلام میں جائز نہیں۔ اس نے گلی لپٹی رکھے بغیر ہی دوٹوک کہا...... آپ کا ہونے والا داماد میرا اور آپ کا مشترکہ بیٹا ہے جو میں نے لاوارث کہہ کر مسٹر خان کو دے دیا تھا۔ اپنی بات کے ثبوت میں آپ چاہیں تو فیصل کے الٹے ہاتھ پر گودا گیا فیصل نام دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے آپ کے نام پر اس کا نام بھی فیصل ہی رکھ دیا تھا...... فیصل کامران چکرا کر رہ گئے۔ سیدھے ہاتھ اور دل میں درد کا احساس جاگا......

آپ نے میرے سچ کو جھٹلا کر مجھے اپنے گھر سے الزامات لگا کر نکالا تھا کہ یہ پاپ کسی اور کا ہے......اور میں نے آپ کے سر تھوپ دیا ہے۔ نہیں فیصل بابو...... ایسا تھا نہیں اگر آپ اپنے الزام میں سچے ہیں تو پھر آج یہ شادی ضرور کیجئے۔ قدرت کا انتقام بہت نرالا ہوتا ہے۔ آج آپ لوگوں کو اس رشتے کو توڑنے کی کیا وجہ بتائیں گے۔ گناہ گار میں اکیلی نہ تھی اللہ کے نزدیک ہم دونوں کا گناہ برابر تھا۔ مگر سزا تنہا میں نے کاٹی۔ آپ بری الذمہ ٹھہرے۔ وہ درس و تبلیغ کی محافل میں شرکت کرنے کے سبب بہت سمجھدار ہوگئی تھی۔

بے تکان بولنے سے لمحے بھر کو رکنے کے بعد اس نے کہا...... آج کے بعد سے فیصل بابو آپ ضمیر کی قید کاٹیں گے میں آزاد ہوں میں اپنے حصے کی سزا جھیل چکی اب آپ کی باری ہے۔ اس نے پورے کا پورا اپنا چہرہ دکھانے کے بعد چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا اور تیزی سے مڑ کر اندھیرے کا حصہ بنتی چلی گئی۔ آج اس کی چھبیس سالہ تھکن اتر گئی تھی۔

فیصل کی زبان گنگ ہو چکی تھی انہیں اپنا وجود کھینچنا بوجھل ہو رہا تھا۔ ہاتھ کے درد نے بڑھ کر دل کے دورے کی شکل اختیار کر لی تھی۔

اندر جگمگاتی روشنی اور بلے گلے میں دلہن کے باپ کی ڈھونڈ مچی تھی......

☆☆☆

پل صراط کا سفر

حاجرہ غفور

خواب زندگی کا حصہ ہیں مگر دکھ اس
وقت ہوتا ہے جب جاگتی آنکھوں سے
دیکھے گئے خواب بھی پورے نہ ہو پائیں
ان حالات میں دل ٹوٹ جاتے ہیں، محبت روٹھ جاتی ہے۔

ایک عورت کا فسانہ جس کے خوابوں کا محل ریت کی مانند بیٹھ گیا تھا

یہ ہم ہی جانتے ہیں، جدائی کے موڑ پر
اس دل کا جو بھی حال تجھے دیکھ کر ہوا

آج ایئر پورٹ پر اتنے ڈھیر سارے لوگ اسے ریسیو کرنے آئے تھے۔

اپنوں کو سامنے دیکھ کر اس کی حالت غیر سی ہونے لگی۔ اتنا عرصہ اپنوں سے دوری کا غم اور اتنا سارا پیار اسے سب یاد آنے لگے اور اس کے ساتھ ہی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ کسی نے اس کی ننھی سی ماہ نور کو اس کی گود سے لے لیا۔ اسے سامنے اپنی امی کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر ان سے لپٹ کر رو پڑی۔ وہ اپنے سارے غم انہیں آنسوؤں میں بہا دینا چاہتی تھی۔

صرف ڈیڑھ سال وہ اپنے وطن، اپنے لوگوں اور اپنے رشتوں سے دور رہی تھی۔ ایک اجنبی سے سب سے مضبوط رشتہ جوڑ کر وہ سب کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایک انجان دنیا میں بہت سے حسین خواب آنکھوں میں بسا کر وہ یہاں سے گئی تھی۔ اور اسی طرح اسے بہت سے لوگ یہاں ایک دن چھوڑنے بھی آئے تھے۔

آج وہ وقت اسے اس طرح یاد آ رہا تھا۔ جیسے کل ہی کی بات ہو مگر یہ کل کی بات نہیں تھی بعض دفعہ ایک انسان ایک لمحہ میں ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ مگر وہ تو لمحہ لمحہ ٹوٹتی بکھرتی رہی تھی۔ سفر بہت طویل تھا اور اس کی بچی بھی بہت چھوٹی تھی۔ وہ بے حد تھک چکی تھی۔

امی اس کے قریب بیٹھی تھیں۔ راستے بھر وہ طرح طرح کے سوالات کرتی رہیں اور آصفہ جھوٹ سچ بولتی رہی۔ آصفہ یہاں کتنے عرصے کے لیے آئی ہو۔ امی نے پھر سوال پوچھا تو آصفہ نروس سی ہو گئی۔ دل نے کہا صاف صاف بتا دوں۔ انہیں کہ کبھی نہ جانے کے لیے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

کچھ دن تو رہوں گی امی گھر میں کافی رونق تھی کیونکہ اس کی چھوٹی بہن نادیہ کی شادی تھی اور ایک طرح سے وہ سب کی نظروں میں شادی میں شرکت کرنے کے لیے آئی ہے۔

امی میں بہت تھک گئی ہوں آصفہ نے تھکن کا اظہار کیا۔ ہاں اب آرام کرنا مگر کچھ کھا پی کے۔ نہیں سچ امی میرا دل نہیں کر رہا کچھ کھانے کو میں بس تھوڑی دیر آرام کروں گی۔

''اچھا تو جا کر سو جا......'' امی نے بالآخر بات مان لی مگر ماہ نور، آصفہ کو اپنی بیٹی کی فکر ہوئی اسے ہم دیکھ لیں گے امی نے اسے سونے کے لیے بھیج دیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں شادی سے پہلے وہ رہتی تھی۔ بستر پر بیڈ کور بھی وہی تھے۔ دیوار پر لگا کلاک بھی وہی تھا۔ کھڑکی کے پردے بھی ویسے تھے۔ مگر اس کے حالات کتنے بدل گئے تھے۔ اپنے بستر پر لیٹ کر اسے بہت رونا آیا کس قدر وہ الجھی تھی اپنے آپ میں۔ آج وہ رو کر دل میں چھپا سارا غبار نکال دینا چاہتی تھی۔

اس کی بہنیں اس کے آجانے سے بے حد خوش تھی۔

''باجی آپ مکمل آرام کریں آج رات سے ہم ڈھولکی رکھیں گے۔'' اس کی چھوٹی بہن نے کہا اچھا کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

تقریباً دو سال پہلے وہ اسی طرح ڈھولک کی تھاپ میں اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ اسے وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔ جب وہ بی اے کا آخری پرچہ دے کر گھر واپس آئی تھی تو بہت خوش تھی۔ خود کو کس قدر ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ جیسے دل سے اک بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ کتنے دن سے وہ سب کچھ بھول کر صرف پڑھنے میں مصروف تھی۔ اسے اپنا بھی ہوش نہ تھا۔

پتا ہے آصفہ آج بڑے خاص خاص مہمان آ رہے ہیں۔ عائشہ نے کمرے میں آتے ہی خبر سنائی اور ساتھ ہی شرارت سے آنکھ ماری۔

کیا مطلب خاص مہمان؟ آصفہ نے حیرت سے عائشہ کی طرف دیکھا۔

ہاں جی امی جان کافی دنوں سے اس چکر میں ہے

کہ تم جلدی سے بی اے کر لو تو تمہیں ہم سب مل کر پیا دیس سدھار دیں۔ اور شام کو وہی خاص مہمان آ رہے ہیں۔ عائشہ نے آصفہ کے گلے میں بانہیں ڈال لی۔

بس بس رہنے دو امی کو منع کر دو میں نے نہیں کرنی شادی، وادی آصفہ کا موڈ ہی خراب ہو گیا۔

وہ عمر کے اس دور میں تھی جہاں لڑکیاں اپنا ایک آئیڈیل رکھتی ہیں وہ کسی کو پسند کرنا چاہتی تھی۔

آصفہ وہ لوگ بڑے ڈیسنٹ لوگ ہیں اور وہ لڑکا جو تمہارے لیے عرش سے اترا ہے وہ بڑا ہینڈسم ہے یار اور امریکہ سے آیا ہے تمہیں بیاہنے عائشہ نے اسے پل بھر میں اتنی ساری انفارمیشن دے دی۔ عائشہ کی باتوں میں کشش تھی کہ آصفہ کا دل خود بخود آمادہ ہو گیا۔ ساری تھکن جیسے جاتی رہی۔

امی نے کھانا بنانے کا کہا تو پھر موڈ آف ہو گیا۔ بڑی محنت سے سویٹ ڈش بنائی پھر سلاد بھی بنایا اس کے علاوہ میز بھی سجائی لان سے پھول توڑ کر گلدانوں میں خوبصورتی سے سجائے یہ سارا کام وہ بڑی لگن اور شوق سے کر رہی تھی۔

رات ہو گئی تب امی نے بڑے پیار سے اسے آواز دی۔ آصفہ آج ذرا اچھے سے کپڑے پہننا، ویسے تو وہ ہمیشہ سے صاف ہو کر رہتی تھی لیکن آج اس نے پرپل کلر کا سوٹ اور ساتھ ہی پنک لپ اسٹک لگا لی آج تو واقعی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ویسے وہ خود بھی بہت حسین تھی وہ اپنی بہنوں میں سے تھی بھی خوبصورت۔

مہمان کچھ دیر سے آئے اور انہیں انتظار کرنا پڑا۔ آنٹی راشدہ امی کی دور کی رشتہ دار تھی اور رفیع اس کا دور پار کا کزن بھی لگتا تھا۔ مگر آنا جانا نہیں تھا۔

رفیع جو آٹھ سال سے امریکہ میں مقیم تھا اور کچھ عرصہ پہلے واپس آیا تھا۔ لیکن اب اس کی والدہ اس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ آنٹی راشدہ کو آصفہ ہمیشہ سے پسند تھی۔ آصفہ کی امی رفیع سے ملی تو انہیں بہت پسند آیا کیونکہ رفیع بھی ان لوگوں کے ساتھ آیا تھا۔ رفیع کی امی کے ساتھ ساتھ رفیع کو بھی آصفہ بہت پسند آئی۔ رفیع امریکہ رہنے کی وجہ سے کافی پر اعتماد لگ رہا تھا۔ آصفہ کو بھی رفیع اتنا برا نہیں لگا۔

امریکہ میں رہنے کا تصور آصفہ کے لیے بڑا سہانا تھا وہاں ایسے میں اپنوں سے دوری کا احساس بھی دل کو زخمی کر رہا تھا۔ رفیع کی امی جاتے ہوئے آصفہ کی امی کے کانوں میں یہ بات ڈال گئیں کہ جلد ہی ہم آپ کی بیٹی کو انگوٹھی پہنانے آئیں گے۔

امریکہ کے نام میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ لوگ بیٹیوں کے رشتے کرنے میں جھٹ سے آمادہ ہو جاتے ہیں اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ لڑکے کا کردار کیسا ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ......

دوسری شام رفیع کی امی کا فون آ گیا آصفہ کی امی کافی دیر ان سے بات کرتی رہی اور جب فون بند ہوا تو بیگم ناہید عجیب سی پریشانی میں مبتلا تھی۔ پھر آصفہ کے پاس آ گئی۔ آصفہ رفیع چاہتا ہے کہ تم اس کے ساتھ اپنی پسند کی شاپنگ کرو۔

آصفہ امی کے منہ سے یہ بات سن کر خاموش ہو گئی۔ آصفہ کا دل چاہا کہ وہ کہہ دے کہ آج کل کے ترقی یافتہ زمانے میں یہ بڑی عام سی بات ہے۔ ساری لڑکیاں لڑکے پہلے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں سمجھتے ہیں اور پھر اس بندھن میں بندھتے ہیں۔ ایسا کرو تم چلی جانا امی نے کہا۔

شام میں رفیع اور اس کی بہن عروج آ گئے۔ شاپنگ تو ایک بہانہ تھی رفیع تو آصفہ سے ملنا چاہتا تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ شادی سے پہلے ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ رفیع کم مدت کے لیے آیا تھا اور جانے سے پہلے وہ شادی کرنا چاہتا تھا اور یہ سارا کام صرف ایک ماہ کے اندر ہونا تھا۔

اس شام انہوں نے بہت سی باتیں کی تھیں۔ آصفہ رفیع سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ جلد ہی نکاح کی تاریخ مقرر ہوگئی اور گھر میں شادی کی تیاری ہونے لگیں۔

آصفہ خوش بھی تھی اور اداس بھی تھی۔ پھر وہ دن بھی آ گیا وہ پرائی ہوگئی اور رفیع کے ساتھ ایک انجانے سفر پر روانہ ہوگئی۔

رفیع ہر لحاظ سے اچھا شوہر ثابت ہوا۔ جیسے اس کے دل میں بہت سا خوف تھا رفیع نے اپنے پیار سے ہر وسوسہ جلد دور کر دیا۔ وہ آصفہ کو ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا کیونکہ ایک ہفتے بعد رفیع کی روانگی تھی۔ مگر آصفہ کا ابھی ویزا نہیں آیا تھا۔ اس لیے وہ اکیلا ہی چلا گیا۔ تم جب آ ؤ گی تو ایئر پورٹ پر تمہارا استقبال کرنے کے لیے موجود ہوں گا۔ رفیع نے مسکراتے ہوئے آصفہ کو بائے کہا تھا۔

رفیع چلا گیا تو جیسے شب و روز بے رونق ہو گئے۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر اس کی زندگی میں یہ انقلاب آ گیا کہ ایک اجنبی سب کچھ بن گیا تھا اب وہ اس کے بغیر جیسے بے قراری ہوگئی تھی سچ کہتے ہیں کہ دلوں کے راز اللہ بہتر جانتا ہے۔ دل کی لگن نے جلد کام دکھایا اور اس کے جانے کا انتظام ہوگیا۔

ایک طویل سفر کے بعد جب وہ نیو یارک کے ایئر پورٹ پر اتری تو رفیع کو اپنا منتظر دیکھ کر ساری تھکن جاتی رہی۔ رفیع کے پاس چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا بے حد تنگ سا۔

"اللہ اتنا چھوٹا سا گھر۔" اسے دیکھ کر آصفہ کی تمام خوشی جاتی رہی۔ وہاں تو وہ کھلے کھلے گھروں میں رہنے کی عادی تھی۔ اس کا دل بجھ گیا۔

اوہو بس دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ اسے رفیع کا یہ گھر بالکل پسند نہیں آیا۔

شروع شروع میں آصفہ کا وہاں بالکل دل نہ لگا۔ اسے گھر والوں کی بہت یاد آتی تھی۔ اس نے رفیع کے ساتھ باہر جا کر ایک دفعہ گھر والوں کو فون کیا تھا۔ رفیع جو بھی یہاں کماتا تھا اس کا بڑا حصہ وہ پاکستان اپنے گھر والوں کو بھیجتا تھا۔

یہاں تو آصفہ کو رفیع کھانے پینے کا سامان لا کر بھی نہیں دیتا تھا کیونکہ رفیع ہمیشہ باہر سے پکا ہوا کھانا اور ناشتہ کے ٹائم ڈبل روٹی لے آتا تھا۔ آصفہ گھر کے پکے ہوئے کھانوں کو ترس گئی تھی۔ حالانکہ وہ خود اتنا اچھا کھانا پکا لیتی تھی۔

آصفہ ایک مہینہ کے اندر ہی اندر بہت ہی بور اور اداس رہنے لگی۔ رفیع عجیب شکی مزاج آدمی تھا۔ دیکھو تم میری ضرورت تھی اس لیے تمہیں میں بیاہ کر لایا ہوں تم میری بیوی ہو اور بیوی بن کر رہو اور ہاں میری غیر موجودگی میں تم گھر سے باہر نہ جانا یہاں کا ماحول بہت خراب ہے۔ رفیع نے ایک طرح سے اسے قید کر کے رکھ دیا تھا اور وہ ایک قید چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتی رہتی۔

روشنیوں میں ڈوبا ہوا یہ شہر اسے بالکل پسند نہ آیا اور نہ ہی اس کا وہاں دل لگا۔ کیونکہ اتنے عرصے میں اس کی وہاں کوئی دوست بھی نہیں بنی تھی۔ کیونکہ وہاں کی زبان ہی الگ تھی نہ اسے کسی کی بات کی سمجھ آتی اور نہ اس کی بات کی۔ رفیع وہاں کیا کام کرتا تھا اس نے آج تک اسے نہیں بتایا اور نہ ہی آصفہ نے پوچھا کیونکہ اسے اب خاموش رہنے کی عادت ہوگئی تھی۔

آہستہ آہستہ اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ آصفہ پلیز اپنا خیال رکھا کرو اپنی حالت دیکھی ہے کبھی کبھی وہ پریشان ہو جاتا۔

آصفہ اپنے آپ میں اتنا الجھ گئی تھی کہ وہ کبھی کبھی رفیع کی بات کا جواب لڑائی سے دیتی۔ اس کا موڈ خراب رہنے لگا۔ اس کو یوں محسوس ہوتا کہ رفیع نے اسے دھوکا دے کر شادی کی ہے۔ اگر وہ سچ بتاتا کہ وہاں امریکہ میں وہ ایک تاریک سے محلے کے ایک

ڈربے میں رہتا ہے اور سارا دن مصروف رہتا ہے تب وہ کبھی اس کے ساتھ شادی نہ کرتی۔

ان کی پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام رفیع نے ماہ نور رکھا۔ ماہ نور ہونے کے بعد آصفہ کی تنہائی دور ہو گئی۔ مگر اب اسے یہ کمرہ اور چھوٹا لگنے لگا۔ وہ رفیع سے اب اکثر کہتی دن بھر اب جو کماتے ہو کیا وہ اپنے آپ پر لگانا حرام ہے۔ رفیع سنی ان سنی کر جاتا۔ آصفہ دن بہ دن رفیع سے اب بدگمان ہونے لگی تھی۔

یہاں بڑی مہنگائی ہے اسی میں گزارا کرو فی الحال میں بڑی جگہ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ رفیع بھی اب تھوڑا تھوڑا اس پہ بولنے لگا تھا۔ اس ماحول سے آصفہ بے زار سے ہونے لگی زندگی میں کوئی خوشی نہ رہی وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ ہمیشہ کے لیے آصفہ ماہ نور ہونے کے بعد نڈھال سی رہنے لگی۔ کسی نہ کسی بات کو یاد کر کے آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آتے وہ کسی کے ساتھ شیئر بھی نہیں کر سکتی تھی۔

رفیع میں پاکستان جانا چاہتی ہوں۔ آصفہ نے ایک دن یہ بات کہہ دی۔

کیوں؟ رفیع نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ نادیہ کی شادی ہے سب اصرار کر رہے ہیں۔

اس نے صاف انکار کر دیا۔

کیوں؟ آصفہ نے الجھ کر پوچھا۔

خرچا بہت ہے اور ہاں پانچ سال کے لیے پاکستان جانا بھول جاؤ۔

"پانچ سال؟ لیکن میں جاؤں گی۔" آصفہ نے ضد کی تو رفیع خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آصفہ بھی کچھ ماحول کے اثر سے چڑچڑی اور بدمزاج ہوتی جا رہی تھی۔

آصفہ بہن کی شادی میں ضرور جانا چاہتی تھی لیکن رفیع اسے بھیجنا نہیں چاہتا تھا۔ اس بات پر اکثر جھگڑا رہنے لگا تھا۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ رفیع نے

تنقید

ایک ریٹائرڈ آفیسر کو اپنی بیوی کے ہر کام میں نقص نکالنے کی عادت تھی۔ اگر وہ انڈہ ابالتی تو کہتا کہ اسے فرائی کرنا تھا۔ جس دن بیوی انڈا فرائی کرتی تو کہتا اسے ابالا کیوں نہیں؟

ایک دن بیوی تنگ آ کر دونوں طرح کے انڈے بنا لائی۔ اس آفیسر نے انڈوں کو کافی دیر تک دیکھا اور پھر بولا۔ "تمہیں عقل کب آئے گی؟ جس انڈے کو ابالنا تھا، اس کو تم نے فرائی کر دیا اور جس کو فرائی کرنا تھا اس کو ابال دیا۔"

(زینب حسین، کراچی)

صاف جواب دے دیا۔

ہاں ہاں میرے لیے تو آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ آصفہ نے بھی سخت لہجہ اپنا لیا۔ سب کچھ تمہارا ہے مگر تم میں صبر نہیں۔ وہ تنگ آ کر کہتا۔

"ہاں بہت صبر کیا مگر اب برداشت نہیں ہوتا۔" آصفہ بھی فوراً جواب دینے لگی۔

آخر تنگ آ کر رفیع نے آصفہ کو ٹکٹ لے دیا۔ آصفہ میں تم کو اب کبھی نہیں بلاؤں گا یہ ایک طرح کی دھمکی تھی۔ پھر آپ کب تک آئیں گے اس نے پوچھا کیونکہ شوہر کو چھوڑ کے جانا بھی اچھی بات نہیں تھی۔

جب تمہارے قابل ہوا تب وہ بے رخی سے بولا۔

رفیع نے آصفہ کو تمام شاپنگ کروا دی۔

آصفہ تم نے میرے بارے میں یہ سوچ رکھا ہے کہ میں جو دن بھر کام کرتا ہوں گھر سے باہر رہتا ہوں تو بوریاں بھر بھر کے نوٹ کماتا ہوں۔ میں یہاں ایک مزدور ہوں۔ ہاں ویسا مزدور جس سے تم اپنے وطن میں

بات کرنا تک پسند نہیں کرتی ہوگی۔

آصفہ خاموش رہی مگر دل میں اس انکشاف نے دراصل اسے ہلا کے رکھ دیا تھا۔ میں دن میں ایک موٹر گیراج میں کام کرتا ہوں۔ گاڑیاں دھوتا ہوں اور شام کو ایک گیس اسٹیشن پر پر کام کرتا ہوں اور ہر آنے والی گاڑی میں فیول بھرتا ہوں۔ انکشاف درانکشاف آصفہ کی رنگت سفید پڑتی جارہی تھی۔

اللہ! کتنے بے ایمان ہوتے ہیں یہ امریکہ میں رہنے والے ہمارے ہم وطن پاکستان آکر کیسا رعب ڈالتے ہیں یہ...... آصفہ کا دم گھٹنے لگا۔

وہاں تو یہ انجینئر مشہور ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ بھی انجینئر ہوتا ہے یہ موٹر مکینک ...... رفیع نے جیسے اس کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔

آصفہ صدمے سے دو چار ہو رہی تھی۔ نہ جانے ہمارے والدین کو کیا ہو جاتا ہے کہ وہ بیرون ملک کے نام پر اپنی بیٹیوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ بیرون ملک بھیج کر شاید وہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ کیا اپنے ملک میں وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی کو ایک موٹر مکینک یا پٹرول پمپ پر کام کرنے والے لڑکے سے بیاہنا پسند کریں گے؟ وہ زخمی دل کے ساتھ وطن واپس آگئی۔ مگر آتے ہوئے دل میں اک کسک ضرور رہی تھی۔

''رفیع، پلیز آپ جلد آنے کی کوشش کرنا۔'' آصفہ نے افسردگی سے کہا تھا۔

''جب اس قابل ہوا تو تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔'' اس کے سسرال والے بھی سب اسے لینے آئے تھے۔

اب وہ اپنے کمرے میں لیٹے یہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے بھرم کو رکھے گی اور یہ نہیں بتائے گی کہ وہ وہاں کیا کرتا ہے۔ آخر یہ اس کی اپنی عزت کا بھی تو سوال ہے۔

وہ جلد وہاں بہل گئی برے برے خیالات آپ ہی آپ دور ہوتے گئے۔ گھر میں رونق ہی اتنی تھی۔ اس کی ساری سہیلیاں اس سے ملنے آئیں وقت بہت اچھا گزرنے لگا۔

لڑکی ایک بار میکے کی دہلیز کو چھوڑ دے تو وہ بات نہیں رہتی۔ آصفہ کے دل میں ایک پریشانی تھی کہ وہ وہاں رفیع کو اکیلا چھوڑ آئی ہے۔ کئی بار سوچا کہ رفیع کو فون کرے مگر ٹائم نہ مل سکا۔ نادیہ کی شادی اسی شہر میں کی گئی تھی۔

دوری کے زخم بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں پہلے وہ اپنے گھر والوں سے دور رہ کر اداس تھی۔ اب وہ رفیع سے دور رہ کر اداس تھی۔

نادیہ کی شادی کے بعد وہ اپنے سسرال آگئی ایک طرح سے اب اس نے وہیں رہنا تھا۔ یہ گھر اس کی شوہر کی کمائی سے بنا ہوا تھا کہ وہ سخت اذیتیں جھیل کر اپنے گھر والوں کو زندگی کی ہر راحت دے رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس گھر کا بڑا تھا۔

چھوٹا بھائی ابھی پڑھ رہا تھا اس کی دو نندیں جوان تھیں ایک کا رشتہ ہو چکا تھا۔ بھائی نے اس کے لیے ہر چیز بنا کر رکھی تھی۔ اسے آئے ہوئے تین ماہ ہو گئے مگر رفیع نے اس کے لیے اسپیشل کوئی چیز نہ بھیجی ایک دو دفعہ رسمی دعا سلام ہوئی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ پیسوں کی ضرورت ہو تو امی سے لے لینا۔

رفتہ رفتہ اس کی ساس نے اس پر گھر کا سارا بوجھ ڈال دیا۔ اگر آصفہ کبھی کام میں کوتاہی کرتی تو اس کی ساس روایتی ساس بن جاتی اور گھر کا ماحول خراب ہو جاتا۔

رفیع کی امی بار بار پوچھتی ہیں کہ رفیع تم کو واپس کیوں نہیں بلاتا امریکہ میں کیا جواب دوں؟ آج آصفہ کی رفیع سے فون پہ بات ہوئی تو یہ بات بھی کہہ دی۔ فی الحال میں تم کو وہاں نہیں بلا سکتا اور نہ خود آ سکتا ہوں ابھی ممکن نہیں ہے۔ اس نے ٹکا سا جواب دے کر فون بند کر دیا تھا۔

دن گزرتے گئے دنوں کا حساب ماہ نور کو دیکھ کر زیادہ ہوتا وہ جب امریکہ سے آئی تھی تب چند ماہ کی تھی اور اب وہ چلنے اور بولنے لگی تھی اور سکول بھی جانے لگی تھی۔ آصفہ رفیع کو ماہ نور کی تمام تصاویر بھیجتی تھی کہ شاید بچی کی محبت کی کشش اسے یہاں لے آئے مگر......

رفتہ رفتہ دن گزرتے گئے اپنی بچی کو دیکھ کر آصفہ احساس کمتری کا شکار رہنے لگی۔ اس کی بہن نادیہ بھی اب ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔ وہ جب بھی دیکھتی کہ اس کا بیٹا اپنے باپ کے ہاتھوں میں ہے تو اسے اپنی ماہ نور کی بن باپ کے لگتی۔ بچپن کا یہ حسین دور اس کا کس قدر بے رنگ گزر رہا تھا۔

آصفہ خوش رہنا بھول چکی تھی۔ اس کی دونوں نندیں بیاہی جا چکی تھیں اور کام کا بوجھ زیادہ ہو گیا تھا اور اب وہ خود روز پیدل چل کر ماہ نور کو سکول سے لے کر بھی آتی اور چھوڑنے بھی جاتی۔

ماہ نور کو اتنا معلوم تھا کہ اس کے پاپا امریکہ میں رہتے ہیں اور اس کے لیے بہت خوبصورت کھلونے بھیجتے ہیں۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ آئیں گے اس کے پاس کب۔ وہ پاپا کو یاد کر کے اکثر ماما سے کہتی ماما میری تمام فرینڈز ہر سنڈے کو اپنے پاپا کے ساتھ پارک اور چڑیا گھر دیکھنے جاتے ہیں مگر میرے پاپا کب آئیں گے؟

اس بات کا جواب تو آصفہ کے پاس خود بھی نہیں تھا کہ وہ کب آئیں گے رفیع کے آج تک اس کے نام کا کوئی ڈرافٹ نہیں بھیجا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ کسی سکول میں جاب کر لے مگر جب اس نے یہ بات کہی تو اس کی ساس اس کے ساتھ لڑ پڑیں۔

ہمارے گھر کو بدنام کرو گی؟ کہ بہو پر اتنا ظلم کرتے ہیں کہ وہ نوکری کرنے پر مجبور ہو گئی۔ آج آصفہ نے رو دھو کر دل کی بھڑاس نکالی اور آج اس کی زبان سچ اگل رہی تھی اور سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ رفیع کی ماں نے بہو کی شکایت فوراً رفیع کو کر دی اور آصفہ اس بات سے بالکل بے خبر تھی۔

ماہ نور گیارہ برس کی ہو گئی آصفہ کا چہرہ کملا گیا تھا۔ نہ جانے اسے کس بات کی سزا مل رہی تھی وہ نہیں جانتی تھی کس قدر الجھ کر رہ گئی تھی اس کی زندگی۔ رفیع تم نے مجھے کس بات کی سزا دی اکثر یہ فریاد اس کے لبوں پر آجاتی اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگ جاتے۔ اب ہر طرف یہ سوال ہونے لگے کہ رفیع کب آئے گا؟ اور کیا اس نے وہاں شادی تو نہیں کر لی؟

طرح طرح کے سوالات اور دل میں عجیب سی الجھن ہونے لگ جاتی۔

اب تو اماں بھی اسے فون پر کہنے لگی کہ رفیع میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں جلدی سے میرے پاس آجاؤ۔ شاید ماں کی پکار اس کو کھینچ لائے۔ آصفہ اب یہ سوچنے لگی اور شاید دعائیں قبول ہو گئیں نہ جانے کس کی۔ ماں کی یا آصفہ کی۔ ایک دن خبر ملی کہ رفیع پیر کے روز آرہا ہے۔

آج آصفہ بھی خوش تھی اور ماہ نور بھی۔ ماما پاپا کیسے ہوں گے۔ بوڑھے ہوں گے یا جوان آج آصفہ بہت دنوں یا مدتوں بعد ہنسی سارا خاندان خوش تھا۔ آصفہ کی دیورانی نے آصفہ کو خوب تیار کیا۔ اس دن وہ آصفہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں۔ لمحہ بہ لمحہ اور اسے نئی نویلی دلہن کی طرح شرم آنے لگی۔

آج سب ایئرپورٹ پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ سارا خاندان خوشی کا بھرپور احساس لے کر ایئرپورٹ پہنچ گیا۔

جہاز اپنے وقت پر آ گیا۔ پھر رفتہ رفتہ مسافر باہر آنے لگے۔ سب کی نظریں اس دروازے پر لگی ہوئی تھیں جہاں سے رفیع نے آنا تھا۔ باہر کتنی دیر ہو گئی مگر

رفیع نہیں آیا۔ پھر وہاں سے ایک شخص نمودار ہوا رفیع سے شکل ملتی جلتی وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا وہ آخری مسافر...... ہاں وہ رفیع ہی تھا۔

آصفہ ساکت ہوگئی۔ سفید بالوں والا، کمزور سا لاغر انسان وہ رفیع ہی تھا۔ چھوٹے بھائی نے آگے بڑھ کر وہیل چیئر کو تھام لیا۔ بھائی جان یہ سب کیا ہوا؟ اور کیسے ہوا؟ سب حیران تھے کسی نے پھولوں کے ہار بھی گلے میں بھی نہ ڈالے۔ بس اماں نے آگے بڑھ کر بیٹے کو گلے لگایا۔ میرے بیٹے یہ سب کیسے ہوا؟

بس اماں بڑا زبردست ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ رفیع نے کہا۔ آصفہ کے تمام سہانے سپنے ایک دفعہ پھر ٹوٹ گئے۔ باپ کا یہ روپ دیکھ کر ماہ نور کی آنکھوں سے چمک بجھ گئی اور وہ سب سے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ جیسے وہ باپ کا سامنا نہ کرنا چاہتی ہو۔

آصفہ کے ارمانوں پر جیسے اوس پڑ گئی تھی۔ آج وہ اس کا سواگت کرنے سرخ جوڑا پہن کر ہاتھوں میں مہندی لگا کر بالوں میں پھولوں کے گجرے سجا کر آئی تھی۔ کتنے عرصے بعد وہ آج یوں بنی سنوری تھی اور اس پر خوب روپ چڑھا تھا۔

کتنے لوگ اسے دلاسا دے رہے تھے۔ مگر آصفہ کے لب خاموش تھے۔ شاید جب ہی تم واپس لوٹ آئے ہو۔ ایک معذور بن کر ایک بوجھ بن کر میری راہ میں ہر طرف پر خار جھاڑیاں ہیں اور ان پر چلتے چلتے میرے پیر لہولہان ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ اسے ساری عمر ان پر خار راستوں پر چلنا ہے۔ کسی معذور کا سہارا بن کر یہ وفا کا تقاضا تھا۔

اس نے خود کو کسی کی خدمت کے لیے جیسے فوراً آمادہ کر لیا۔ پل صراط کا سفر ابھی طے نہ ہوا تھا۔ جس خوشی کے جذبات لے کر وہ گھر سے روانہ ہوئے تھے ویسے ہی دکھی دل سے وہ گھر آ گئے۔

گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ رفیع کتنے عرصے بعد جو آیا تھا۔ اس وجہ سے سب ملنے آئے تھے۔ آصفہ کو بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ گھر آ کر وہ مہمانوں کی خاطر مدارت میں لگ گئی۔ رات رفیع تھک ہار کر کمرے میں آیا تو آصفہ کا بجھا ہوا چہرہ دیکھ کر نادم ہو گیا۔ میں نے تم کو بہت دکھ دیے ہیں آصفہ خاموش رہی۔

سچ تو تھا اس نے صرف اسے دکھ ہی دکھ تو دیے تھے۔ تنہائی کا دکھ، پیسے کی تنگی کا دکھ، بے وفائی کا دکھ اور اب معذوری کا دکھ وہ کتنے دکھوں کا حساب بتاتی۔ صرف ایک خاموشی سو سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔

بس اب میں لوٹ آیا ہوں سارے دکھ بھلا دوں گا وہ بولا۔

تم وفا کی دیوی ہو تم نے ایک بے نام سے رشتے کو نبھایا ہے۔ تم کو اب میں رانی بنا کر رکھوں گا۔ وہ بولا۔

رانی ایک طنزیہ مسکراہٹ آصفہ کے چہرے پر آ گئی۔ ایک معذور شوہر کی بیوی رانی نہیں نوکرانی بن جاتی ہے۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں واپس وہ پھر بولا۔ وہاں ایک خوبصورت گھر جو بے حد بڑا ہے اور جہاں ضروت کی ہر چیز موجود ہے۔ تمہاری منتظر ہے۔

کیا؟ آصفہ کو یقین نہ آیا۔

مگر آپ کے پیر وہ ہنس پڑا۔ میں چل سکتا ہوں مگر وقت لگے گا۔ میں معذور نہیں ہوا۔

اللہ آصفہ کے کانوں میں جیسے شہنائی گونج گئی۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ آصفہ میں نے تم کو تنہائی دی لیکن صرف اس خوشی کی خاطر جو میں تم کو دینا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے بڑا وقت لگا۔ محنت دن رات محنت پھر وہ گھر بن گیا۔ جس کی تمہیں ضرورت تھی وہ گھر اب تمہارا منتظر ہے۔

رفیع کی باتوں نے آصفہ کے سہارے دکھ پل بھر میں دور کر دیے۔ وہ خوش تھی بہت خوش پل صراط کا سفر ختم ہو چکا تھا۔ آگے ایک نئی منزل تھی۔ ایک نئی روشنی تھی۔

☆☆☆

افسانہ

اپنا گھر

فدا حسین

پر سکون زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ رشتوں کے تقدس کو سمجھا جائے۔ کیونکہ خوشیوں کا انحصار صرف باہمی محبت پر ہے جس کے بغیر گھر ویران ہو جاتے ہیں۔

ایک بیٹی کا فسانہ جو اپنے باپ کو حق دلانا چاہتی تھی۔

مجھ کو مجھ سے جدا کیا تو نے
میرا بن کے یہ کیا کیا تو نے

تانیہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی۔ ماں کے رونے کی آواز کانوں میں پڑی وہ تیزی سے اپنے اور ماما کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھی۔ مگر دروازے پر ہی قدم رک گئے۔ اندر سے بڑی ممانی کی آواز آ رہی تھی۔ جو یقیناً آج پھر پاپا کو دنیا کا ظالم ترین مرد اور ماما کو دنیا کی مظلوم ترین عورت ثابت کرنے پہ تلی بیٹھی ہوں گی۔

تانیہ افسوس کے ساتھ سر ہلا کر کچن میں چلی گئی۔ فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور گلاس بھر کر پانی پیا،

کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی پھر شولڈر بیگ ایک طرف رکھا اور کھانا گرم کرنے لگی۔ کھانے کے بعد خاموشی سے بیگ اٹھایا اور اوپر والے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

اسے اپنی بڑی ممانی بالکل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ بلکہ پورے ننھیال میں سے اسے کوئی بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے ننھیال کی بہت لاڈلی تھی۔ جتنے چاؤ لاڈ اس کے ہوئے جتنا پیار اسے ملا شاید ہی کسی کو ملا ہو۔

وہ اپنے ننھیال کی اکلوتی نواسی تھی۔ تینوں ماموں اسے بے حد پیار کرتے تھے جن کی دیکھا دیکھی ممانیاں بھی بہت محبت جتلاتی تھیں۔ نانا، نانی تو اس پر جان چھڑکتے تھے اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ وہ بھی سب سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی اور نانی کے بغیر تو سانس بھی پتہ نہیں کیسے لیتی تھی۔

مگر یہ تب کی بات تھی جب وہ ناسمجھ تھی اب اسے بہت سی چیزوں کی سمجھ آ گئی تھی۔ اب غلط کو غلط کہنے میں اسے کوئی عار نہ تھی۔

ننھیال والوں کا اس کے پاپا کے ساتھ ہتک آمیز رویہ، اور ماما کا بات بے بات پاپا کے ساتھ جھگڑا کرنا، محدود آمدنی کے باوجود نت نئی فرمائش کرنا، پوری نہ ہونے پر رو رو کے طعنے دینا، اسے سب اچھی طرح یاد تھا۔ وہ خود بھی پاپا سے دور دور ہی رہتی تھی۔ جس مکان میں وہ لوگ رہتے تھے وہ تانیہ کے نانا نے خرید کر اپنی بیٹی یعنی تانیہ کی ماں ریحانہ بیگم کے نام لگوا دیا تھا۔ اسی بات کا ماما کو غرور تھا۔ کئی بار یہ بات پاپا کو جتلا چکی تھیں۔ کئی بار پاپا کے منہ پہ پاپا کو آوارہ نشئی اور نہ جانے کیا کچھ کہہ چکی تھی۔

حالانکہ پاپا ایک انتہائی ذمہ دار اور محنتی شخص تھے۔ ہر کسی کے ساتھ بڑے اخلاق اور محبت کے ساتھ پیش آتے۔ اگر کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف بھی ہوتی تو درگزر سے کام لیتے نہ خود کسی کی چغلی کرتے نہ کسی کو کرنے دیتے مگر کسی کو پاپا کی یہ خوبیاں دکھائی نہ دیتی تھیں۔

نانی یا ممانی کو جب بھی موقع ملتا ماما کے کان بھرنا شروع کر دیتیں اور ماما جو پیدائشی کانوں کی کچی تھیں ان کی باتوں میں آ جاتیں۔ پھر پاپا کی خوب برائیاں کی جاتیں۔ جب پاپا کام سے تھکے ہارے گھر آتے تو جھگڑا شروع ہو جاتا۔ پاپا غصے میں کھانا چھوڑ دیتے۔ پھر کئی کئی دن گھر سے کھانا نہ کھاتے اپنے کپڑے خود ہی دھوتے خود ہی استری کرتے۔

ماما کی موجیں لگ جاتیں سارا دن یا تو سوئی رہتی یا ٹی وی دیکھتی رہتی۔ جب بھوک لگتی تو تھوڑے فاصلے پر موجود اپنی ماں کے گھر پہنچ جاتی تانیہ کی اسے کوئی فکر نہ تھی۔ اس کا ذمہ نانی نے اٹھا رکھا تھا۔ لہٰذا گھر میں کئی کئی دن کھانا نہ بنتا۔ صفائی ستھرائی تو ویسے بھی شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ صفائی ستھرائی کے ساتھ ساتھ ماما کو برتن دھونے سے بھی چڑ تھی۔ اگر پاپا کبھی غلطی سے اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کرتے تو ماما غصے سے آگ بگولہ ہو کر چیخنے لگ جاتی اور سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر کہتیں۔

"آج نہیں دھلے تو قیامت آ گئی ہے کیا، پہلے تیرے پچھلے آ کر دھوتے ہیں کیا؟"

پاپا کبھی جھگڑا کرنے لگ جاتے اور کبھی خاموشی سے باہر نکل جاتے۔ پھر کئی کئی دن تک بول چال بند رہتی۔ پاپا جب بھی گھر میں ہوتے کسی سوچ میں ڈوبے رہتے، پریشانی ان کے چہرے سے عیاں ہوتی۔ ایسے میں تانیہ کا ننھا سا دل چاہتا کہ اپنے باپ کے ساتھ باتیں کرے۔ ان کے ساتھ کھیلے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

حالانکہ پاپا کہتے تھے تانیہ میری جان ہے۔ مگر وہ جس دن تانیہ کے ساتھ تھوڑا کھیلتے، پیار جتلاتے، ماما کسی نہ کسی بہانے سے تانیہ کی پھینٹی لگا دیتی۔ پاپا کوئی

دودھ پیتے بچے نہ تھے۔ سب سمجھتے تھے۔ کبھی کبھار جھولی اٹھا کر آسمان کی طرف منہ کر کے زیر لب کچھ بڑبڑاتے، پھر خاموشی سے باہر نکل جاتے۔

تانیہ کو اوپر آئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ یہ سوچ کر وہ نیچے اتر آئی کہ بڑی ممانی جا چکی ہوں گی مگر کمرے سے ابھی تک بڑی ممانی کی آواز آ رہی تھی۔ سو دل کڑا کر کے کمرے میں چلی گئی اور سلام کر کے ایک طرف صوفے پہ بیٹھ گئی۔

بڑی ممانی نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تانیہ! اتنی دیر سے آئی ہو......؟"

تانیہ سے پہلے ہی ماما بول پڑی۔ "گئی ہوگی اپنے اس آوارہ، نشئی باپ کے پاس۔"

تانیہ نے ترچھی نظروں سے ماما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلی بات یہ کہ مجھے گھر میں آئے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے دوسری بات یہ کہ میرا باپ آوارہ نشئی نہیں ہے، جب سے ہوش سنبھالا ہے میں نے ایک دفعہ بھی پاپا کو نشے کی حالت میں نہیں دیکھا، ہاں سڑکوں پہ آوارہ پھرتے ہوئے کئی مرتبہ دیکھا ہے وہ بھی اس لیے کہ میرے پاپا کا کوئی دوست نہیں تھا اور گھر میں بیوی ٹکنے نہیں دیتی تھی۔"

ریحانہ نے کڑے تیوروں کے ساتھ بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہت زبان چلنے لگی ہے تیری، پوچھ لینا اپنے باپ سے میرے ساتھ شادی سے پہلے چرس پیتا تھا یا نہیں۔"

تانیہ کچھ دیر ماں کی طرف دیکھتی رہی پھر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"آپ کے ساتھ شادی سے پہلے میرے پاپا چرس پیتے ہوں گے، مگر آپ یہ حقیقت کیونکر جھٹلا سکتی ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ محبت کرتے تھے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ مگر جب آپ کی منگنی کہیں اور ہو گئی تو وہ دلبرداشتہ ہو کر نشہ کرنے لگے۔ مگر جب نانی کے چہیتوں نے آپ کو ٹھکرا دیا، تو پھر وہ آوارہ نشئی آپ لوگوں کو بہت اچھا لگنے لگا، پھر کیوں آپ نے ان سے شادی کی......؟"

بڑی ممانی نے نند کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگوں کا خیال تھا کہ وہ شادی کے بعد سدھر جائے گا۔"

تانیہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اور سدھرنا کس کو کہتے ہیں، شادی کے بعد پاپا نے نہ تو اپنے کسی دوست سے رابطہ رکھا اور نہ ہی کبھی چرس کو منہ لگایا۔"

ریحانہ نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ "ہونہہ، سدھر گیا، سدھر گیا ہوتا تو وہ گل نہ کھلاتا جو آٹھ سال پہلے کھلایا......"

تانیہ نے بغیر لگی لپٹی رکھے بنا کوئی لحاظ کیے بغیر قدرے تلخی سے کہا۔ "سوری ماما! اس گل کھلانے کی بھی آپ ذمہ دار ہیں۔ اگر کبھی آپ نے پاپا کو گھر میں سکون سے رہنے دیا ہوتا تو وہ کبھی بھی دوسری شادی نہ کرتے۔"

ریحانہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ واقعی مجھ سے سچی محبت کرتا ہوتا تو کبھی بھی مجھے چھوڑ کر نہ جاتا، شادی سے پہلے کہتا تھا میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔"

تانیہ نے بڑی گہری نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماما کسی مفکر نے کہا تھا، اپنوں کو اپنے ہونے کا احساس دلاؤ ایسا نہ ہو کہ آپ کے اپنے آپ کے بغیر جینا سیکھ لیں، آپ نے کبھی بھی میرے پاپا کو اپنے ہونے کا احساس نہیں دلایا۔ سو انہوں نے آپ کے بغیر جینا سیکھ لیا، رہی بات چھوڑ کر جانے کی تو اس بات کی تو میں زندہ گواہ ہوں کہ میرے پاپا آپ کو چھوڑ کر نہیں گئے۔ آپ انہیں چھوڑ کر آئی تھیں، مجھے آج بھی اچھی طرح وہ دن یاد ہے جب میرے پاپا خوشی خوشی گھر آئے تھے۔ خوشی ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی

تھی۔ وہ بہانے کے ساتھ ہم دونوں کو اس گھر میں لے گئے جو انہوں نے اپنی محنت سے بنایا تھا۔ جو ان کا اپنا گھر تھا، جو انہوں نے آپ کے لیے بنایا تھا۔ میرے لیے بنایا تھا مگر آپ نے کیا کیا؟"

وہاں رہنے سے صاف انکار کر دیا میرے پاپا نے آپ کی منتیں کی تھیں منتیں، مگر آپ اپنی ضد پہ اڑی رہیں اور مجھے لے کر واپس آ گئیں حالانکہ اگر میرے پاپا چاہتے تو مجھے زبردستی روک سکتے تھے۔ انہیں قانون اور سماج کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ آپ کبھی بھی مجھے نہیں لا سکتی تھیں۔ مگر اس آوارہ اور نشئی کی اعلیٰ ظرفی دیکھیں کہ اس نے ایسا نہیں کیا، پتہ نہیں کتنے دن اکیلے اس گھر میں کس طرح گزارے، اگر آپ کے میکے میں کوئی ایک بھی آپ کا سچا خیر خواہ ہوتا تو آپ کا گھر ٹوٹنے سے بچا لیتا، اس بات کی آپ بھی گواہ ہیں کہ میرے پاپا نے کبھی ضد نہیں کی وہ سب کی مان لیتے ہیں۔ مگر افسوس کبھی کسی نے ان کی نہ مانی۔

بڑی ممانی نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ "بڑی وکالت کرتی ہے باپ کی......"

تانیہ نے ممانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں......؟ وکالت کیوں نہ کروں......؟ میرے پاپا ہیں وہ، ساری دنیا سے زیادہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

ممانی نے منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے تو باپ کے پاس تک نہ جاتی تھی، اب دیکھو کیسے باپ کی محبت جاگ اٹھی ہے۔"

تانیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "سچی محبت کرنے والوں کے ساتھ محبت نہ کرنے والے نادان ہوتے ہیں، اور میں نادان نہیں ہوں۔"

ریحانہ نے چیختے ہوئے کہا۔ "تمہیں شرم نہیں آتی اپنی ماں کو نادان کہتے ہوئے......؟"

تانیہ نے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ "سوری ماما! حقائق نے مجھے شرم پروف بنا دیا ہے۔"

اتنا کہہ کر تانیہ کمرے سے باہر نکل گئی اور نند بھابی ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

تانیہ روز ناشتہ کیے بغیر گھر سے نکلتی تھی۔ پاپا کا گھر کالج کے راستے میں تھا۔ وین والا ہر روز بڑی ذمہ داری کے ساتھ تانیہ کو پاپا کے گھر کے پاس اتار دیتا تھا۔ جہاں پاپا دروازے پر کھڑے انتظار کر رہے ہوتے تھے اور گھر میں چھوٹی ماما چھ سالہ احمر کے ساتھ ناشتے کی میز سجائے بیٹھی ہوتی۔ پھر سب مل کر ناشتہ کرتے اور پاپا تانیہ کو کالج ڈراپ کر دیتے تھے۔

اس دن بھی جب پاپا اسے کالج کے باہر چھوڑ کر چلے گئے اور ابھی اس نے گیٹ کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ بڑے ماموں کے بیٹے وقاص کا فون آ گیا۔ حال احوال کے بعد کہنے لگا۔

"سرکار! ذرا پیچھے مڑ کر تو دیکھیں......؟"

تانیہ نے جونہی پلٹ کر دیکھا تو وقاص صرف دس قدم کے فاصلے پر کھڑا دکھائی دیا۔

تانیہ نے فون بند کیا اور اس کے پاس چلی گئی۔ وقاص اس کی طرف دیکھ کر تھوڑی دیر مسکراتا رہا۔ پھر سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے کہنے لگا۔

"کس کے ساتھ آئی ہو......؟"

تانیہ سمجھ گئی کہ اس نے پاپا کو دیکھ لیا ہے لہٰذا جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اس لیے پُر اعتماد لہجے میں بولی۔ "پاپا کے ساتھ آئی ہوں۔"

وقاص نے گردن ٹیڑھی کرتے ہوئے کہا۔ "تم تو وین میں آتی ہو، پھر یہ پاپا بیچ میں کہاں سے آ گئے۔"

تانیہ نے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے پاپا سے کالج کی فیس لینی تھی اس لیے آج پہلے پاپا کی طرف چلی گئی۔"

وقاص نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اتنے خوبصورت ہونٹوں سے جھوٹ ذرا بھی اچھا نہیں لگتا، میں پچھلے ایک ہفتے سے آپ کی روٹین چیک کر رہا ہوں، آپ روزانہ وین سے اتر کر اپنے پاپا کے ہاں جاتی ہو، وہاں ناشتہ کرتی ہو، پھر آپ کے پاپا آپ کو کالج ڈراپ کرتے ہیں۔"

تانیہ ایک لمحے کے لیے بوکھلا سی گئی۔ پھر ذرا غصے سے بولی۔ "آپ سے کس نے کہا ہے میری روٹین چیک کرنے کے لیے، اور اگر ایسا کرتے بھی ہیں تو مجھے کیا......؟ کرتے رہیں، وہ میرے پاپا ہیں میں ان سے صبح ملوں، شام ملوں، دن میں ملوں یا رات میں ملوں کسی کو کیا تکلیف ہے......؟"

وقاص نے ہاتھ سے نفی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں...... مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے، وہاں مگر پھپھو کو تکلیف ضرور ہو گی۔ جب میں انہیں بتاؤں گا کہ ان کی بیٹی اپنے پاپا سے روز ملتی ہے۔"

اس کی دھمکی کام کر گئی تانیہ نے گھبرا کر کہا۔ "نہیں وقاص بھائی! پلیز ماما کو کچھ مت بتانا ورنہ وہ بہت خفا ہوں گی۔"

وقاص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو چلو پھر ٹھیک ہے، ناشتہ پاپا کے ساتھ کر لیا اب لنچ میرے ساتھ کر لو، میں دوپہر میں تمہیں پک کر لوں گا۔"

تانیہ نے وقاص کے بارے میں چند اڑتی اڑتی سی باتیں سن رکھی تھیں۔ اس لیے اسے یہ آفر بہت بری لگی۔ وقاص کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"وقاص بھائی! یہ آفر کسی اور کے لیے سنبھال رکھیں، مجھے ہوٹلنگ کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر تانیہ نے گیٹ کی طرف جانا چاہا تو وقاص نے آگے بڑھ کر راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"تانیہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

تانیہ کو اس کی حرکت پہ غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لیتے ہوئے بولی۔

"جی کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ......؟"

وقاص نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تانیہ! بات دراصل یہ ہے کہ...... میں...... تم سے محبت کرتا ہوں...... تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

تانیہ کا بے اختیار جی چاہا کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پہ لگا دے۔ مگر وہ کوئی تماشا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے بڑے سکون سے بولی:

"اس طرح سر راہ کھڑے ہو کر آپ کو محبت کا اظہار کرنا اچھا لگتا ہے کیا......؟"

وقاص سمجھا بات بن گئی جلدی سے بولا۔ "اس لیے تو کہتا ہوں کہ لنچ اکٹھے کرتے ہیں، پھر وہاں بیٹھ کر سکون سے باتیں کریں گے۔"

تانیہ نے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "بیٹھیں گے بھی اور باتیں بھی کریں گے۔ مگر فی الحال مجھے کالج سے دیر ہو رہی ہے۔"

اتنا کہہ کر تانیہ تیزی سے کالج کے اندر چلی گئی۔

گیارہ بجے کے قریب وقاص کا میسج آ گیا۔ "کیا کر رہی ہو......؟"

تانیہ نے لکھ بھیجا۔ "کالج گراؤنڈ میں خوشی سے پاگل ہو کر ناچ رہی ہوں کہ آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔"

چھٹی سے آدھا گھنٹہ پہلے وقاص کا پھر میسج آ گیا۔ "میں آپ کو پک کرنے کے لیے کتنے بجے آؤں؟"

تانیہ کا دماغ کھولنے لگا۔ "مجھے پک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وقاص کا میسج پھر آ گیا۔ "جان! کیا کر رہی ہو، آپ نے صبح وعدہ کیا تھا میں آ رہا ہوں تیار رہنا۔"

تانیہ کو تو صبح ہی سے وقاص پر غصہ آ رہا تھا۔ اس میسج نے تو تن بدن میں آگ لگا دی۔

اس نے وقاص کی طبیعت صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا لہٰذا جواب میں لکھا۔

"تمہاری ماں کو کوسنے دے رہی ہوں جس نے تجھ جیسی نانجار اولاد کو جنم دیا۔"

اس کے بعد وقاص کا میسج تو نہیں آیا ہاں شام کے وقت نانی کے گھر سے ماں بیٹی دونوں کا بلاوا آ گیا۔ گھر کے سبھی افراد ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ جیسے ہی تانیہ اور اس کی ماں بیٹھیں نانی نے غصے سے لال پیلی ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا اسی لیے تمہیں پال پوس کر اتنی بڑی کیا تھا کہ جوان ہو جاؤ تو ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنا شروع کر دو۔"

تانیہ نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔ "کوئی دھول نہیں جھونکی میں نے، میں تو کالج کی فیس لینے پاپا کے گھر گئی تھی۔"

چھوٹے ماموں نے بڑے غصے سے کہا۔ "ہم مر گئے تھے کیا جو تم فیس لینے باپ کے گھر چلی گئی، پہلے تمہاری فیسیں تمہارا باپ دیتا رہا ہے کیا......؟"

تانیہ کو ماموں کی یہ بات بہت بری لگی وہ غصے سے بھڑک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور قدرے اونچی آواز میں بولی۔

"میں اپنے باپ کے گھر چلی گئی تو سارے خاندان کے منہ سوجے پڑے ہیں، وقاص بھائی کی لنچ آفر قبول کر لیتی تو کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ میرے باپ نے مجھے کالج ڈراپ کر دیا تو آنکھوں میں دھول پڑ گئی۔ وقاص بھائی کے ساتھ سڑکوں پہ آوارہ گردی کرتی تو آنکھوں میں ٹھنڈ پڑ جاتی۔"

اتنا کہہ کر تانیہ لمحہ بھر بھی نہ رکی اور نہ ہی پلٹ کر دیکھا کہ کیسے سب کے منہ کھلے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

رات کے وقت وقاص کا میسج آ گیا۔ "جو تم نے کیا اچھا نہیں کیا۔"

تانیہ نے جواباً لکھ بھیجا۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

تھوڑی دیر بعد پھر میسج گیا۔ "جو تمہارے ساتھ ہوگا اس کے تصور ہی سے تمہاری روح کانپ جایا کرے گی۔"

تانیہ نے جواباً لکھا۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

وقاص نے بہت بڑا دعویٰ کرتے ہوئے لکھا۔

"اب تو شاید خدا کو بھی تمہارا ذلیل و رسوا ہونا منظور ہو چکا ہے۔"

تانیہ نے بڑے تحمل کے ساتھ جواب دیا۔ "یہ تو وقت بتائے گا کون، کس کو، کس طرح ذلیل کرتا ہے۔"

فوراً ہی وقاص کا میسج آیا۔ "وقت میری جاگیر ہے۔ چاہوں تو ابھی تمہیں جان سے مار دوں مگر مارنے سے بھی بدتر سزا دوں گا تجھے۔"

تانیہ نے کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتے ہوئے اپنے دماغ میں اگلے دن کی پلاننگ کرنے لگی۔

اگلی صبح ذرا جلدی اٹھ کر نانی کے گھر پہنچ گئی چپ چاپ چائے بنائی اور بیٹھ کر پینے لگی۔ پھر جیسے ہی اوپر والے پورشن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنا شروع ہوئیں فوراً اٹھ کر اوپر چلی گئی۔ بڑے ماموں اور ممانی کو سلام کر کے بلاوجہ ادھر ادھر پھرنے لگی۔ جیسے ہی موقع ملا وقاص کے کمرے میں گھس گئی۔ وقاص ابھی تک سویا پڑا تھا اور اس کا آئی فون سائیڈ ٹیبل پہ پڑا تھا۔ تانیہ نے پھرتی سے آئی فون میں سے اپنے میسج ڈیلیٹ کیے اور ایک طرف کرسی پہ بیٹھ گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد بڑے ماموں کمرے میں آ کر پوچھنے لگے۔ "تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

تانیہ کچھ دیر لفظوں کو ترتیب دیتی رہی پھر بولی۔

"وقاص بھائی نے کل دن میں پھر رات کے وقت

مجھے کچھ میسج کیے تھے جن کی وجہ سے میں رات بھر سو نہ سکی، لیں آپ بھی پڑھ لیں۔"

باتوں کی آواز سن کر وقاص جاگ چکا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے باپ کو میسج پڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

تانیہ کچھ دیر بڑے ماموں کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھتی رہی پھر نظریں وقاص کے چہرے پہ جماتے ہوئے کہنے لگی۔

"لیں وقاص بھائی! میں خود ہی آپ کے پاس آ گئی ہوں آپ میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہیں کر لیں، کم از کم ذہنی اذیت سے تو چھٹکارا مل جائے گا......"

وقاص صرف ممیا کر رہ گیا جبکہ بڑے ماموں نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

"وقاص یہ کیا بے غیرتی ہے؟"

وقاص پھرتی سے بیڈ کی دوسری طرف اتر گیا۔ ماموں اونچی آواز میں اسے گالیاں دیتے ہوئے بیڈ کے ساتھ گھوم کر اس طرف لپکے تو وہ بیڈ کے اوپر سے پھلانگ لگا کر بھاگا اور کمرے میں داخل ہوتی ہوئی اپنی ماں کے ساتھ ٹکرا گیا۔ جو اس ناگہانی نگہانی آفت کے لیے تیار نہ تھیں۔ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکیں اور وہیں ڈھیر ہو گئیں۔ مگر وقاص ایک لمحہ ضائع کیے بغیر باہر بھاگ گیا۔ ماموں بھی صلواتیں سناتے اس کے پیچھے لپکے تانیہ نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ممانی کے بھاری بھرکم وجود کو اٹھانے کی کوشش کی ممانی نے دھیمی آواز میں لفظ چبا چبا کر کہا۔

"یہ تم نے کیا صبح صبح آ کر تماشا کھڑا کر دیا ہے......؟"

تانیہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

اے شیش محل کے رہنے والے ہم پہ پتھر مت برسا
جب یہ پتھر واپس ہوں گے تو شیش محل کا کیا ہوگا

ممانی نے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ذرا اپنے گھر کو سنبھال لوں، پھر تم سے نپٹتی ہوں۔"

مگر تانیہ ان سنی کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئی۔

شام تک گھر میں کافی توڑ پھوڑ ہو چکی تھی۔ گھر کے تمام افراد فرداً فرداً وقاص کی اچھی خاصی کلاس لے چکے تھے۔ ممانی کی گال پہ پڑا نشان اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ معاملہ کافی سنگین صورت اختیار کر چکا ہے، وقاص چپ چاپ آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر اور ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

تانیہ گھر کی حالت دیکھ کر بہت افسردہ تھی اور اب وقاص کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی منہ سے کچھ نہ بولا گیا تو سر سے اشارہ کر کے واپس اپنے گھر چلی گئی۔

گھر جا کر اس نے وقاص کو میسج کیا۔ "ایسا میں ہرگز نہیں چاہتی تھی، مگر کیا کرتی آپ نے مجھے پریشان بھی تو بہت کیا تھا۔ میں سچ میں ڈر گئی تھی اس لیے ماموں سے شکایت کر دی۔ بہر کیف میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔"

وقاص نے میسج پڑھ کر ماں کو سنایا تو بجائے بیٹے کو سمجھانے کے الٹا بولیں۔

"بس تو خاموشی کے ساتھ وقت گزار، ایک دفعہ تیری اس کے ساتھ شادی ہو جائے پھر دیکھنا سب سے

بھلائی کا زمانہ

ایک بس میں ایک ینگ ٹیچر کھڑی تھی۔ کاکے شرارتی نے کہا۔

"مس! آپ میری جگہ پر آ جائیں۔"

ٹیچر نے کاکے کو زور سے ایک تھپڑ مار دیا۔

کاکے شرارتی نے کہا۔

"بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔" اور کاکا روتے ہوئے دوبارہ اپنے ابو کی گود میں بیٹھ گیا۔

(محمد اسحاق، آزاد کشمیر)

پہلے اس کی گز بھر لمبی زبان کاٹوں گی، چٹیا کو ریلنگ کے ساتھ باندھ کے ٹھنڈے ماروں گی۔"

ادھر ماں بیٹا یہ پلاننگ کر رہے تھے تو دوسری طرف تانیہ کی سوتیلی ماں تانیہ کی فکر میں گھلی جا رہی تھی۔ تانیہ کو اپنے بھتیجے فہد کی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تانیہ جب بھی فہد کا موازنہ وقاص کے ساتھ کرتی فہد کا پلڑا بھاری ہوتا، پڑھا لکھا خوش شکل، خوش اخلاق، اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز، سلجھا ہوا، انداز گفتگو، جب بھی ملاقات ہوتی، اپنی جاب اور تانیہ کی پڑھائی سے ہٹ کے کوئی بات نہ کرتا۔

دوسری طرف وقاص، توبہ توبہ جس کے بارے میں سوچنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ مگر تانیہ کے ذہن میں کچھ اور ہی پک رہا تھا۔ اسی لیے اکثر نانی کے گھر پائی جاتی۔ ننھیال والوں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ لڑکی منہ زور ہو گئی ہے اس لیے سختی کی بجائے پیار محبت سے اسے راہ راست پر لایا جائے، اس لیے ہر کوئی اس کی خوشنودی کے لیے تیار رہتا اور وہ وقاص کی خوشنودی حاصل کرنے کے چکر میں لگی رہتی۔

ایک دن وین والے کو منع کر دیا اور ذرا دیر سے تیار ہو کر نانی کے گھر پہنچ گئی اور وقاص سے کہا کہ وین نکل گئی ہے اس لیے وہ اسے کالج چھوڑ آئے۔

وقاص کی تو جیسے لاٹری نکل آئی۔

پھر کچھ دنوں کے بعد تانیہ نے دوپہر کے وقت فون پہ وقاص سے کہا کہ اسے کالج سے پک کر لے۔ وقاص اڑتا ہوا کالج پہنچ گیا۔ تانیہ نے اس کے پیچھے بائیک پہ بیٹھتے ہی آئس کریم کھانے کی فرمائش کر دی۔ وقاص کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

وہ تانیہ کو ایک بہت ہی پرسکون اور رومانٹک ماحول میں لے گیا۔

آئس کریم کھاتے ہوئے وقاص نے اپنا ہاتھ تانیہ کے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"تانیہ! میں آج پھر تم سے وہی بات کرنا چاہتا ہوں جو کالج کے گیٹ پہ کی تھی۔"

تانیہ نے نزاکت کے ساتھ اپنا ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے اک ادا سے کہا۔

"پلیز وقاص! ابھی رہنے دیں، ابھی کچھ دور تک یونہی اجنبیوں کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ باتیں کرنے کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے۔"

تانیہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنا دامن بچاتے ہوئے وقاص کی آتش شوق کو ہوا دے رہی تھی اور وقاص کے پھینکے ہوئے ہر جال کو غیر محسوس طریقے سے کتر ڈالتی تھی۔

ایک دن وقاص نے اسے لنچ کی دعوت دی جو اس نے فوراً ہی قبول کر لی۔

وقاص اسے کالج سے سیدھے ایک بہت اچھے ریسٹورنٹ لے گیا۔

لنچ کے دوران کہنے لگا۔ "تانیہ یاد ہے، میں نے پہلے بھی ایک دفعہ تمہیں لنچ کی دعوت دی تھی مگر تم نے بہت بے دردی کے ساتھ رد کر دی تھی۔"

تانیہ نے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیں ناں! پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے۔"

وقاص نے اشتیاق بھری نظروں سے تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنائیت سے پوچھا۔

"اب کون سی ایسی بات ہے جو تم میرے ساتھ چلی آئیں......؟"

تانیہ نے اسی اپنائیت سے کہا۔ "ابھی وقت نہیں آیا جب وقت آئے گا تو میں پوچھے بغیر بتا دوں گی۔"

وقاص نے تانیہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس وقت کا شدت سے انتظار رہے گا۔"

تانیہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کھانے میں مصروف ہو گئی۔

ایک دن جب وہ چھوٹی ماما کے بلانے پر ان کے گھر گئی تو فہد پہلے سے موجود تھا۔

چھوٹی ماما کے کچن میں جاتے ہی فہد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تانیہ! مجھے پوچھنے کا حق تو نہیں ہے...... مگر پھر بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس دن ہوٹل میں آپ کے ساتھ کون تھا......؟"

تانیہ نے کچھ دیر فہد کے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "میرا ماموں زاد وقاص تھا۔"

فہد نے چونکتے ہوئے کہا۔ "اچھا! وہ تھا وقاص...... مگر آپ تو اس کے ساتھ بڑی نفرت کرتی تھیں اب کیا ہوا......؟"

تانیہ نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ "نفرت تو اب بھی کرتی ہوں۔"

فہد نے کان کے پیچھے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "نفرت بھی کرتی ہو اور اس کے ساتھ ہوٹلنگ بھی کرتی ہو، بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی۔"

تانیہ ٹیبل پر پڑے پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے بولی۔ "اپنے ننھیال کی طرف میرا کچھ حساب نکلتا ہے وہ برابر کرنے کے چکر میں ہوں۔"

فہد نے فکر مندی سے کہا۔ "حساب برابر کرنے کے چکر میں اگر تم خود کسی چکر میں پھنس گئی تو......؟"

تانیہ نے بنا سوچے سمجھے کہہ دیا۔ "تو پھر آپ ہیں ناں......"

فوراً ہی اسے اپنے الفاظ کے غلط چناؤ کا ادراک ہو گیا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ فہد کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ بکھرتے دیکھ کر وہ گڑبڑا سی گئی۔ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"مم...... میرا مطلب...... تھا کہ......"

فہد نے ہاتھ لہراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی اور مسکراتے ہوئے بولا۔

بس تانیہ! اب کوئی وضاحت مت کرنا، تم نے لاشعوری میں وہ بات کہہ دی ہے جو میں بہت دنوں سے کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تمہارے جو جی میں آئے کر گزرو مجھے ہر قدم پر اپنے ساتھ پاؤ گی میں وعدہ کرتا ہوں کہ جی جان سے تمہاری حفاظت کروں گا۔"

تانیہ نے ایک لمحے کے لیے نظریں اٹھا کر فہد کی طرف دیکھا پھر فوراً ہی نظریں جھکا لیں اسے اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خود کو بہت مضبوط تصور کر رہی تھی۔ فہد کا ساتھ پا کر اس کا قد اور اونچا ہو گیا تھا۔ اب تک وہ ڈر ڈر کر قدم اٹھا رہی تھی۔ مگر اب اس نے تیز روی سے چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے کالج سے تین دن کی چھٹی لے لی ہر وقت سوچتی رہتی جو بھی پلان بناتی اس پہ گھنٹوں سوچ و بچار کرنے کے بعد اسے رد کر دیتی۔ اس دوران اس نے کھانا تو نہ ہونے کے برابر کھایا البتہ کڑک چائے کئی دفعہ پی تاکہ نیند نہ آئے اور اس کی سوچ ادھوری نہ رہ جائے۔

ریحانہ بار بار اس سے پوچھتی کہ وہ کیا سوچ رہی ہے، کیوں پریشان ہے طبیعت تو ٹھیک ہے وغیرہ تیسرے دن وہ اپنے ایک پلان کا ہر طرح سے جائزہ لینے کے بعد مطمئن سی ہو کر مسکرانے لگی۔ ریحانہ نے فوراً قریب ہو کر کہا۔ "کیا بات ہے......؟ میری بیٹی بہت خوش نظر آ رہی ہے۔"

تانیہ نے ایک دم اٹھ کر ماں کو گھماتے ہوئے گانا شروع کر دیا۔

مڑے تے ماہیا بن آن گے

تانیہ کی اس حرکت سے ریحانہ بوکھلا سی گئی مگر کئی مرتبہ پوچھنے پر بھی تانیہ نے کوئی بات نہ بتائی۔ اگلے دن تانیہ جب اپنے پاپا کے ہاں گئی۔ تو چپ چپ سی تھی۔ ایک تو تین دن کی فاقہ کشی نے اسے ذرا کمزور کر دیا تھا۔ اوپر سے اس کی خاموشی نے پاپا اور چھوٹی ماما کو

پریشان کر دیا تھا۔

دونوں کے بار بار پوچھنے پر تانیہ نے چھوٹی ماما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چھوٹی ماما اگر میری ماما اس گھر میں آ کر رہنا چاہیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔

''پاپا اور چھوٹی ماما نے ایک دم چونک کر اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پہ شک کر رہے ہوں۔

پاپا نے تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر بیٹا یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ کبھی نہیں آئے گی۔''

تانیہ نے آنسو بھری آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھ کر رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

کچے دھاگے سے بندھے سرکار چلے آئیں گے

پھر چھوٹی ماما کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

چھوٹی ماما! آپ نے کبھی بھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں آپ کی سوتیلی بیٹی ہوں، آپ نے ہمیشہ مجھے سگی ماں کا پیار دیا ہر طرح سے میرا خیال رکھا، اس لیے میرا بھی فرض بنتا ہے کہ میں کوئی ایسی حرکت نہ کروں جس سے آپ کی دل آزاری ہو۔''

چھوٹی ماما نے اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا! میری دل آزاری نہیں ہو گی، یہ مکان آپ کے پاپا نے آپ کی بڑی ماما کے لیے ہی خریدا تھا، وہ اس وقت یہاں نہیں رہیں تو میں آ گئی، اب اگر وہ اس گھر میں رہنا چاہیں تو میں چھوٹی بہنوں کی طرح ان کا استقبال کروں گی اور ہمیشہ ان کا ادب و احترام کرتی رہوں گی، مگر بیٹا یہ ناممکن ہے۔''

تانیہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بس آپ کی رضامندی چاہیے تھی، باقی کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں، ناممکن کو ممکن بنانا میں نے اپنے پاپا سے سیکھا ہے۔''

پاپا نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ''پھر بھی بیٹا کچھ پتہ تو چلے، کیا تمہاری ماں نے تم سے یہ بات کی ہے۔''

تانیہ پاپا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پاپا آپ نے ماما کے ساتھ اک عرصہ گزارا ہے کیا وہ ایسی بات کر سکتی ہیں۔''

انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا۔ ''بیٹا جب تک تمہاری نانی زندہ ہیں تب تک تو ایسا ممکن نہیں اس کے بعد شاید کبھی اسے خیال آ جائے۔''

تانیہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں پاپا! نانی کے بعد بھی ماما اپنے دماغ کو زحمت نہیں دیں گی، کیونکہ نانی کی سیٹ سنبھالنے کے لیے بڑی ممانی موجود ہیں۔''

پاپا نے میز پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ بیٹا جب اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تو پھر تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ اس گھر میں آ کر رہے گی۔''

تانیہ نے چائے کا آخری گھونٹ لیا، کپ ٹیبل پہ رکھا اور بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

''آپ اوپر ایک پورشن بنانے کی تیاری کریں باقی کام مجھ پر چھوڑ دیں۔''

اسی دن تانیہ اپنی ایک دوست کے ساتھ اس کے گھر جا پہنچی جس کا باپ پولیس میں تھا اور اس وقت گھر پر ہی تھا تانیہ نے بڑی مسکین سی شکل بنا کر انکل کو اپنے فیملی بیک گراؤنڈ سے آگاہ کیا اور بڑی لجاجت کے ساتھ انہیں اپنے پلان میں شامل کر لیا۔

ایک دن ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ تانیہ نے ماں کی لاعلمی میں وقاص کو اپنے اوپر والے کمرے میں بلا لیا۔

چائے کا کپ وقاص کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے غمگین سی آواز میں کہا۔

''وقاص! آج کل میں بہت اپ سیٹ ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں......؟''

وقاص نے چائے کا سپ لے کر کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اب کیا ہوا ہے، مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے......؟''

تانیہ نے وقاص کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیں وقاص! آپ جانتے ہیں ناں کہ میرے پاپا شادی سے پہلے چرس پیتے رہے ہیں، اس بات کا طعنہ میں اتنی مرتبہ سن چکی ہوں کہ اب مجھے تکلیف نہیں ہوتی، معذرت کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ یہ طعنہ دینے میں آپ کی مما ہمیشہ پیش پیش رہی ہیں۔''

وقاص چپ چاپ تانیہ کا چہرہ دیکھتا رہا جس پر اس وقت انتہائی کرب کے آثار تھے۔ تانیہ نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔

''وقاص میں آپ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہوں مگر میں آپ کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی، اس لیے آج کی یہ ملاقات ہماری آخری ملاقات ہے۔''

وقاص نے ایک دم چونک کر تانیہ کی طرف دیکھا تانیہ نے آج پہلی مرتبہ محبت کا لفظ ہونٹوں سے نکالا تھا مگر ساتھ ہی ہجر کا راگ بھی چھیڑ دیا تھا۔ وقاص بوکھلا سا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا بولے کیا نہ بولے آخر بڑی مشکل سے کہنے لگا۔

''مگر کیوں؟ کیوں شادی نہیں کر سکتی۔''

تانیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''نشئی باپ کی بیٹی ہونے کا طعنہ دوسروں کے منہ سے سننے کی عادت سی ہو گئی ہے لیکن اگر آپ کے منہ سے سنوں گی تو مر جاؤں گی۔''

وقاص نے ایک دم دونوں ہاتھوں سے تانیہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

تانیہ! تم مجھ سے جیسی مرضی قسم لے لو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی میں کبھی بھی کوئی طعنہ نہیں دوں گا۔''

لوہا خوب گرم ہو چکا تھا چوٹ لگانے کا وقت آن پہنچا تھا مگر تانیہ نے کچھ دیر سوچنے کی ایکٹنگ کی پھر پرعزم لہجے میں بولی۔ ''آپ کوئی وعدہ نہ کریں اور نہ ہی قسم کھائیں بس میری ایک چھوٹی سی شرط پوری کر دیں، میں زندگی بھر آپ کی تابعداری کرتی رہوں گی۔''

وقاص نے فوراً سے پیشتر کہا۔ ''ہاں ہاں بولو کیا شرط ہے؟''

تانیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''سوچ لیں، اگر شرط پوری نہ کر سکے تو ہو سکتا ہے میری محبت نفرت میں بدل جائے۔''

وقاص نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ ''تانیہ! تم اپنی شرط بتاؤ، میں تمہاری خاطر ہر حد سے گزر جاؤں گا۔''

تانیہ نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ آپ سگریٹ پیتے ہیں، لیکن...... آج...... آپ کو میری خاطر میرے سامنے بیٹھ کر...... چرس پینا ہو گی۔''

وقاص کو حیرت کا جھٹکا لگا مگر سنبھل گیا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ جس کام کے کرنے کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھی جا رہی ہے وہ یہ کام چوری چھپے کئی مرتبہ کر چکا ہے۔

اس نے ذہنی کشمکش دکھانے کے لیے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا پھر دوبارہ تانیہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے چرس پینے کی حامی بھر لی۔

تانیہ نے الماری سے چرس اور سگریٹ نکالنے کے بہانے مووی کیمرہ آن کر دیا۔ دونوں چیزیں وقاص کے سامنے ٹیبل پر رکھیں اور خود دروازے کے پاس پڑے سٹول پہ جا بیٹھی۔ وقاص نے چرس کو ہاتھ میں پکڑ کر دیکھا، سونگھا اور پیکٹ میں سے دو سگریٹ نکال لیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بیٹھا چرس بھرے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

ایک سگریٹ ختم کی اور دوسری پیکٹ میں ڈال کر پیکٹ جیب میں ڈال لیا پھر کپ اٹھایا اور ٹھنڈی چائے

ایک ہی گھونٹ میں پی کر اٹھتے ہوئے بولا۔

''لو جان! میں نے تمہاری شرط پوری کر دی ہے، اب اور نہیں پی سکتا، بہت نشہ ہو گیا ہے۔'' اتنا کہہ کر وقاص جھومتا ہوا چل دیا۔

تین چار دن بعد ہی وقاص اور تانیہ کی شادی کی خبر گردش کرنے لگی۔ جسے سننے کے لیے تانیہ تیار بیٹھی تھی، اس نے اپنے پاپا کو اپنے کارنامے کے متعلق بتا دیا تھا۔

اتوار کے دن تانیہ اور اس کی ماں کو نانی کے گھر بلوایا گیا تو تانیہ نے چپکے چپکے اپنی ساری پیکنگ کر لی۔ میسج کے ذریعے وہ اپنے پاپا کو لمحہ بہ لمحہ آگاہ کر رہی تھی۔ عین موقع پر اس کے پاپا نے اسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آنے کے لیے کہا مگر وہ نہ مانی جب ماں کے ساتھ نانی کے گھر جانے لگی تو ماں کے گلے لگ کر رو پڑی اور ماں کا گال چومتے ہوئے بولی۔

''ماما! آپ کو چھوڑ کر جانے کو میرا جی نہیں چاہتا......''

ریحانہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''صبر کر میری بچی! ہر لڑکی پہ ایک نہ ایک دن یہ وقت ضرور آتا ہے۔''

تانیہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''مگر ماما میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ جو کڑا وقت آپ پہ آنے والا ہے آپ اس کا سامنا کیسے کر پاؤ گی، کیسے اکیلے رہیں گی......؟''

ریحانہ نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''میری جان! میری فکر نہ کرو چل تیری نانی انتظار کر رہی ہو گی۔''

تانیہ نے باہر نکلتے ہی گھر کی چابی اپنے قبضے میں کر لی اور جب نانی کے گھر پہنچی تو سیدھی ڈرائنگ روم میں جا کر کمپیوٹر کے پاس بیٹھ گئی۔ ابھی تک ڈرائنگ روم میں کوئی بھی نہیں آیا تھا۔

اس نے ایک سی ڈی ڈیسک نکال کر کمپیوٹر کے سی ڈی روم میں لگا دی اور خود گیم کھیلنے لگی۔ آہستہ آہستہ سب لوگ ڈرائنگ روم میں آ کر جمع ہو گئے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد نانا جان نے تانیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تانیہ! بیٹا ہم لوگوں نے تمہارا رشتہ وقاص کے ساتھ طے کر دیا ہے، امید ہے تمہیں ہمارے فیصلے سے خوشی ہو گی۔''

تانیہ کچھ دیر موبائل فون پہ انگلیاں چلاتی رہی پھر سب لوگوں کے چہرے باری باری دیکھے اور نظریں نانا جان کے چہرے پہ جماتے ہوئے بولی۔

''نانا جان! پہلے مجھے یہ بتائیں، میری ماں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو آپ نے اسے ایک نشئی کے ساتھ بیاہ دیا، میری ماں کی زندگی برباد کر کے رکھ دی، کیوں......؟''

نانا جان نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''بس بیٹا! بہت بڑی بھول ہو گئی ہم سے......''

تانیہ نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''آج پھر وہی غلطی، وہی بھول کرنے جا رہے ہیں آپ......''

سب لوگوں نے چونک کر تانیہ کی طرف دیکھا۔

بڑی ممانی نے چیختے ہوئے کہا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو...... تمہارا باپ نشئی تھا، میرا بیٹا نشئی نہیں ہے، یہ میرا احسان ہے کہ اک نشئی کی بیٹی......''

سب لوگوں کو اپنی طرف غصے سے گھورتے ہوئے دیکھ کر ممانی کی بات حلق میں ہی اٹک گئی۔ تانیہ نے تالی بجا کر سب لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور سی ڈی پلیئر آن کر دیا اور ساتھ ہی مانیٹر کا رخ سب لوگوں کی طرف کر دیا۔

سب لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سکرین کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں وقاص بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھا چرس والے سگریٹ تیار کرتے ہوئے نظر آ رہا تھا۔

اتنی بڑی حقیقت آنکھوں کے سامنے تھی جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

اپنی مووی دیکھ کر وقاص چلا اٹھا۔

تانیہ! بند کرو یہ بکواس......''

چھوٹے ماموں نے وقاص کو چپ رہنے کا حکم دیا، تو وہ چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ کر تانیہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

تانیہ بڑے سکون کے ساتھ بیٹھی سب کے چہروں کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔

جب مووی ختم ہو گئی تو تانیہ بڑے آرام سے چلتی ہوئی بڑی ممانی کے پاس جا کر کہنے لگی۔

''ممانی جان! میرا باپ نشئی ہے تو ہوا کرے، آوارہ ہے تو ہوا کرے، مگر وہ میرا باپ ہے مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے، مجھ پر اپنا کوئی فیصلہ مسلط کرنے کا حق میں نے صرف اپنے باپ کو دیا ہے، آپ لوگوں کو نہیں، آپ اپنا احسان اپنے پاس رکھیں، ویسے بھی آپ کا نشئی بیٹا میرے لائق نہیں ہے۔''

وقاص نے ساری مصلحتیں، ادب لحاظ بالائے طاق رکھے اور ایک دم اچھل کر تانیہ کی گردن پکڑتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''جھوٹی، مکار، دھوکے باز، تو نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے، میں تمہیں جان سے......''

سب لوگ اٹھ کر وقاص کی طرف بڑھے مگر قدم جیسے زمین کے ساتھ جم گئے تھے۔

تانیہ کے باپ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پستول کی نال وقاص کے منہ میں گھسیٹ دی تھی۔ وقاص کی بات حلق میں ہی اٹک گئی تھی جبکہ تانیہ کا باپ کہہ رہا تھا۔

''ابھی تانیہ کا باپ زندہ ہے، آئندہ اگر کسی نے میری بیٹی کے بارے میں ایسی بات سوچی بھی تو کھوپڑی میں بھیجے کی جگہ بارود بھر دوں گا۔''

پھر جب وہ تانیہ کو لے کر جانے لگا تو تانیہ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر سب کو بائے بائے کہا اور باپ کے بازو سے لپٹ کر اس گھر سے نکل گئی، جہاں اس پر محبتوں اور نوازشوں کی بارش ہوتی تھی مگر اس کے باپ کی عزت نہیں ہوتی تھی۔

ریحانہ کافی دیر کے بعد گھر لوٹی اسے امید تھی کہ اب تک تانیہ واپس آ چکی ہو گی مگر گھر آتے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ گھر میں تانیہ تو کیا اس کی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ جوتے، کپڑے، کتابیں سب لے گئی تھی۔ وہ روتے ہوئے الٹے قدموں واپس بھاگی تو جس جس نے سنا پریشان ہو گیا۔ چھوٹے ماموں نے تانیہ کا نمبر ملایا تو تانیہ کے بجائے اس کے باپ کی آواز سنائی دی جس پر دھونس دھمکی منت سماجت کسی بات کا بھی اثر نہ ہوا۔ ریحانہ نے رو رو کر برا حشر کر لیا تھا۔ ساری رات گھر والے اسے تسلی دلاسے اور تانیہ اور اس کے باپ کے نام کی صلواتیں سناتے رہے۔

اگلے دن شام تک ہر کوئی موجودہ صورت حال کا دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا۔ نانی اور ممانی میں لفظوں کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ جو لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی گئی۔

آٹھ دن بعد ریحانہ بیٹھی پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہی تھی جب اس کے خاوند کا فون آیا۔

''ریحانہ! ہمارے گھر کا اوپر والا پورشن تیار ہو چکا ہے جو میں نے خاص تمہارے لیے بنوایا ہے۔ اگر تم وہاں آ کر رہو گی تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔ مگر میں تمہیں لینے نہیں آؤں گا اور ہاں آج شام کو تانیہ اور فہد کی منگنی ہو رہی ہے آنا چاہو تو آ جاؤ۔''

اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ شام کے وقت ریحانہ اس گھر کے دروازے پہ کھڑی تھی۔ جو حقیقی معنوں میں اس کا اپنا گھر تھا۔ جس کے در و دیوار پہ رنگ و نور کی بارش ہو رہی تھی۔ جہاں اس کا والہانہ استقبال کیا جا رہا تھا۔ آج کی شام یادگار شام تھی سب ہنس رہے تھے اور ساتھ آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔

☆☆☆

مرے چارہ گر

بی سحر ملک

مایوسی کفر ہے کیونکہ وقت کبھی ایک
سا نہیں رہتا گزرتے وقت کے ساتھ حالات
بدلتے ہیں تو سوچ کے زاویے بھی بدلنے لگتے ہیں
اور انسان کو اپنے ماضی کی غلطیاں بچگانہ سی محسوس ہونے لگتی ہیں۔

ایک نوجوان کا فسانہ جو زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما تھا

کیا تراشے کوئی چہروں سے حقیقت کے نقوش
لوگ افسانوی کردار نظر آتے ہیں!!

ایک تھکا دینے والے دن کے بعد رات کی سیاہی شہر کی روشن تصویر میں گھلتی جا رہی تھی۔

قد آدم گلاس ونڈو سے اس نے گہرے آسمان پر بادلوں کا رقص دیکھا اور ایک نظر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی۔ لیپ ٹاپ بند کر کے بیگ میں ڈالا اور ریوالونگ چیئر کی پشت پر پھیلے کوٹ کو اٹھا کر وہ دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

تب ہی اس کی نظر چھوٹی گلاس ٹیبل پر پڑے انگلش میگزین کی ٹائٹل گرل پر پڑی۔ وہ بے اختیار ہو کر صوفے پر جا بیٹھا۔

بڑی ہمت کر کے اس نے وہ میگزین اٹھایا۔ سرخ مخملی آف سلیوز گاؤن، جس کی وی عریانیت کی حد تک گہری تھی۔ اس کا نسوانی حسن ابھرا ابھر کر اس وی سے نمایاں ہو رہا تھا۔ کندھوں سے ذرا نیچے آتے ڈارک براؤن کرلی ہیئر اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ زندگی سے بھرپور چمکتی سبز آنکھیں...... جو یقیناً سبز نہیں تھیں بلکہ لینز کا کمال تھیں۔ لیکن ان آنکھوں کی چمک صدفی صد حقیقت تھی۔

ان آنکھوں میں ایک شرارت سی تھی اور خون رنگ بھرے بھرے ہونٹ...... ہونٹوں پر ناچتی ہوئی مسکراہٹ...... ایسے لگ رہا تھا جیسے ابھی بول اٹھیں گے۔

لمبی مخروطی انگلیاں اس نے ایک ادا سے بالوں میں پھنسائی ہوئیں تھیں۔ بے خود ہو کر وہ اس کا نقش نظروں میں بھر بھر کر دل میں انڈیل رہا تھا۔ اس کی تصویر کے نیچے نمایاں ہوتا اس کا نام پڑھ کر اس کے ہونٹوں پر شکست خوردہ سی مسکراہٹ جاگ اٹھی۔

"میں جانتا تھا زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تمہارا میرا آمنا سامنا ہو گا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ تم اس طرح میرے سامنے آؤ گی غزل کریم...... یا ثانیہ...... جو بھی ہو تم۔" اس کے اندر کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ اسی کشمکش میں اس نے میگزین ہاتھوں میں فولڈ کیا اور گہری سانس لے کر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

حسب معمول اس کی آنکھ اماں اور ابا کے جھگڑے کی آواز سن کر کھلی تھی۔ برتنوں کی چنگھاڑتی ہوئی آوازوں سے بچنے کے لیے اس نے تکیہ سر پر رکھ لیا لیکن آوازیں بدستور جاری تھیں۔

"مجھے بیاہ کر لائے تھے خرید کر نہیں، تمہارے باپ کی یا تمہاری زر خرید لونڈی نہیں ہوں۔" اماں نے یقیناً برتنوں کی ٹوکری کو بیٹھے بیٹھے ٹانگ رسید کی تھی کیونکہ اماں کی آواز کے ساتھ ہی پیالیاں ٹوٹنے اور اسٹیل کے برتن فرش پر لڑھکنے کی آواز آئی تھی۔

"زبیدہ زبان بند رکھ اپنی ورنہ ابھی تین لفظ اور کاغذ کے ٹکڑے سمیت چلتا کروں گا۔" لے دے کر ابا کے پاس یہی دھمکی رہ جاتی تھی اور اب تو عرصہ ہوا اماں نے اس دھمکی کا اثر لینا چھوڑ دیا تھا۔ جھگڑا شروع ہوتا تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ قصور کس کا ہے۔

اماں کی بد دعائیں اور کوسنے دیتی آواز سے بچنے کے لیے اس نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں تھیں۔ ابا شاید کہیں باہر نکل گئے تھے اس لیے تو ان کا رخ اب اس کی طرف ہو گیا تھا۔

"ناکارہ باپ کا نکما بیٹا، دونوں باپ بیٹے مل کر جونک کی طرح چمٹ گئے ہیں میری زندگی سے...... رشنا...... اے رشنا۔"

اماں اب یقیناً رشنا کو اسے اٹھانے کے لیے بھیجنے والی تھیں۔

"کہاں مر گئی نامراد......" پہلے پہل جب اس کی آنکھ کھلتی وہ اٹھ کر باہر نکل آتا تب اماں اسے مزید گالیوں سے نوازتیں۔

"ابھی بھی اٹھ کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ تماشہ تو ختم ہو گیا...... میری نیلامی کے بعد آتے ناں، سب

جانتی ہوں میں میری بے چارگی سے سکون ملتا ہے تمہیں، مزہ لینے کے بعد اٹھتے ہو۔" پھر آہستہ آہستہ اس نے اٹھنا ترک کر دیا تھا۔ آنکھ کھل بھی جاتی تو آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔

رشنا یا فائزہ آ کر اسے اٹھاتیں تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا۔ مزے کی بات یہ کہ اب اماں یہ بھی نہیں کہتی تھیں کہ وہ جان بوجھ کر سویا رہنے کی اداکاری کرتا ہے۔ شاید وہ یہ سوچنے لگی تھیں کہ ارمان کو عادت ہو گئی ہے۔ حالانکہ آج بھی اس کی نیند اتنی ہی کچی تھی جتنی اب سے چند سال پہلے۔ یہی اماں کسی کو اس کے پاس سے گزرنے نہیں دیتی تھیں۔

"میرا بچہ نیند کا بڑا ہی کچا ہے، کوئی پاس سے گزر بھی جائے تو اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔"

"ارمان ...... ارمان...... چلو اٹھو، معرکہ سر ہو چکا ہے۔" فائزہ نے اس کا کندھا ہلایا تو وہ مشینی انداز میں اٹھ بیٹھا۔

"ابھی کہاں مائی ڈیئر سس، ابھی تو معرکہ درمیان میں بھی نہیں پہنچا۔" فائزہ ہنس پڑی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ سست روی سے چلتا ہوا وہ باہر نکل آیا۔ جتنی اس کی رفتار سست تھی، اماں کی زبان اتنی ہی تیزی سے حرکت میں آئی تھی۔

سنی ان سنی کرتا وہ واش روم میں چلا گیا۔ یہ گالیاں، بد دعائیں اور کوسنے روزمرہ کا معمول تھے۔ بالکل ایسے جیسے ناشتہ، دوپہر کا کھانا یا رات کا کھانا۔

اماں کی گل فشانی جاری تھی۔ واش بیسن پر کھڑے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ارمان نے کئی سال پرانے شیشے میں اپنا دھندلا سا عکس دیکھا اور ہنستے ہوئے تولیے سے منہ صاف کر کے ناشتے کے لیے چوکی پر آ بیٹھا۔

"آج کچھ نہیں ہے کھانے میں۔" اماں نے یہ کہہ کر بے مروتی سے منہ پھیر لیا تھا۔

وجہ وہ خود بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ دوکان والے نے ادھار پر سامان دینے سے منع کر دیا ہو گا۔ فیضان کی ابھی تنخواہ نہیں آئی ہو گی۔ دودھ والا تو پہلے ہی دودھ دینا چھوڑ چکا تھا۔ بے دلی سے اٹھ کر وہ کمرے میں اپنی فائل لینے چلا گیا۔

فائل اور خالی والٹ لے کر وہ نکل ہی رہا تھا جب فائزہ نے چپکے سے کاغذ کا ایک تڑا مڑا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ تشکر بھری نظروں سے فائزہ کو دیکھتے ہوئے ایک نظر اس نے بند مٹھی پر ڈالی۔

ہر دو چار دن بعد یہی ہوتا تھا۔ اماں اسے دھتکار دیتیں تو وہ خالی پیٹ گھر سے نکل کھڑا ہوتا۔ دروازے کے آس پاس منڈلاتی فائزہ بچوں کی فیس میں سے بیس پچاس چپکے سے اس کی مٹھی میں تھما دیتی اور وہ چاہتے ہوئے بھی اس کا شکریہ نہ ادا کر پاتا۔ یہ سب کچھ شروع سے ایسا نہیں تھا۔

اماں کی بدمزاجی، ابا کی تنگی اور ارمان کی شرمندگی...... یہ تو پچھلے دو چار سالوں سے شروع ہوا تھا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ اماں شروع دن سے بے صبری تھیں۔

شروع دن سے اس نے گھر پر اماں کا راج دیکھا تھا۔ ابا جتنا بھی کما کر لاتے وہ اماں کے ہاتھ پر رکھ دیتے اور پھر کبھی پلٹ کر یہ بھی نہ پوچھتے کہ پیسے کہاں خرچ کیے؟ کتنے خرچ کیے؟ کتنے بچائے؟ سیاہ و سفید کی مالک اماں تھیں۔

اماں ہر کام میں اپنی مرضی کرتیں۔ ابا نے پٹرول تک ڈلوانے کے لیے اماں سے پیسے لینے ہوتے تھے۔ سب سے بڑی فائزہ پھر ارمان، ارمان سے چھوٹا فیضان اور سب سے چھوٹی رشنا۔ ایک بہترین اور مکمل خاندان تھا۔

اماں کے حکم پر فائزہ میٹرک کے بعد گھر بیٹھ گئی۔ فیضان اور رشنا کو پانچویں سے آگے جانے کی توفیق نہ ہوئی۔ ایسے میں صرف ارمان تھا جو ڈھیروں ڈگریوں کا
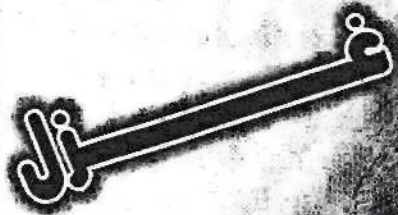
بوجھ دل و دماغ پر لیے پھرتا تھا۔

اماں کو بہت چاؤ تھا کہ پہلا لڑکا ہو لیکن ان کی دھونس گھر میں ہی چلتی تھی۔ اللہ نے اپنی مرضی سے بیٹی نواز دی۔ اماں نے کوئی گلہ نہیں کیا لیکن ارمان کی پیدائش پر اماں نے اپنے خوب ارمان نکالے۔ اصلی دیسی گھی کی مٹھائی بانٹی گئی، پورے چالیس دن گھر کی چھت اور دیواروں پر چراغ جلائے گئے اور ہر وہ کام کیا گیا جو اماں کی خواہش تھا۔

اماں نے بہت چاہت سے اس کا نام رکھا تھا "ارمان" پھر اس کا رجحان دیکھتے ہوئے اماں نے اسے مزید پڑھنے کی اجازت دے دی اور دیتی کیسے ناں......
اس نے لفظوں کے ریشم سے خوابوں کے ایسے خوبصورت تار بنے تھے کہ اماں جاگتی آنکھوں سے اپنے ہونہار پوت کو افسر بنے دیکھنے لگیں۔

جہاں تک ارمان کا تعلق تھا تو اس نے ہر وہ کوشش کر کے دیکھ لی تھی جو اس کے نزدیک اسے کامیابی سے ہمکنار کر سکتی تھی لیکن قسمت...... اس کی ہر ڈگری پر اسے پلس کا نشان بڑے بڑوں کو سلگا جاتا تھا۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورتی بھی اس کے در کی باندی تھی۔ چوڑا، فراخ ماتھا جس پر ہر لمحہ سیاہ بالوں نے سایہ کیا ہوتا۔ آنکھیں ایسی کہ جو ایک بار اچانک دیکھ لے وہ دوسری بار جان بوجھ کر دیکھے۔

اللہ تعالٰی نے ہر ایسی چیز سے نوازا تھا جسے دیکھ کر کوئی بھی حسد میں مبتلا ہو جائے۔ وہ جب گھر قدم رکھتا، اماں فوراً اس کی بلائیں لینے لگتیں۔ فائزہ کو پانی لانے بھیج دیا تو رشنا سے سر کی مالش کرنے کے لیے تیل منگوا لیا۔ کہتے ہیں ماں باپ فقط وہ رشتہ ہوتے ہیں جو بے ریا، بے غرض ہوتا ہے لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ ارمان کو اس بات کے غلط ہونے کا یقین پختہ ہونے لگا۔

ابا ریٹائر ہو گئے تو انہوں نے پرچون کی چھوٹی سی ایک دکان کھول لی۔ فیضان کو ایک جنرل سٹور پر رکھوا دیا۔ فیضان ہر مہینے پانچ چھ ہزار لے آتا اور ابا کی دکان سے بھی کچھ نہ کچھ آ ہی جاتا۔ ایسے میں گھر پہلے سے بہتر تو نہیں لیکن پھر بھی چل رہا تھا۔ اس کی بھی پڑھائی ختم ہو چکی تھی سو وہ جاب ڈھونڈنے کے چکر میں خوار ہو رہا تھا۔

ایک دن جب جاب کے لیے انٹرویو دے کر وہ گھر لوٹا تو ایک قیامت اس کی منتظر تھی۔

"ارمان...... ارمان...... ابا...... ابا ہاسپٹل...... ارمان مجھے ابا کے پاس لے چلو۔" ابھی اس نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا جب رشنا آ کر اس سے لپٹ گئی۔

اس کا دل بری طرح سے دھڑکا تھا۔

"کیا ہوا ابا کو......؟ کس ہاسپٹل میں ہیں۔" اس کی آواز حلق میں گھٹ رہی تھی۔

"پتا نہیں کیا ہوا ہے...... شاید ہارٹ اٹیک یا کچھ اور" فائزہ نے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں پکڑایا تھا۔
ابا کو فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ پھر گھر کی مالی حالت زوال پذیر ہونا شروع ہو گئی اور یہ اسی زوال کا ثمر تھا کہ اب گھر کی اخلاقی حالت بھی بری طرح سے تباہ ہو رہی تھی یا شاید ہو چکی تھی۔

ان تین چار سالوں میں وہ جتنی بھاگ دوڑ کر سکتا تھا۔ اس نے کی لیکن ابھی اس کا امتحان باقی تھا۔ سو وہ صبر و شکر کی تصویر بنا در در کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ اب اس نے جاب کے سلسلے میں پرجوش ہونا چھوڑ دیا تھا جب وہ خود پڑھتا تھا تو اساتذہ کی مہربانی اور اپنی قابلیت کے بل پر ٹیوشنز حاصل کر لیتا تھا۔ پڑھائی ختم ہوتے ہی ٹیوشنز کو خیر آباد کہہ دیا تھا کہ کیا خبر کب کس جگہ اپلائی کرے یا انٹرویو کے لیے جانا پڑ جائے اور اب تو اک عرصہ ہوا اسے ٹیوشنز ڈھونڈتے ہوئے لیکن اب یہ در بھی اس کے لیے بند ہو چکا تھا۔

وہ سٹاپ پر پہنچ چکا تھا۔ چور نظروں سے اس نے

مٹھی میں دبے نوٹ کو دیکھا اور سامنے کھڑے چنگ چی رکشہ میں جا بیٹھا۔

ٹوٹ جاتا ہے غریبی میں وہ رشتہ جو خاص ہوتا ہے
بن جاتے ہیں غیر اپنے جب پیسہ پاس ہوتا ہے

رکشے کی اندرونی طرف سرخ رنگ سے لکھا یہ شعر پڑھ کر اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ کتنی سچائی تھی اس گھٹیا سے شعر میں اسے یاد آ رہا تھا ایک بار یونیورسٹی بس نکل جانے کی وجہ سے اسے اور عامر کو چنگ چی میں بیٹھ کر یادگار تک جانا پڑا تھا۔ راستے میں رکشوں اور ٹرکوں کے پچھلے حصوں پر لکھے شعر پڑھ کر وہ دونوں منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنسے تھے۔ جس رکشے میں وہ بیٹھے تھے اس پر یہی شعر لکھا ہوا تھا۔ دونوں چپکے چپکے ہنس رہے تھے۔ تب ہی غلط ٹرن لینے پر چالان ہو گیا۔

سنگل پسلی ڈرائیور...... ہاں یہی نام دیا تھا دونوں مل کر ٹریفک کانسٹیبل کی منت سماجت کرنے لگے۔

"سر ابھی پچھلا چالان بھروا کر آج ہی گاڑی باہر لایا ہوں، تھوڑی رعایت دے دیں۔" ڈرائیور حقیقتاً ہاتھ جوڑے کھڑا ہوا تھا۔ لیکن ان دونوں کانسٹیبلو کی سوئی لفظ "گاڑی" پر اٹکی ہوئی تھی۔ چالان پرچی ہاتھ میں اور نمی آنکھوں میں لے کر جب وہ ڈرائیور دوبارہ سے رکشہ سڑک پر بھگانے لگا تو دونوں نے مل کر اس کا خوب مذاق اڑایا تھا۔

"یار پہلوان...... تم کہتے ہو غریبی میں رشتے ٹوٹ جاتے ہیں، آج جبکہ تمہاری اپنی گاڑی ہے پھر بھی اس کانسٹیبل نے تمہاری ایک نہیں سنی۔" عامر نے گاڑی پر خاصہ زور دیتے ہوئے کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی جسے اس نے کمال ہوشیاری سے چھپا لیا۔

"یار تم بھی ناں......! تمہاری اردو تھوڑی کمزور ہے، دیکھو نہیں رہے لکھا ہے۔ جب پیسہ پاس ہوتا ہے۔" یہ تو نہیں لکھا جب گاڑی پاس ہوتی ہے۔" اس نے مسکرا کر آنکھ دبائی، عامر نے ہنسی روکنا ضروری نہیں سمجھا۔ سنگل پسلی نے درد بھری نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"باؤ ابھی تو تم دونوں خود پڑھ رہے ہو جب زندگی تمہیں پڑھائے گی تب تم لفظ نہیں لہجے پڑھنا جان جاؤ گے۔"

"یار تم تو بڑے ذہین ہو، میری مانو فلسفے کی کتاب لکھ ڈالو، شائع میں کروا دوں گا۔" اس نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا تھا۔

"لوہاری...... دربار...... لوہاری...... دربار۔" رکشے والے کی تیز آواز نے اسے ماضی سے حال میں لا کھڑا کیا تھا۔ یہ وہی رستہ تھا جس سے گزرتے ہوئے اس نے رکشہ والے کا مذاق اڑایا تھا اور آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس شعر میں کتنی سچائی ہے۔

اماں کا بے مروت اور اکتایا ہوا لہجہ، رشنا کی انکھلیاں، فائزہ کی خاموش پروا، ابا کی بے بسی اور فیضان کی طنزیہ نگاہیں...... وہ کیا کچھ پڑھنا نہیں سیکھ گیا تھا، یونیورسٹی، کالجز کے اتنے سال اسے وہ کچھ نہیں سکھا سکے جو اس نے ناکارہ چیز کی طرح اپنے گھر والوں کے رویے سے سیکھا تھا اور ابھی نجانے اس نے کیا کچھ سیکھنا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہ سب سیکھنے پر مجبور تھا۔

☆☆☆

"ارمان...... ارمان...... ادھر آؤ جلدی۔ تھکا ہارا وہ گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ فائزہ نے اس کا بازو دبوچ کر اسے سیڑھیوں پر گھسیٹ لیا۔

"اب کیا ہوا؟" فائل سیڑھی پر پھینک کر وہ ادھر ہی بیٹھ گیا۔

"وہ...... تایا ابو آئے ہیں۔" فائزہ کے لہجے میں اضطراب کی وجہ ارمان سمجھ نہیں پایا۔ اس کی آنکھوں کی الجھن فائزہ نے پڑھ لی تھی۔

"شاہین کا رشتہ پکا کر دیا ہے، مٹھائی لے کر آئے ہیں۔" فائزہ بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔

"لیکن ایسے کیسے کر سکتے ہیں تایا ابو؟" گو کہ یہ منگنی شاہین نے اپنی ضد سے کروائی تھی لیکن پھر بھی ارمان کو جھٹکا لگا تھا۔

"ضرور تایا ابو نے زور زبردستی کی ہو گی...... تم شاہین کو فون کرو وہ پریشان ہو گی، پھر تایا ابو سے بات کرتے ہیں۔" فائزہ نے فی الحال اچھا مشورہ دیا تھا۔

"میرے پاس بیلنس نہیں ہے تم وائرلیس لے آؤ ادھر...... میں کرتا ہوں اسے کال۔" شاہین کی طبیعت وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ ارمان چونکہ خاندان کا واحد پڑھا لکھا لڑکا تھا سو ہر جوان لڑکی کی آرزو تھا۔ لیکن شاہین نے تایا ابو سے ضد کر کے ارمان سے منگنی کروائی تھی۔ شاہین کی بھوک ہڑتال، چیخ چیخ کر رونا تایا ابو سے دیکھا نہیں گیا سو انہوں نے چھوٹے بھائی سے خود بات کی تھی۔ منگنی کے بعد شاہین کی ضد سے مجبور ہو کر تایا ابو نے اسے فون بھی لے دیا تھا۔ سو اب وہ وقت بے وقت ارمان کا سر کھاتی رہتی۔

"کہاں ہو؟" "کس کے ساتھ ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ گھر کب جاؤ گے۔" ارمان اکتانے لگ گیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اسے عادت ہو گئی تھی۔ لیکن اب کافی عرصے سے شاہین نے اسے تنگ نہیں کیا تھا۔ ارمان مصروف تھا، پریشان تھا اس نے دھیان نہیں دیا۔ بلکہ اس نے شکر ہی کیا تھا کیونکہ جب بھی وہ فون کرتی جاب کے متعلق پوچھتی رہتی۔ پیار محبت کی باتیں خواب کی طرح سے گزر گئیں تھیں۔ فائزہ وائرلیس لے آئی تھی۔ اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے پاس اس وقت شاہین کو دلاسہ دینے کے لیے الفاظ بھی نہیں تھے۔ حقیقی معنوں میں وہ خود کو غریب تصور کر رہا تھا۔ بیل جا رہی تھی۔ اوپر کی سیڑھی پر بازو رکھے ریسور کان سے لگائے وہ سوچ رہا تھا کہ شاہین کو کیسے تسلی دے۔

"ہیلو...... ہیلو......" ادھر شاہین ہی تھی۔

"السلام علیکم......"

"وعلیکم...... کیسے ہو ارمان؟" اس کے نارمل نارمل سے لہجے پر ارمان کو حیرت سی ہوئی۔

"میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ......؟"

"میں بھی ایک دم فٹ...... کوئی نئی تازی......" اس کی آواز سے اس کے سکون کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

"میں کیا سناؤں تم ہی کہو......" ارمان کو اپنی آواز کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شاہین نے بھی شاید اس بات کو محسوس کیا تھا۔

"میں کچھ بھی...... کیا سناؤں؟ بس چل رہی ہے۔" شاہین بولی بھی تھی لیکن خاموشی سی برقرار تھی۔ فائزہ اشارے سے پوچھ رہی تھی کچھ مسئلہ تو نہیں، اب وہ اسے کیا بتاتا۔

"کچھ بھی نہیں...... ابھی گھر آیا تھا تو تمہاری منگنی کا پتا چلا۔" اس نے منگنی کے بارے میں ہی بات کرنے کے لیے فون کیا تھا لیکن اب اسے یہ مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ ہمت کر کے اس نے بات کر ہی لی۔

"اوہ...... تو مبارک دینے کے لیے فون کیا ہے۔" شاہین کی بے نیازی اور ارمان کی جھنجھلاہٹ عروج پر تھی۔

"اگر تمہیں یاد ہو تو تم مجھ سے منسوب تھیں۔" ارمان کو اپنا آپ بہت چیپ لگ رہا تھا۔ وہ شاہین کی خواہش تھا اور اب شاہین ہی اسے ٹھکرا رہی تھی۔ یہ بات تو روز روشن کی طرح واضح تھی کہ شاہین کے ساتھ کوئی زور زبردستی نہیں ہوئی تھی۔ سو تسلی تشفی کا تو کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ وہ اس کایا پلٹ کی وجہ جاننا چاہ رہا تھا۔

"دیکھو ارمان...... میری باتوں کا برا مت ماننا۔" وہ حد سے زیادہ سنجیدہ ہو رہی تھی۔ ارمان طنزیہ سی ہنسی

ہنس دیا۔

"بولو تم......"

"میں مانتی ہوں تم میری خواہش تھے۔" تھے پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔

"اس خواہش کی وجہ تم سے پیار نہیں تھا۔ تم خاندان کے واحد کوالیفائیڈ لڑکے ہو۔ تمہارا مستقبل تابناک ہو سکتا تھا اگر تمہاری قسمت اچھی ہوتی۔ دیکھنے میں بھی خوبصورت ہو۔ ایکچوئیلی تم میں ہر وہ بات تھی جو لڑکیوں کو اٹریکٹ کرتی۔ میں بھی تمہارے اچھے مستقبل میں اپنا مستقبل دیکھ رہی تھی۔ اسی کشش میں میں نے تین سال گزار دیے۔ اب نہ تمہاری جاب ہے نہ ہی ایسی کوئی امید نظر آ رہی ہے۔ میں لڑکی ہوں ابھی جوان ہوں، خوبصورت ہوں، کوئی بھی اچھا پڑھا لکھا اور امیر یا بہتر مستقبل کا حامل میرا طلب گار ہو سکتا تھا۔ دو چار سال اور گزر جاتے تو شاید مجھے اپنے خوابوں سے دستبردار ہونا پڑتا جو مجھے کسی قیمت پر منظور نہیں۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

ارمان سانس روکے کڑوی حقیقت کی گولی نگل رہا تھا۔

"میرا منگیتر انجینئر ہے، امیر ہے زیادہ خوبصورت نہیں لیکن ڈیسنٹ ہے اور اک آخری بات...... میں جانتی ہوں تمہیں مجھ سے نہ کبھی پیار تھا نہ ہے اور اب ہو بھی نہیں سکتا۔ اس لیے مجھے چھوڑنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔" وہ جانے اور کیا کچھ کہتی فون بند کر چکی تھی۔

لیکن وہ ایک سنگی مجسمے کی طرح سیڑھیوں میں ہی بیٹھا رہ گیا۔ فائزہ کو امی نے آواز دے ڈالی تھی اب جو واپس آئی تو ارمان کا چہرہ دیکھ کر شاید بہت کچھ سمجھ چکی تھی۔ اماں اور ابا آج پہلی بار کسی ایک بات پر متفق ہوئے تھے کہ ارمان کبھی ان کے ارمان پورے کر ہی نہیں سکتا۔

اماں کو یہ غصہ تھا کہ شریکے نے ان کو نیچا دکھایا حالانکہ یہی اماں تھی جو ارمان کے صدقے واری جاتی تھی کہ میرے شریکے کو مجبور کر کے قدموں میں لا ڈالا ہے۔ ابا کو یہ دکھ کہ بھائی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ نئے رشتے کے ٹوٹنے سے پرانے رشتے میں بھی فرق آنا ہی تھا۔ فیضان چھوٹا ہونے کے باوجود کماؤ تھا سو اس کا رعب الگ۔ بھوکے پیٹ ہی وہ ٹوٹے کھاٹ پر پڑ گیا۔ اماں کے کوسنے اور ابا کی ٹوٹے لہجے میں لعن طعن وقفے وقفے سے جاری تھی۔ جانے رات کے کس پہر اماں نے سسکاری سی بھری۔

"اچھا ہوتا یہ پیدا ہی نہ ہوتا یا مر کھپ جاتا کہیں...... رشنا کے ابا کب تک اسے یوں ہی گھر بٹھائے پکی پکائی کھلاتے رہیں گے اسے اڈے پر مزدوروں کے ساتھ چھوڑ جائیں کل جاتے ہوئے۔"

اس کے دل میں نیزے کی کتنی ہی انیاں اتر گئیں۔ پکی پکائی کب ملی اسے خود بھی نہیں پتا تھا۔ اماں کے الفاظ اس کا جگر چھلنی کر گئے۔ اتنی ڈگریاں اگر اسے گھر میں عزت دلانے میں ناکام رہیں تھیں تو کوئی بات نہیں وہ اب مزدوری بھی کر لے گا۔ کم از کم نکما ناکارہ جیسے الفاظ تو نہیں سننے پڑیں گے اور ہو سکتا ہے گھر میں تھوڑی بہت عزت بحال ہو جائے۔

اسے ماں باپ کے رشتے پر بہت ہی زیادہ اعتماد تھا لیکن اب بہتر مستقبل کا نہیں پرسکون حال کا سوچتا تھا کیونکہ اس نے حال جینا تھا۔ ساری رات انہی سوچوں میں گزر گئی۔ صبح وہ مزدوروں کے اڈے پر پہنچ گیا۔ شام تک دھوپ میں جلنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھر کتنے ہی دن وہ یوں ہی اڈے پر جاتا رہا۔ ہر روز ناکام و نامراد لوٹتا رہا۔

اماں ابا اس کے سامنے ہی اس پر لعن طعن کرتی۔ اس کے پیدا ہونے کی گھڑی کو منحوس گردانتی۔ ہر گزرتا دن اس کا دل کٹھور کر رہا تھا۔ اڈے پر اس طرح جاتے

ہوئے اسے بیس بائیس دن ہو چلے تھے اور کوئی ایک بھی اسے کام کے لیے لے کر نہیں گیا تھا۔ آج وہ تہیہ کر کے آیا تھا کہ اگر اب بھی اسے کام نہیں ملا تو وہ گھر نہیں جائے گا بلکہ خودکشی کر لے گا۔ پھر چاہے اس کی لاش بھی گھر نہ آئے۔ صبح ہی صبح اماں نے پھر اسے جی بھر کر ذلیل کیا تھا۔ فیضان نے جانے کس بات کا بدلہ لیا تھا۔ حد درجہ اکھڑا لہجہ اور اوپر سے اس کی ہتک آمیز گفتگو۔

ارمان کا جی چاہا وہ خودکشی اسی وقت کر لے لیکن وہ قسمت اور زندگی کو ایک آخری موقع دینا چاہتا تھا۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے سہ پہر...... وہ انتظار ہی کرتا رہا لیکن آج بھی وہ ناکام و نامراد ہی رہا۔

صبح بھی گھر سے بھوکا آیا تھا دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا کہ پیسے نہیں تھے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کھنکتے سکے نکالے۔ پندرہ روپے...... کل پندرہ روپے۔ موت تک لے جانے کے لیے کافی نہیں۔ خاموشی سے چلتا ہوا وہ رکشہ کی طرف جا رہا تھا۔ یونہی چلتے چلتے اس کی نظر دوکان کے دروازے سے اندر لگے قد آدم شیشے پر پڑی۔

کھلے دروازے سے اس نے اپنا عکس دیکھا۔ پچکے گال، کمزور جسم اور سانولی سی رنگت...... بغیر تیل کے اڑے اڑے سے بال...... گہری سانس بھرتا وہ سامنے کھڑے چنگ چی رکشہ میں بیٹھ گیا۔ منظر تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے وہ تیزی سے موت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ شاہدرہ موڑ پر رکشہ رکا تو اس کا دل چاہا وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ اماں ابا اور گھر سے بھاگ جائے...... کہیں ویرانے میں نکل جائے۔ دنیا کی خواہشوں اور درد کے جھمیلوں سے دور نکل جائے۔ ترک دنیا کتنا مشکل ہے اسے آج احساس ہو رہا تھا۔

نئے پل پر گاڑیوں کی لمبی قطاریں ٹول ٹیکس بھرنے کے لیے انتظار میں لگی ہوئی تھیں۔ اس کا سانس تھم رہا تھا۔ رکشہ تیزی سے پل پر چڑھا اس کی دھڑکن تھم رہی تھی۔ اس نے وہیں رکشہ رکوا لیا۔ کرایہ دیا اور فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ دریا میں پانی بہت زیادہ تو نہیں لیکن اتنا زیادہ ضرور تھا کہ وہ خودکشی کر سکے۔

شام کے وقت اس روڈ پر ٹریفک بہت زیادہ ہوتی تھی اور آج تو پھر ہفتے کا آخری دن تھا۔ پل کے دونوں اطراف بنے فٹ پاتھ پر دو تین لڑکے، ایک عورت اور دو تین قدرے بڑی عمر کے مرد ہاتھوں میں گوشت کے چھیچھڑوں کے شاپر لیے ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے تھے۔ کبھی کوئی گاڑی والا گاڑی روک کر دو، چار شاپر خرید کر ہاتھ لگا کر دریا میں اچھال دیتا۔ کبھی کوئی رکشہ رکوا کر صدقہ دینے کے

جدید ڈکشنری

عقل: سب سے بڑی چیز، سب سے چھوٹے ڈبے میں۔

فیشن: شوربے کو چھری کانٹے سے پینا۔

تجربہ: پرانی غلطیوں کی روشنی میں نئی غلطی کرنا۔

تاجر: دو اور دو کو پانچ کرنے کا ماہر۔

کرکٹ ایمپائر: کھلاڑیوں کی کیپ اور قمیص لٹکانے کی کھونٹی۔

ڈاکٹر: اسپئیر پارٹس کی مرمت کرنے والا۔

پڑوسی: جو آپ سے زیادہ آپ کے گھریلو حالات جانتا ہے۔

تجربہ: انسانی حماقتوں کا بہترین مجموعہ۔

ہسپتال: جہاں بغیر چھری کانٹے کے مریضوں کی کھال اتاری جاتی ہے۔

بھاری جہیز: دلہن کی قبولیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ٹیسٹ میچ: آج کا کام کل نہیں بلکہ پرسوں پر چھوڑنا۔

(طارق جمیل، خانیوال)

لیے وہ شاپر خرید لیتا۔

ٹول پلازہ سے پیدل چلتا وہ پل کے دوسرے کنارے تک آ گیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی فٹ پاتھ پر کھڑے لوگ دریا کے اطراف میں بنی جھونپڑیوں میں لوٹ جائیں گے وہ بھی اپنے اصل کی طرف لوٹ جائے گا۔ مغرب ہونے میں تھوڑا ہی وقت تھا جلتا سورج ٹھنڈا ہو کر شام کی گلابی چادر میں چھپ رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کو دیکھ کر اس کا دل بھی ڈوبنے لگا۔ اماں کی وہ محبت خواب صرف خواب ہو کر رہ گئی تھی آنکھوں میں چبھنے لگی۔

فائزہ...... اس کی غمگسار اس کا کیا حال ہو گا۔ ابا پر وقت سے پہلے بڑھاپا طاری ہو گیا تھا۔ وہ کیسے اس بات کو برداشت کریں گے۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ دور کہیں سے ہوا کی لہروں پر تیرتی اذان کی آواز اس کے کانوں کے پردے سے ٹکرا رہی تھی۔ پل کے اطراف دریا اپنی بانہیں کھولے اسے اپنی کشادہ آغوش میں سمانے کی دعوت دے رہا تھا۔ فٹ پاتھ پہ کھڑے لوگ جا چکے تھے۔ اب اکا دکا کوئی پیدل راہ گیر وہاں سے گزر رہا تھا۔ بس چند منٹ اور...... اس نے پل پر لگے جنگلے کی سلاخوں کو مضبوطی سے تھام لیا اس کی سانسیں بے ہنگم اور بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اپنی اضطراری کیفیت پر قابو پانے کے لیے اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ ایک گہرا سانس لے کر وہ کودنے ہی لگا تھا جب اس نے اپنے پاس کسی اور کی موجودگی محسوس کی۔

"ملک الموت" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ آنکھیں اس نے پھر بھی نہیں کھولیں۔

"سب کے دکھ ایک جیسے ہوتے ہیں؟" ایک ملائم سی ٹھہری ٹھہری آواز اس کے پہلو سے ابھری۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے برابر سیاہ گاؤن اور سیاہ سکارف سے اچھی طرح سر کو لپیٹے ایک خوبصورت بلکہ حد سے زیادہ خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر نرم سی دوستانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں سکون سا تھا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے ایک بار پوری طرح موت کو اپنے پاس محسوس کیا تھا سو اب آواز اس کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔

"میرا خیال ہے دکھ سب کے ایک جیسے ہوتے ہیں فرق بس ہمت اور دکھ کو فیس کرنے کے طریقے کا ہوتا ہے کیا خیال ہے۔" ارمان کا دل چاہا پہلے اس لڑکی کو اٹھا کر دریا میں پھینک دے جو زبردستی بات کو طول دے رہی تھی۔

"میں نہیں جانتا۔" اس کے لہجے میں زمانے بھر کی جھنجلاہٹ تھی۔

"جانتی تو میں بھی نہیں بس ایک جنرل مشاہدے کی بات کر رہی ہوں۔" ارمان کے انداز میں وہ بھی دونوں ہاتھوں میں سلاخیں پکڑ کر کھڑی تھی۔

"میں ایک مثال دیتی ہوں...... ایک گھر میں سات افراد رہتے ہیں۔ دو ماں باپ اور پانچ بچے۔ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کا باپ مر گیا۔ اب باقی افراد کا ردعمل جانتے ہو کیا ہو گا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کی بے تکی کہانی سننے لگ گیا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ایک بچہ چند دن دکھ منا کر نارمل زندگی کی طرف لوٹ جائے گا۔ ایک خود کو تباہ شدہ ریاست تصور کر کے روتا رہے گا۔ تیسرا اماں کو سہارا دینے کا سوچے گا۔ ایک کو کوئی پروا نہیں ہو گی۔ رہا آخری تو وہ دنیا میں موجود کسی بھی انسان کی طرح زندگی جیئے گا۔ اب بچی وہ ایک بیوہ عورت...... تو وہ روئے زمین پر موجود کسی بھی عورت کا ردعمل اپنا لے گی۔" ارمان پوری دلچسپی سے اس کی لن ترانی سن رہا تھا۔

"مسئلہ یا مصیبت سب کی ایک جیسی تھی لیکن رد

عمل سب کے مختلف تھے۔ پریشانیاں سب ہی فیس کرتے ہیں بس Way تھوڑا Change ہوتا ہے...... کچھ خودکشی کر لیتے ہیں کچھ مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں...... خیر چھوڑو روز آتے ہو یہاں؟" وہ اچانک موضوع سے ہٹی تو ارمان چونک اٹھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتا اس لڑکی کی بند مٹھی سے جھانکتے سلور بلیک موبائل نے بجنا شروع کر دیا۔ اس نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے مہنگے موبائل کی چمکتی اسکرین پر ڈالی اور ایک ارمان پر۔

سوری...... میں بس پانچ منٹ میں آئی۔ کہیں جانا نہیں میرا انتظار کرنا۔ ارمان کو حیرت زدہ چھوڑ کر وہ تیزی سے روڈ کراس کرنے کے لیے مڑ گئی۔ ارمان کو لگا جیسے یہ ساری باتیں اس نے ارمان کو سنانے کے لیے کی ہیں خاص کر خودکشی اور مردانہ وار مقابلہ کرنے کی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ادھر کھڑا انتظار کر رہا تھا۔

پانچ منٹ سے پہلے ہی ارمان کو وہ دوبارہ سامنے سے روڈ کراس کرتی دکھائی دی۔ روڈ پر ابھی تک رش کافی تھا اس نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑیوں کو روکا اور تقریباً بھاگتے ہوئے سڑک پار کر کے ارمان کے سر پر آ پہنچی۔ اس کا سانس ہلکا ہلکا پھول رہا تھا۔

"سو...... تم یہاں پر خودکشی کرنے آئے ہو؟" تم پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔ پہلے کی نسبت اب اس کے لہجے میں سر پھری موجوں کی طغیانی اور آواز میں کانچ کی چوڑی جیسی کھنک تھی۔ اندھیرا ہلکا ہلکا پھیل چکا تھا۔ سو اس وقت تک ارمان اسے غور سے نہیں دیکھ پایا تھا۔ ارمان نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ بات اس طرح سے منہ پر دے مارے گی۔

"تم سے کس نے کہا؟" اس کے "تم" کہنے پر ارمان نے بھی اسے تم ہی کہا تھا۔

"لو...... مجھے کون کہے گا......؟ اچھا ایک منٹ یہ میرا موبائل پکڑو۔" اب اس کے ہاتھ میں دھاتی باڈی والا موبائل تھا۔ تذبذب کے عالم میں ارمان نے اس کی نرم و نازک کشادہ ہتھیلی سے فون اٹھا لیا۔ کندھے پر لٹکے سرخ بیگ میں وہ کچھ تلاش کرتے کرتے ایک دم رکی۔

"میں تو تمہیں آئینہ دکھانے والی تھی پر یہاں اندھیرا ہے تمہیں کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ ورنہ میں تمہیں تمہارے چہرے پر لکھا دکھا دیتی۔ میں خودکشی کرنے آیا ہوں۔" وہ اتنی بے ساختہ اور کھلکھلا کر ہنسی کہ ارمان خود بھی ہنس پڑا۔

"تھینک گاڈ تم ہنسے تو...... ویسے میں مذاق کر رہی تھی۔ ایکچوئیلی تم بہت پریشان سے لگ رہے تھے۔" ارمان کی ہنسی کو ادھر ہی بریک لگ گئے۔ وہ جیسے ارمان کی کیفیت سے یکسر بے نیاز رنگ روڈ پر روشن مدھم مدھم ذرا روشنیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

"کتنا خوبصورت منظر ہے ناں......؟ جیسے لاتعداد جگنو چمکتے چمکتے ایک جگہ ٹھہر گئے ہوں۔" اس کی تقلید میں ارمان نے بھی سامنے دیکھا۔ واقعی بہت خوبصورت سا منظر تھا۔ ارمان کے اندر تک اس حسین منظر کی ٹھنڈک اتر گئی۔

"تمہیں ایک اور چیز دکھاتی ہوں۔" ریلنگ سے ہاتھ ہٹا کر وہ زمین پر بیٹھ گئی اور ٹٹول ٹٹول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ پھر جانے کیا سوچ کر اپنے ہینڈ بیگ کی زپ کھولی اور ہاتھ ڈال کر لپ پینسل نکال لی۔

"ابھی تمہیں ایک میجک دکھاتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پینسل والا ہاتھ پیچھے کی طرف بلند کیا۔

"تم بس پینسل کی طرف دیکھتے رہنا۔" اپنے کندھے کی پوری طاقت سے اس نے پینسل پانی میں اچھال دی۔ ایک چھوٹا سا بھنور بنا اور دیکھتے ہی دیکھتے تحلیل ہو گیا۔ ارمان کی آنکھوں میں حیرت سی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اسے پتا نہیں تھا یوں بھنور بنتا ہے۔ بس فرصت سے یوں ہی کوئی چھوٹا سا کام یا شرارت اتنا

سکون دیتی ہے اسے پتا نہیں تھا۔

"مزہ آیا؟" اس نے بچوں جیسی معصومیت سے پوچھا۔

"بہت...... بہت زیادہ۔" جانے کیسے ارمان کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکل گئے۔ بہت دیر وہ یوں ہی اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی۔ بے مطلب، بے سرو بے پیر لیکن اس کی باتوں میں بے حد سکون تھا۔ زندگی کی چمک سے بھرپور چاندی جیسی باتیں۔

"اب میں چلتی ہوں۔" موبائل پر آتی کال اس نے کاٹ کر شگفتہ سے لہجے میں کہا۔ ارمان نے سر ہلا دیا۔

"اپنا نام تو بتا دو۔" ارمان ہنس پڑا۔ آدھا پون گھنٹہ گزارنے کے بعد اسے نام پوچھنا یاد آیا تھا۔

"ارمان...... اور تمہارا؟"

"تانیہ......" ایک منٹ میں ذرا بات کرلوں۔ نام بتاتے بتاتے پھر اس کا فون بج اٹھا۔

"بس آرہی ہوں...... نہیں نہیں ٹھیک ہے...... روز؟...... لیکن...... دیکھ لو...... چلو بس پانچ منٹ۔" ہینڈ بیگ میں موبائل پھینکتی وہ پھر اس کے پاس آگئی۔

"امید ہے تمہیں بور نہیں کیا ہوگا۔" ارمان پھر مسکرا دیا۔ شاید مسکرانے کی کمی پوری کر رہا تھا۔

"جب تم مجھے فیملی اسٹوری سنا کر گئی تھی تب بچی بہت بور لگی تھی۔" ایک لمحہ کو حیران ہو کر وہ مسکرا دی۔

"میں ایسی ہی ہوں۔" میں اکثر یہاں آتی ہوں، شاید پھر کبھی ملاقات ہو جائے۔

ارمان نے اسے دور جاتے ہوئے دیکھا اور پیدل ہی واپسی کے رستے پر نکل پڑا۔ پہلے اس نے سوچا تھا تانیہ کا نمبر لے لے پھر جانے کیا سوچ کر وہ چپ ہو گیا۔ وہ جب ٹول پلازہ کے پاس پہنچا تب اسے یاد آیا کہ وہ تو خودکشی کرنے آیا تھا۔ موت کی تلاش میں زندگی سے سامنا ہو گیا۔ بے وجہ مسکراتا ہوا وہ گھر کے لیے رکشہ میں جا بیٹھا۔ تب اسے یاد آیا کہ کرایہ کے لیے تو پیسے ہی نہیں۔ وہ پھر پیدل ہی چلنے لگا۔ گھر میں فائزہ کے علاوہ کون اس کا منتظر تھا۔ ویسے بھی وہ اماں کی بد زبانی کی وجہ سے آج کا اتنا پیارا موڈ تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا سو اسے گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

☆☆☆

"ہائے جیمز، ہائے ہیری" وینس نے ہاتھ کے اشارے سے دور ہی سے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ پیچھے کی سمت بیٹھی جولیا کو وہ قریب آنے تک دیکھ ہی نہ سکی۔

"اوہ ہائے جولیا تم ابھی یہیں ہو؟" سلیولیس بلیو جینز جیکٹ ٹائپ شرٹ ود ٹائٹ جینز پینٹ پہنے وہ از حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ جبھی تو جولیا کے جواب سے پہلے ایک ایشیائی رنگ و روپ کا حامل درمیانی عمر کا آدمی اس کے پیچھے چلا آیا۔

"ہائے ایوری باڈی ..... کیا میں آپ کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ سکتا ہوں؟" اس کا انگلش لب و لہجہ اور روانی سے انگلش بولنا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کافی عرصے سے یہاں مقیم ہے یا یہیں پہ پیدا ہوا ہے۔ سب نے بھرپور انداز میں اسے سرتا پاؤں گھورا پھر آنکھوں آنکھوں میں اشارے بازیاں ہوئیں۔

"بیٹھ جاؤ۔" کہنے کے ساتھ ساتھ ہیری نے اسے اشارہ بھی کیا تھا۔

"میرا نام عظمان عباسی ہے...... اگر آپ میں سے کوئی پاکستانی موویز دیکھتا ہے تو یقیناً عباسی پروڈکشنز کا نام ضرور جانتا ہوگا۔" چاروں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے یہ کہہ رہے ہوں۔

"میں اسے نہیں جانتا کیا تم جانتے ہو......؟"

"ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟" جولیا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہیری کو "میں سنبھالتی ہوں" کہا اور نو وارد کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وینس لاپروائی سے کاؤنٹر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ویٹر پتا نہیں کب آئے، مجھے بہت پیاس لگی ہے۔ میں کاؤنٹر تک جا رہی ہوں تم لوگوں کو کچھ چاہیے کیا؟" وینس کے کھڑے ہوتے ہی عظمان عباسی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"میم مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" آپ پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔

"ایکچوئلی میرے ساتھ کچھ گیسٹ ہیں ورنہ اطمینان سے آپ کا انتظار کرتا۔" وینس ابھی ابھی سی بیٹھ گئی۔

"آپ بہت خوبصورت ہیں۔" وہ ایک لمحے کو رکا۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ خاص کر جیمز نے۔ وہ وینس کو کس قدر والہانہ چاہتا ہے یہ بات کسی سے چھپی نہیں تھی۔

"یہ جملہ آپ نے شاید نہیں یقیناً بہت بار سنا ہوگا اور یقیناً میرا بتانا آپ کے لیے کوئی نئی اطلاع نہیں ہوگی...... میں انڈسٹری میں نئے چہرے متعارف کروانے میں بادشاہ ہوں...... جو کام نہیں بھی جانتا میں ان سے بھی کام لینا جانتا ہوں۔ اگر ماڈلنگ ایکٹنگ کا شوق یا ارادہ ہو تو مجھے ضرور یاد فرمائیے گا۔ مجھے خوشی ہوگی۔" وہ اٹھ کر چلا گیا تو ایک ویٹر کورے کاغذ پر لکھا اس کا نمبر ان کی ٹیبل پر دے گیا۔ وینس نے لاپروائی سے اسے بیگ میں رکھ لیا۔

نہ تو اسے ایکٹنگ ماڈلنگ کا شوق تھا نہ ضرورت۔ پھر بھی جانے کیوں اس نے وہ کاغذ کا ٹکڑا پھینکا نہیں۔ عظمان عباسی کے جانے کے بعد کسی نے بھی اس کے بارے میں بات نہیں کی بلکہ ان کے درمیان جولیا اور ہیری کی اگلے ہفتے ہونے والی شادی زیر بحث رہی۔

☆☆☆

نہ تو باتیں کرنے سے قسمت بدلتی ہے نہ تدبیریں کرنے سے۔ ارمان یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا۔ قسمت بس تب بدلتی ہے۔ جب اس نے بدلنا ہوتا ہے۔ سو وہ بھی برا وقت کٹ جانے اور قسمت کے بدلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اب بھی وہ جہاں کہیں ویکنسی کا سنتا پہلی فرصت میں جا کر C-V ڈراپ کر آتا۔ پر اب وہ پہلے جیسا چڑچڑا یا۔ ناامید نہیں تھا۔ صبح گھر سے نکلتا اور اڈے پر چلا جاتا۔ کبھی کبھی کوئی اسے "دیہاڑی" کے لیے لے جاتا۔ پھر وہ شام کو راوی کے نئے پل پر اسی جگہ جا کھڑا ہوتا جہاں تانیہ اسے ملی تھی۔ یا پھر کہیں سی وی دینے جاتا تو واپسی پل پر اتر جاتا۔ تانیہ نے کہا تھا وہ اکثر یہاں آتی ہے لیکن ارمان کو پچھلے سترہ دن میں وہ ایک بار بھی نہیں ملی تھی۔

آج بھی وہ سی وی ڈراپ کر کے گھر جا ہی رہا تھا جب بے وجہ راوی پل پر اتر گیا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ دن یوں بھی آج کل چھوٹے سے تھے۔ موسم سرما کی آخری ہچکیاں چل رہی تھیں۔ نیچے تلے قدم اٹھاتا سر گرائے اپنے اٹھتے پیروں پر نظر رکھے۔ وہ چلا جا رہا تھا۔ دل میں روز کی طرح آج بھی خواہش تھی کہ تانیہ سے سامنا ہو جائے۔ کچھ وقت قبولیت کے ہوتے

عظمت

عظیم انسان وہ ہے جو بظاہر سمندر کی طرح پرسکون رہتا ہے۔ مگر اس کی گہرائی میں ہزاروں تمنائیں دم توڑتی رہتی ہیں۔ خواہشات کرچیاں بن کر اس کے سارے وجود کو زخمی کر دیتی ہیں۔ لیکن یہ انسان چہرے کے گرد مسکراہٹ کا روپ دھارے رکھتا ہے۔

دل کے زخموں کا اندازہ کب ہوتا ہے چہرے سے
ساحل سے کیا جان سکو گے سمندر کتنا گہرا ہے

(عنبرین اختر، لاہور)

ہیں جب دعا کو ہونٹوں سے ادا کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی یا کچھ دعائیں ایسی ہوتی ہیں جو ہماری دھڑکن میں چوبیس گھنٹے دھڑکتی ہیں اور کہتے ہیں چوبیس گھنٹوں میں کوئی تو لمحہ قبولیت کا ہوتا ہی ہے۔

اس کی دعا کی قبولیت کا یہی لمحہ تھا۔ تانیہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسے اب یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں وہ اسے پہچاننے سے انکار نہ کردے۔ پھر یہ بھی خدشہ تھا کہ یہ لڑکی تانیہ ہے بھی یا نہیں۔ شام کے دھندلے اجالے میں اس نے اسے دیکھا تھا۔

"ارمان آپ......" ارمان کو تسلی سی ہوگئی کہ وہ تانیہ ہی ہے اور یہ بھی کہ اس نے اسے پہچان لیا ہے۔

"شکر ہے خدا کا، آپ نے کہا تھا آپ اکثر آتی ہیں یہاں جبکہ میں سترہ روز سے بلاناغہ آرہا ہوں اور آپ سے آج ملاقات ہورہی ہے۔" ارمان کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

"میں روز آتی ہوں لیکن اندھیرا بڑھنے سے پہلے چلی جاتی ہوں۔" ارمان نے خاصی خوش اخلاقی سے شکوہ کیا تھا لیکن سنجیدہ سے لہجے میں جواب سن کر اس نے آہستہ سے سر ہلادیا۔

پکی سیڑھیاں اتر کر وہ دریا کے پاس پل سے نیچے آگئے تھے۔ اس سارے راستے میں وہ دونوں خاموش رہے۔ جانے کے لیے تیار کھڑی کشتی میں وہ دونوں ٹکٹ لے کر سوار ہوگئے۔ تیرہ، چودہ سال کا لڑکا چپو چلا رہا تھا۔ دس سے پندرہ منٹ دریا میں چکر کاٹنے کے بعد وہ بارہ دری کے کنارے پر اتر گئے۔ سنگی زینے پر سبک رو چلتے ہوئے وہ دونوں خاموش تھے۔ بے زار سی خاموشی تھی۔

ارمان کو لگا وہ کچھ پریشان ہے ورنہ وہ اچھی خاصی بااخلاق لڑکی تھی۔ اس کا اندازہ اسے پہلی ملاقات میں ہی ہوگیا تھا۔ لیکن پھر گاہے گاہے ان کی ملاقاتیں ارمان کو اس کے اندازے کا غلط ہونا ثابت کرگئیں۔ تانیہ سنجیدہ سی لڑکی تھی۔ ارمان اگر پہلے جیسا ہوتا بے فکرا اور خوش قسمت تو اس کا رنگ تانیہ کی رنگت سے یقیناً صاف تھا۔ تانیہ کی بڑی بڑی براؤن آنکھیں چمکیلی تھیں۔ ذہانت اور زندگی کی چمک سے بھرپور آنکھیں۔

بلاشبہ وہ ایک بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ جانے کیا چیز تھی جو اسے ارمان کی طرف کھینچتی تھی۔ ارمان اب روز اسے ملنے لگا تھا۔ جانے کیا بات تھی پہلے دن والی بے تکلفی دور دور تک نظر نہیں آتی تھی۔ وہ جب بھی ملتی عجیب سی باتیں کرتی، کتابی باتیں...... سمجھ میں نہ آنے والی مشکل باتیں...... ایک ناصح کی طرح وہ اس سے بات کرتی تھی۔ نہ اس نے ارمان سے اس کی پرسنل لائف کے بارے میں پوچھا نہ ارمان نے۔ اک تکلف کی دیوار سی تھی۔ ارمان نے کئی بار اس دیوار کو گرانا چاہا لیکن بے سود...... الٹا اسے اپنا آپ آکورڈ لگنے لگا تھا۔

وہ ارمان کو ایسے ٹریٹ کرتی جیسے کوئی ٹیچر کسی سٹوڈنٹ کو۔ ہر روز وہ کسی نہ کسی موضوع پر ارمان کو لیکچر دے ڈالتی۔ اخلاقیات، سیاسیات، اکنامکس، اسلامیات ہر وہ موضوع جو ارمان چن کر لاتا وہ اسی پر اسے ٹھیک ٹھاک سنا دیتی۔ ہر بات میں اسلام کا ٹکڑا جوڑ دیتی۔ ناامیدی، مایوسی، موت، تکلیفیں...... ارمان نے کئی بار اس سے پہلی ملاقات کے بارے میں بات کرنا چاہا لیکن وہ بات کو عجیب طرح سے موڑ دیتی۔

پھر یوں ہوا کہ وہ دو تین دن آئی نہیں، ارمان جس دن اڈے سے مزدوری کے لیے جاتا اس دن بھی ٹائم نکال کر تانیہ کو ڈھونڈنے جاتا۔ پھر ایک دن وہ دوبارہ نظر آگئی۔

"ارمان تم نے مجھے مس کیا؟" اس کے لہجے میں وہی شرارت اور بے تکلفی تھی جو پہلے دن تھی۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے...... روز تمہیں ڈھونڈنے آتا تھا، ویسے پچھلے ایک ڈیڑھ ہفتے سے کہاں غائب تھیں۔"

"میری طبیعت تھوڑی خراب تھی۔"

"اللہ کرے تمہاری طبیعت یوں ہی تھوڑی خراب رہا کرے۔"

"کیوں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"کیونکہ تمہاری ٹھیک طبیعت میری طبیعت خراب کردیتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ویسے تانیہ ایک بات تو بتاؤ۔" کشتی میں اس کے برابر بیٹھتے ہوئے ارمان نے کسی قدر سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

"ہاں پوچھو......"

"تم پچھلے دنوں میری ٹیچر کیوں بنی ہوئی تھیں...... جی بہت کھڑوس لگتی ہو، نہ کیا کرو۔" ارمان نے پوری ایمانداری سے اسے پچھلے رویے کا احساس دلایا تو وہ پھر ہنس پڑی۔

"ارمان یہ دیکھو......" اس کا اشارہ بہتے پانی کی طرف تھا۔

"کتنا خوبصورت ہے ناں؟" ارمان نے سر ہلایا لیکن اس نے دیکھا نہیں۔ چھوٹی سی بوٹ کے کنارے کی طرف سرک کر اس نے اپنا ہاتھ ٹھنڈے پانی میں ڈبو دیا۔

"اف...... ارمان بہت ٹھنڈا پانی ہے اور وہ تو دیکھو ذرا۔" ملاح جہاں پر چپو پانی میں ڈالتا اور پھر نکالتا وہاں پانی کا ایک گول چکر سا بن جاتا اور اگلے ہی لمحے وہ پیچھے رہ جاتا، بوٹ آگے بڑھ جاتی ہے۔ تانیہ کے چہرے پر بچوں جیسی معصوم خوشی تھی جس کے ہالے میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

ارمان جی بھر کر حیران ہوا۔ کتنے دن ہوگئے تھے اسے یہاں آتے ہوئے لیکن اس نے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ یہی تانیہ، یہی ارمان اور یہی دریا تھا پھر کیا بدلا تھا؟ کچھ تو بدلا تھا کیا؟ صرف یہ نہیں پتا تھا۔ بارہ دری کے کنارے پر بوٹ رکی تو ارمان سے پہلے تانیہ مٹی کی چڑھائی سے آگے بڑھ کر سنگی زینے پر چڑھ گئی۔

جب سب مسافر اتر چکے وہ دوبارہ کنارے پر آگئی۔

"ارمان یہ دیکھنا پتھر...... میں نے ادھر بیٹھنا ہے۔" پانی میں مٹی کا ایک بڑا سا پتھر نما ڈھیر تھا۔ یہ کہتے ہی تانیہ اس پر بیٹھ گئی۔ عبایا اور بلیک ٹراؤزر گھٹنوں تک چڑھا کر پاؤں اس نے گھٹنوں سے ذرا نیچے تک پانی میں ڈبو دیے۔ ارمان بھی جگہ دیکھ کر کنارے پر ٹک گیا۔ وہ دو فٹ نیچے پانی میں مٹی کے ڈھیر پر بیٹھی تھی۔

"یو نو نیچر مجھے بہت اٹریکٹ کرتی ہے...... ویسے بھی قدرتی خوبصورتی کی بات ہی اور ہوتی ہے۔" وہ پانی میں ہاتھ بھگو رہی تھی اور ارمان سوچ رہا تھا واقعی قدرتی خوبصورتی الگ ہی ہوتی ہے۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر وہ اسے اپنی باتوں سے محظوظ کرتی رہی پھر اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب ادھر چلتے ہیں۔ اس کا اشارہ سیڑھیوں کی طرف تھا۔ جیسے ہی وہ پھرتی سے کنارے پر چڑھنے لگی پاؤں تلے سے گیلی مٹی نکل گئی وہ لہرا کر پانی میں گرنے لگی تھی کہ ارمان نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اوپر کھینچ لیا۔

اس کی رنگت سانولی نہیں سرخ وسپید تھی۔ یہ بات ارمان کو ابھی پتا چلی تھی۔ روئی کے نرم گالے کی طرح سے اس کا نرم ہاتھ ارمان کے ہاتھ میں دبا تھا۔ اس نے آہستگی سے ہاتھ چھڑایا اور کچھ بھی کہے بنا سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"اوہ مائی گاڈ......" وہ ایسے حیران تھی جیسے پہلی بار آئی ہو۔ پتھریلی روش کے اختتام پر پانچ چھ فٹ نیچے ہری ہری گھاس کا کارپٹ سا بچھا ہوا تھا۔ دو قدم کی اونچائی پر مٹی کی راہداری سی تھی۔ پتھریلی روش سے چھلانگ لگانے کی بجائے وہ مٹی کی اس چھوٹی سی سڑک پر چڑھ گئے۔ جو آگے جا کر بائیں طرف پارک میں

اترتی تھی۔

جہاں ارمان بیٹھا تھا اس کے پیچھے خاصی اونچائی تک کاسنی اور سفید پھولوں کی بیل تھی یوں جیسے پردہ سا تنا ہو۔ اس نے ارمان کو جی بھر کے ہنسایا۔ ہلکی پھلکی باتیں بغیر کسی مقصد کے۔ ارمان کو بہت عرصے بعد لگا کہ وہ تانیہ سے ملا ہے ورنہ پہلی ملاقات کے بعد سے اب تک وہ تھوڑا عاجز آ گیا تھا اس کی گل افشانی اور سنجیدگی سے۔ اب اس نے یہ انداز لگایا تھا کہ تانیہ موڈی لڑکی ہے۔ مغرب کے بعد وہ لوگ بارہ دری سے نکل آئے۔

''آئس کریم کھانے چلیں؟'' ارمان نے سوچا ٹائم زیادہ ہو جانے کا بہانہ کر کے نکل جائے لیکن آج تانیہ کا موڈ اچھا تھا اور ارمان کی جیب خالی۔ پھر جانے خود ہی کیا سوچ کر اس نے منع کر دیا۔

''رہنے دو آج مجھے جلدی جانا ہے۔ نیکسٹ جب بھی ملی تم سے آئس کریم ضرور کھاؤں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اقرار میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

کبھی کبھی کسی ایک شخص کی وجہ سے آپ کی پوری کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ یا پھر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کوئی ایک شخص آپ کے خیالات پر یوں حاوی ہوتا ہے کہ آپ کا زندگی کو دیکھنے کا، سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔

یہی کچھ ارمان کے ساتھ ہوا تھا۔ نہ تو اسے جاب ملی تھی اور نہ ہی گھر میں ہونے والی عزت افزائی میں کمی آئی تھی۔ بدلا تھا تو صرف اس کا دل، اس کی سوچ ویسے بھی آج کل اس نے سوچنے کا کام چھوڑ رکھا تھا خاص کر ماضی اور حال کے درمیانی فرق اور گھر والوں کے حوصلہ شکن رویوں کے بارے میں۔ وہ جانے انجانے تانیہ جیسی زندگی جینے کی خواہش کر رہا تھا۔ مسکراتی ہوئی فکروں سے آزاد اور شرارتوں سے بھرپور اسے لگ رہا تھا جیسے زندگی کے وہ سال جو اس نے گزارے ہیں وہ حقیقتاً اس نے گزارے ہی نہیں۔ اب اس کے دل میں زندگی جینے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔

اسے تانیہ کی سنگت میں اور اک ہوا کہ وہ ہنسنا چاہتا ہے، اس کے گھر میں ہنسی کا کتنا کال پڑا ہوا ہے۔ جس دن تانیہ کا موڈ اچھا ہوتا اس دن اس کا دل چاہتا وہ اسے روک لے۔ اسے گھر نہ جانے دے۔ ساری رات وہ اسے اپنی آنکھوں سے دنیا دکھائے۔ بھنور بننے اور ستارہ اگنے کا عمل، چاند کے چمکنے اور چاندنی کے پھیلنے کا عمل...... سب اسے اپنی آنکھوں سے دکھائے۔ لیکن جانے کیا وجہ تھی کہ جس دن اس کا موڈ اچھا ہوتا وہ جلدی گھر چلی جاتی۔

کبھی ''گھر ویٹ ہو رہا ہو گا، آج جلدی جانا ہے، مجھے راستے میں کام ہے، تو ٹائم لگ جائے گا۔'' قسم کے بہانے کر کے جلدی چلی جاتی اور وہ اس سے لاکھ فرینک ہونے کے باوجود یہ نہ کہہ پاتا۔

''آج بہت دن بعد موڈ اچھا ہے، کچھ دیر اور رک جاؤ ورنہ جانے کتنے دن تمہارے بور فلسفے پر مبنی لیکچر سننے پڑیں گے۔'' اسے لگنے لگا تھا کہ اب دن جاب کی تلاش میں گزرنے کے لیے طلوع نہیں ہوتا بلکہ تانیہ کے انتظار کے لیے طلوع ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ تانیہ کی شرارتیں، شوخیاں اسے اپنے پورے جزئیات کے ساتھ یاد ہوتیں جبکہ اس کے لیکچرز...... کئی بار یاد کرنے پر بھی ارمان کو ان کا ایک جملہ بھی یاد نہیں آسکا تھا۔

وہ چاہتا تھا تانیہ روز اسے خوش باش اور ہنسی مسکراتی ملے لیکن اس کی یہ چاہ صرف چاہ بن کر ہی رہ گئی تھی۔ حد درجہ موڈی لڑکی تھی وہ۔ جی چاہے تو ذرے سے بھی دنیا نکال کر اس کے سامنے رکھ دے اور جی چاہے تو ہر چیز، ہر موسم...... ارمان کی التجا کرتی نظریں سب نظر انداز کر کے اسے کتابی باتیں سناتی۔

ارمان کو یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی دل سے دعا مانگی ہو یا صرف زبان سے ہی دعا مانگی ہو پر اب وہ تانیہ سے ملنے سے پہلے دل ہی دل میں کئی بار اس کا موڈ اچھا ہونے کی دعا مانگتا تھا۔ جو اکثر و بیشتر قبول نہیں ہوتی تھی پھر بھی وہ روز دعا کرتا اور پورے اعتماد کے ساتھ دعا مانگتا۔

تانیہ سے اس کے رشتے نے اس کا دعا سے رشتہ جوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

''ہائے وینس'' اس نے سامنے سے آتے ہوئے نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والے جیری کو دیکھا اور مارکیٹ سے کی گئی خریداری کے شاپنگ بیگ زمین پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

جیری نو دس سال کا گول مٹول سا ایک پیارا بچہ تھا جو کہ اس کے پڑوس میں رہتا تھا۔ مارکیٹ آنے سے قبل وہ جیری کو گھر میں چھوڑ آئی تھی پچھلے تین چار دن سے برف باری ہو رہی تھی سو اس سے مارکیٹ کے لیے نکلا نہیں جا رہا تھا۔ آج برف باری کی شدت میں تھوڑی کمی آئی تھی سو وہ روزمرہ استعمال کی کچھ چیزیں لینے مارکیٹ چلی گئی تھی۔

''ہاں کیا ہوا؟...... پکڑو یہ'' بریڈ، جیم اور انڈوں کا پولیتھن بیگ اسے پکڑا کر باقی خود تھام لیے۔

''تم جلدی سے گھر چلو...... آنٹی نے اتنا ہنگامہ مچایا ہے، مجھ سے سنبھالا نہیں گیا تو میں تمہیں ڈھونڈنے جا رہا تھا۔'' پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ جیری اس کے ساتھ تقریباً بھاگ رہا تھا۔

''ہوا کیا تھا؟''

ہونا کیا تھا...... تھوڑی دیر پہلے جیمز آیا تھا، میں نے بار میں سے اسے شیمپئن لا کر دی اور بدقسمتی سے چابی بار کے دروازے سے نکالنا بھول گیا...... جیمز کے جانے کے بعد میں اندر آیا تو بار کا دروازہ کھلا تھا اور آنٹی وہسکی کی بوتل منہ سے لگا کر کھڑی تھیں۔ وینس کے قدموں کی رفتار تیز ہوئی تو جیری سے ساتھ دینا مشکل ہو گیا۔

''پھر......؟'' مفلر کو کان پر لپیٹتے ہوئے وینس نے اس کی طرف دیکھا۔

'میں نے روکا تو بوتل اٹھا کر میرے سر پر پٹخ دی، بہت مشکل سے بچا میں۔'' وینس کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی اور پورے وجود میں پھیل گئی۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ بہت سی مغربی عورتوں کی طرح ایلس بھی نوجوانی کے دور سے ہی شراب کی عادی ہو چکی تھی۔ اب اس عمر میں جگر، معدہ اور گردے سب خراب کر چکی تھی۔ دو بار دل کا دورہ بھی پڑ چکا تھا۔ پھر بھی شراب تھی کہ چھوٹ نہیں رہی تھی۔

ڈاکٹرز نے بھی آخری وارننگ دے دی تھی لیکن ایلس کسی بھی طرح شراب چھوڑنے پر راضی نہیں تھی۔ آئے روز شراب کو لے کر وینس کو گندی گندی گالیاں دیتی۔ گندے رکیک الزام لگاتی اور پھر گھر میں توڑ پھوڑ شروع کر دیتی۔ وینس نے ہال کے داخلی دروازے سے اندر جھانکا۔ ہر طرف کانچ ہی کانچ بکھرا تھا۔ مہنگے ڈیکوریشن پیسز، وال سنریز اور شراب کی بوتلوں سے لے کر کھڑکیوں تک کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔

آج کچھ زیادہ ہی ہو گیا مس ایلس۔ زیر لب بڑبڑا کر اس نے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ ٹیبل پر منتقل کیے اور احتیاط سے قدم اٹھاتی ایلس کے کمرے کی طرف آ گئی۔ عموماً اس طرح کے ہنگامے کے بعد ایلس اس سے چھپنے کی غرض سے کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔ اس نے آہستگی سے دستک دی لیکن جواب ندارد۔ اس نے دوبارہ دستک دی دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ سامنے کے منظر پر نظر پڑتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ کمرہ اس کی دلخراش چیخوں سے ہلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"باؤ میں کچھ خدمت کروں؟" اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ داڑھی والا یہ بوڑھا اس نے پہلے بھی کئی بار یہاں دیکھا تھا۔

"نہیں شکریہ" اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔ بوڑھا اس کے برابر ریل کی پٹڑی پر بیٹھ گیا۔ شام کے بعد اب رات کا پرندہ اپنے سیاہ پر پھیلائے ہر شے کو اپنی آغوش میں سمیٹ رہا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے سرکار...... ہر مرض کی دوا ہے میرے پاس۔" بوڑھے نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مسکرا کر آنکھ دبائی۔ تو اس کی رگ پھڑک اٹھی۔

"نہیں کچھ نہیں۔" وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھنے لگا تھا جب اس بوڑھے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"باؤ بیٹھ جانا یار۔" وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔

"شراب سے شباب تک دنیا کا ہر سکون صرف تیری اک ہاں کا منتظر ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر سامنے جھونپڑیوں کو دیکھا۔

"کہا تو ہے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"جھوٹ نہ بول...... اچھا بتا کیا مسئلہ ہے تجھے، لڑکی کو پانا ہے یا دولت کو؟" ہر مرض لا علاج کا علاج ہوں میں، تو اک بار دل کی بات کہہ کر تو دیکھ۔

"پڑی، چاہیے؟" ارمان نے اپنے پیچھے پھیلے ہوئے وسیع و عریض قبرستان کے ہولناک سناٹے کو خود میں سرایت کرتے محسوس کیا۔

"پہلے کبھی پڑی یا سگریٹ......"

"آپ کی مہربانی بابا جی" اس نے بوڑھے کریمے کی بات کاٹی۔

"مجھے پہلے ہی بڑے دکھ ہیں اور نہیں چاہیں۔" سر جھکا کر اس نے آہستگی سے کہا تو بابا کریما ہنس پڑا۔

"تو تو کچھ زیادہ ہی گھنا بن رہا ہے...... چل جیسا تو چاہے گا ویسا حل نکال دوں گا، میرا دل آ گیا ہے تجھ پہ۔" ارمان کے دل پہ گھونسا پڑا۔

"بابا جو آپ سمجھ رہے ہیں ویسا کچھ نہیں...... گھر ذرا دور ہے اس لیے ستانے بیٹھ گیا ہوں یہاں...... آپ کو اعتراض ہے تو چلا جاتا ہوں۔" اس کے بے بس لہجے پر کریمے کے دل کو کچھ ہوا۔

"اچھا ناراض نہ ہو بیٹھ جا...... میرا کام ہی یہی ہے۔ ایسے نہ کروں تو کھاؤں کہاں سے۔ چھوڑ یہ بتا تیرا مسئلہ کیا ہے یقین کر اپنا بیٹا اپنا پتر سمجھ کر حل نکالوں گا۔"

ارمان چپ رہا۔

"چل بول بھی دے...... میرا اپنا پتر ہوتا تو میں دیکھتا وہ کیسے مجھ سے کچھ چھپاتا۔" ارمان پریشان تو تانیہ کی غیر حاضری کی وجہ سے تھا لیکن دل پہ گھر والوں کے رویے اور بے روزگاری کے دکھ کا بھی غبار تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی شہر خموشاں میں بابے کریمے کو ایک بت، ایک قبر سمجھ کر اس نے اندر کے سارے دکھ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ چپ کر کے سنتا رہا۔

ماں کی والہانہ محبت کے بعد ترش رویہ، باپ اور بھائی کا اسے بوجھ سمجھنا، منگیتر کا اسے ٹھکرانا...... سب سنا بابا کریمے نے۔ بے خود ہو کر کتنی دیر بولنے کے بعد اب وہ ہچکیوں میں رو رہا تھا۔ ایک تنومند، باہمت نوجوان بابا کریمے کے سامنے بیٹھ کر ہچکیوں میں رو رہا تھا۔

کریمے کو بے ساختہ اس پر بہت پیار آیا۔ فیصلہ کرنے میں اسے ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ اس نے گھٹنوں میں سر دیے بچوں کی طرح روتے ہوئے ارمان کا ماتھا چوم لیا۔

"او پاگل چپ کر روتا...... تجھے نہیں پتا تو تو چلتے ہوئے لوگوں میں سے ہے۔ تیرے ماتھے پہ درخشاں تیری تقدیر دور سے ہی نظر آ جاتی ہے۔" اس نے دزدیدہ نظروں سے کریمے کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو میرا مذاق نہ اڑاؤ۔

"اچھا دیکھ...... کتنے عرصے سے تو خوار ہو رہا ہے؟" ارمان چپ رہا۔

"سونے کو بھٹی میں تپا کر کندن بنایا جاتا ہے اور پھر کندن...... کندن تو خالص سونا ہوتا ہے، ملاوٹ سے پاک...... انسان بھی یوں ہی ہوتا ہے۔ حالات کی بھٹی میں جل کر خاص ہوتا ہے بے غرض اور ریا سے پاک...... اچھا تو چاہتا کیا ہے اب؟ میں تو سوچ ہی لوں گا تیرا فی الحال تو اپنے دل کی بتا۔"

"میں جائز و حلال کمانا چاہتا ہوں...... میں مزدوری بھی کر سکتا ہوں۔" آنکھیں صاف کرتے ہوئے ارمان نے کہا تو کریمے کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"چل میرا پتر گھر جا۔ آج کی رات خوب سوچ بلکہ ایسا کر ہفتہ دس دن خوب اچھی طرح سوچ کہ تو نے کرنا کیا ہے...... میری بہت دعا سلام ہے کہیں نہ کہیں تیرا پکا بندوبست کر دوں گا۔" ارمان نے ناسمجھی سے اثبات میں سر ہلایا۔ بابا کریمے کی تقلید میں وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو آئے گا ناں؟ سچ بتا مجھے۔"

"جی آؤں گا میں......" اللہ حافظ۔ ارمان کو لگا جیسے کسی غیبی طاقت نے اسے وہاں رکنے پر مجبور کیا ہوا تھا۔ قبرستان کے بیچوں بیچ جمیل شاہ دربار کے سامنے چھوٹے سے راستے سے بھاگتا ہوا وہ جی ٹی روڈ کی طرف چلا گیا۔ بابا کریما دھیما دھیما مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

"کتنی دیر ہو گئی ہمیں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے؟" گرین گراس کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے ارمان نے اس سے پوچھا۔

"کم از کم سات سے آٹھ ماہ تو ہو ہی گئے ہوں گے۔"

"اور ان سات آٹھ ماہ میں ہم کتنی بار ملے؟" ارمان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آج تانیہ کا موڈ اچھا ہے اس لیے یوں چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔

"ان گنت بار...... کیوں؟"

"کیوں کا جواب بعد میں...... پہلے یہ بتاؤ ڈے لائٹ میں ہم کتنی بار ملے ہیں؟" اس نے شرارت سے پوچھا تو تانیہ خاموش ہی رہی۔

"بتاؤ بھی...... ویسے میں نے سنا ہے لڑکیوں کی یادداشت بہت گڈ ہوتی ہے۔" تانیہ کا موڈ اچھا ہوتا تو جانے کیوں ارمان وجہ بے وجہ مسکراتا رہتا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔" اس نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

"ایک نمبر کی جھوٹی ہوتی ہیں لڑکیاں...... ہو گیا ثابت آج۔ ایک بار بھی تم مجھے دن میں نہیں ملیں۔" ارمان شوخی سے چلایا۔

"ویسے یہ محض اتفاق ہے یا جان بوجھ کہ تم مجھے شام کے اندھیرے میں ملتی ہو؟" آخر میں اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"جان بوجھ کر......"

آوارگی

اب تو میرا دل چاہتا ہے
کہ کوئی تو ایسا ہو
جو مجھے اپنا بنا لے
میری بانہوں میں اپنے
پیار کی ہتھکڑیاں لگا دے
اور مجھے خود میں قید کر لے
کیونکہ
اب مجھے اپنی
آوارگی اچھی نہیں لگتی

(سیدہ نور العین زاہرہ، تلمبہ)

"وہ کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"کیونکہ میں بہت پیاری ہوں۔ ڈے لائٹ میں تم نے مجھے دیکھا تو مجھے نظر لگا دو گے۔" اس نے مزے سے وجہ بتائی تو ارمان قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"یہ کیوں نہیں کہتی کہ میں ڈر جاؤں گا۔" وہ بھی ہنس پڑی۔
"اچھا اب ایک سیریس بات...... کبھی جب تمہارا موڈ اچھا ہو تو تمہارا رنگ گلابی سفید لگتا ہے۔ جب لیکچر موڈ میں ہوتی ہو تو سانولا لگتا ہے مزید یہ کہ......" ایک لمحہ رک کر اس نے تانیہ کا متغیر ہوتا رنگ اور فق چہرہ دیکھا۔
"تمہیں کیا ہوا؟" مذاق کر رہا تھا میں۔
"چلتی ہوں میں...... پھر ملیں گے۔" اس نے تیزی سے اپنا ہینڈ بیگ موبائل اور عبایا سنبھالا اور زن سے اس کے سامنے سے گزر گئی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے ایسا محسوس کیا تھا لیکن جانے کیوں تانیہ کو اتنا برا لگا۔
وہ حیرت زدہ بیٹھا سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم جمیل شاہ دربار کے راستے پر تھے۔ بابا کریمے نے جانے کون سا جادو پڑھ کر پھونک دیا تھا اس پر ہزار کوششوں کے بعد بھی وہ بابا کریمے کی پیش کش کے بارے میں سوچ نہیں پایا تھا۔ کسی تنویمی عمل کے زیر اثر ایک معمول کی طرح سے چلتا ہوا وہ دربار کے سامنے کچی اینٹوں والے راستے پر تھا۔
"اوہ میرا پتر آ گیا۔" بابا کریما جیسے اس کے ہی انتظار میں تھا۔
"مجھے یقین تھا تو ضرور آئے گا۔ آ بیٹھ جا میرے پاس۔" میلی سی چادر پر وہ بابا کے برابر بیٹھ گیا۔
"کچھ کھائے پیئے گا؟" بابا کریمے کے لہجے میں جوش سا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"اچھا پھر کیا سوچا ہے تو نے؟" وہ کیا بتاتا بس خاموش ہی رہا۔
"اچھا بتا پڑھا لکھا ہے؟" اس نے معمول کی طرح سر ہلا دیا۔
"یار آ گیا ہے تو اب اک احسان اور کر...... یوں خاموش نہ بیٹھ میرا دل آہ زار ہوتا ہے۔" بابا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ جیسے عمل کے حصار سے نکل آیا۔
"اچھا میں بات کرتا ہوں آپ سے کیا پوچھنا ہے آپ نے؟" پھر بابا کریمے نے اس سے اس کی تعلیم اس کے رجحان کا پوچھا۔ ارمان کا خیال تھا۔ بابا کریما پڑھا لکھا نہیں ہوگا پہلے پہل وہ ٹال مٹول کرتا رہا پھر اپنی ڈگریوں کی تفصیل سے لے کر اپنے شوق، اپنی خواہش اور اپنے رجحان کے بارے میں دل کھول کر اس نے کریمے کو بتایا۔
وہ خاموشی سے ارمان کو بولتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کی دلچسپی ارمان کو جوش سے بولتے ہوئے دیکھنے میں تھی سننے میں نہیں اچانک بولتے بولتے ارمان کو احساس ہوا کہ بابا اسے سن نہیں رہا۔
"میں کیوں اس کے پاس آ کر اندر سے کھلنے لگتا ہوں۔" اس نے غصے سے سوچا۔ وہ چپ ہو گیا۔ کریمے کے لیے اس کا بولنا ہی کافی تھا۔
"تم کل آنا۔ تمہارا بندوبست کرتا ہوں۔" لہجے کے ساتھ ساتھ کریمے کے الفاظ بھی بدلے تھے۔ ارمان سر ہلا کر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"پتر اک بات کہوں...... دو بیڑیوں میں پیر نہ رکھ، کہیں کا نہیں رہے گا۔ جو بھی مانتا ہے مجھے دوست، ناصح، دشمن...... کھل کر مان، کھل کر اظہار کر۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر رویہ دل دکھاتا ہے میرا۔" ارمان کو ایک دم شرمندگی کے احساس نے گھیر لیا۔
کچی اینٹوں کی ٹوٹی ہوئی سیڑھی پر بیٹھ کر اس نے

بابا کریمے کے گھٹنوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔
"بابا بہت تکلیف اٹھائی ہے اپنے رشتوں سے میں نے، آپ کی طرف دل خود ہی کھنچا چلا آتا ہے۔ دماغ مخالفت کرتا ہے تو کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کروں۔" کریما سادہ سی ہنسی ہنس دیا۔
"لوگ کہتے ہیں دل پر اعتبار نہ کرو کیونکہ یہ کبھی "رائٹ" پر نہیں ہو سکتا پر میں کہتا ہوں دل نے "لیفٹ" میں ہو کے جو جرم کرنا تھا کر لیا اب وہ کبھی رونگ نہیں ہو سکتا۔ میرا پتر تو دل کی مان۔ اللہ تیرا دل ٹھنڈا اور شاد رکھے۔" اتنی سی بات سے ہی ارمان کا دل اطمینان سے بھر گیا۔ مسکرا کر وہ کریمے کے گلے لگا اور مین روڈ کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

"تمہارا پاکستان جانا ضروری تو نہیں ہے۔ تم کونسا دودھ پیتی بچی ہو جو تمہیں فیملی کی ضرورت ہے۔" ایلس کی خودسوزی کے بعد ونیس کو اس کا وصیت نما خط ملا۔ ایلس چاہتی تھی کہ وہ پاکستان اپنے باپ اور بہن کے پاس چلی جائے۔ ایلس کی موت کو پندرہ دن گزر چکے تھے اب اسے جانے کی تیاری کرتا دیکھ کر جیمز کو غصہ آ رہا تھا۔
"مجھے واقعی ضرورت نہیں محسوس ہوتی فیملی کی لیکن اگر ماما کو یہ لگتا تھا کہ مجھے ان کے بعد اپنی فیملی کے پاس جانا چاہیے تو میں ضرور جاؤں گی۔" ونیس کے قطعی لہجے پر اسے شدید غصہ تھا۔
"اور ہمارا پیار؟ میں پاکستان نہیں آؤں گا۔" ونیس نے اس کی چبھتی ہوئی نظریں خود پہ محسوس کیں۔
"میں نے کبھی نہیں کہا میں تم سے پیار کرتی ہوں اور رہی بات تمہارے پاکستان آنے کی تو تم اپنی زندگی گزارنے میں آزاد ہو۔ میں تم پر دباؤ نہیں ڈالوں گی۔" ونیس لاپروائی سے پیکنگ کرتی رہی۔ جیمز نے غور سے اسے دیکھا۔
آف وائٹ کیپری اور سرخ ٹاپ میں وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔ کندھوں سے ذرا نیچے آتے سلکی بال وہ بار بار سر جھٹک کر کمر پر گرا رہی تھی۔ اس کی سبز کانچ جیسی آنکھیں ایلس پر اور سیاہ ریشمی بال اس کے ایشیائی باپ پر تھے۔ ایلس نے سترہ سال کی عمر میں نے ایک ایشیائی مرد سے شادی کی تھی۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد ایلس نے دو جڑواں بیٹیوں کو جنم دیا۔ انہی دنوں اسے شراب کی لت لگ گئی۔
پاکستانی مرد یہ سب برداشت نہیں کر پا رہا تھا کہ دو بچیوں کی ماں ہو کر اس کی بیوی ان خرافات میں پڑے۔ پھر تنازعہ اتنا بڑھ گیا کہ مزید ایک سال میں طلاق تک نوبت آ پہنچی۔ طلاق کے بعد ایلس نے اپنے امیر کبیر شوہر کی محنت سے کمائی ہوئی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا شروع کر دیا اور ایک بار پھر کنگال ہو کر دست سوال اپنے سابق شوہر کے سامنے دراز کر دیا۔ ایلس کا کہنا تھا کہ اپنی بے وقوفی سے وہ سب کچھ برباد کر چکی ہے اب اپنی بیٹیوں کے لیے چاہتی ہے۔ دوبارہ سب پا لینے کے بعد بھی اس کے رنگ ڈھنگ نہ بدلے تو عدالتی کارروائی سے مجبور ہو کر اسے اپنی ایک بیٹی اس کے باپ کے حوالے کرنی پڑی۔ جسے لے کر وہ پاکستان چلا گیا اور ونیس کے نام پر ٹھیک ٹھاک بینک بیلنس اور جائیداد چھوڑ گیا۔ لیکن اب کی بار ایلس کو وہ موج مستی نصیب نہیں ہوئی جو وہ چاہتی تھی کیونکہ جب تک ونیس اٹھارہ سال کی نہیں ہو جاتی تب تک وہ اس کی پراپرٹی بیچ نہیں سکتی تھی۔
ونیس کی پرورش کے لیے اسے ہر ماہ بینک سے ایک معقول رقم مل جاتی جو ونیس کے لیے تو کافی لیکن اس کے لیے ناکافی تھی۔ جب ونیس اٹھارہ برس کی ہوئی تو اس کا ذہن اس کی عمر سے کافی بڑا ہو گیا ہوا تھا۔
ایلس بیمار رہنے لگی تھی۔ ونیس نے نہ صرف اسے سہارا دیا بلکہ اپنی دولت کو بھی سنبھالا۔ گھر کی بیک پر اس

نے فلاور شاپ کھول لی اور ساتھ ہی ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھی۔ اب تمام مصائب کے خاتمے کا وقت تھا تو ایلیس کا ناتواں سہارا بھی اس سے چھوٹ گیا۔ زندگی کے ابتدائی کٹھن سال بہن اور باپ کے اخلاقی سہارے کے بغیر اس نے کیسے گزارے یہ وہی جانتی تھی۔ تھک کر اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ جیمز کب کا جا چکا تھا۔ اس کا دل چاہا کوئی اس کا اپنا اس کے پاس ہوتا جس کے گلے لگ کر وہ اپنے سارے دکھ رو لیتی۔ مشکل وقت میں جیمز بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

"مام جانتی ہو گی کہ مغربی مرد کی فطرت میں وفا نہیں اسی لیے مجھے پاکستان جانے کا کہا۔" محبت سے اس نے مرحوم ایلس کو یاد کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو بھی تھا آخر وہ اس کی ماں تھی۔

☆☆☆

"میرا ایک جاننے والا ہے، اس نے ہوٹل ریسٹورنٹ بنانا ہے۔" بابا کریے کی بات پر ارمان کو ہنسی آ گئی اس کا جاننے والا اور ہوٹل، ریسٹورنٹ وہ بظاہر توجہ سے سن رہا تھا۔

"وہ زیادہ تر شہر سے باہر ہوتا ہے۔ بہت کام ہیں اس کے، جگہ جگہ پیسہ انویسٹ کیا ہے اس نے...... بول تو کیا کرے گا؟"

"جو کام مل جائے۔"

"شہر کے وسط میں بہت اچھی لوکیشن پر پلاٹ ہے میں تجھے جگہ بتا دوں گا جا کر دیکھ آؤ۔ پھر اس پلاٹ پر کنسٹرکشن کا کام شروع کروانا ہے۔ اپنی مرضی سے بنوانا۔ انجینئر وغیرہ بلوا لینا۔"

ارمان سانس روکے اس کی سن رہا تھا۔

"ہوٹل بننے تک پچیس ہزار ماہانہ دے گا تجھے اور جب بن جائے گا تب تم دونوں کی پارٹنر شپ...... پیسہ اس کا، محنت تیری...... سب کام تجھے اپنی نگرانی میں کروانا ہو گا۔ وہ بھی ایمانداری سے۔" ارمان بے یقینی سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

دربار جمیل شاہ میں قبرستان کے درمیان ایک بوڑھا شخص اس کا مسئلہ چند دنوں میں حل کر دے گا۔ یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اگر کوئی جادوگر بھی اسے یہ کہتا کہ چند دنوں میں اس کا مسئلہ حل کر دے گا تو وہ یقین نہ کرتا۔ کل باتوں باتوں میں اس نے بابا کریے کو بتایا تھا کہ اسے ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں دلچسپی ہے۔ جاب کر کے پیسہ کما کر وہ اپنا ہوٹل بنائے گا اور آج بابا کریے نے اسے اس کے خواب کے اتنا قریب لا کھڑا کیا تھا کہ ایک رات کے فاصلے پر اس کے خواب کی تعبیر مسکرا رہی تھی۔ اس کی طویل خاموشی سے بابا کریے نے اکتا کر اس کا کندھا ہلایا تو وہ ہڑبڑا گیا۔

"گھر جا اور سب کو بتا تیری نوکری لگ گئی ہے۔ ہوٹل کا ذکر نہ کرنا ابھی نہ ہی حصے داری کا پھر دیکھ مزاج بدلتے ہوئے۔" اس نے اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور منہ موڑ کر لیٹ گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ جا سکتا ہے۔

"اچھا سن......" اس نے میلی سی چادر کا کونہ اٹھایا اور نیچے سے میلی کچیلی چٹ نکال کر ارمان کی طرف بڑھا دی۔

"یہ اس کا فون نمبر رکھ لے خود بات کر لے اس سے مصروف ہوتا ہے وہ زیادہ تنگ نہ کرنا۔" ارمان نے چٹ پکڑ کر انگلیوں اور ہتھیلی کے درمیان مضبوطی سے پکڑ لی جیسے سیپ کا موتی یا آنسو ہو جو کسی لمحے بہہ جائے گا۔

"اک منٹ بیٹھے گا؟" اس کے لہجے میں بچوں سا اشتیاق تھا وہ پھر بیٹھ گیا۔

"یہ دنیا اور دولت اندھے کنویں کی طرح ہے جو بھی کرنا ہو اس کے کنارے کنارے رہ کر کرنا جہاں ذرا پیر پھسلا، انسان غرق...... تو ہیرا ہے اپنی قدر پہچان، خود کو ضائع نہ ہونے دینا۔

ایک عرصے بعد ارمان کو اپنا آپ معتبر لگا تھا۔

"مجھے بھولے گا تو نہیں؟" بالوں میں چھپے لمبی لمبی مونچھوں اور داڑھی والے چہرے کو باوجود کوشش کے بھی وہ زیادہ دیر دیکھ نہیں سکا۔

"بابا میں کیوں بھولوں گا آپ کو بھلا۔" اس نے بابا کریے کے پیروں پر اپنا خالی ہاتھ رکھ دیا۔

"پتر جو میں دیکھ رہا ہوں وہ ابھی تجھے نظر نہیں آ رہا۔ جہاں تو نے پہنچنا ہے ناں بے ظرف ہوا تو سب بھول جائے گا۔ ظرف ہوا تو کڑواہٹ پی کر بھی شہد لہجہ بولے گا۔"

بابا کریمہ منہ موڑ کر لیٹ چکا تھا۔ وہ کتنی دیر کھڑا رہا کہ شاید وہ دوبارہ پلٹے لیکن وہ سو چکا تھا۔ ارمان شہر خموشاں سے خاموشی سے نکل آیا۔

زندہ لوگوں سے اسے فیض نہیں ملا اور اب مردوں کی بستی سے وہ جھولی بھرنے والا تھا۔ گھر کے راستے پر قدم رکھتے ہی اس کی سوچوں نے رخ موڑ لیا۔ وہ صبح کا سوچنا چاہتا تھا لیکن اس کا ذہن گھر میں اٹکا ہوا تھا۔

اماں، ابا، فیضان اور فائزہ کا کیا ردعمل ہو گا۔ کہیں یہ سب خواب اک مذاق تو نہیں؟ اس سوچ کے ساتھ ہی ایک بار پھر اس کی سوچ کا زاویہ بدلا۔

"اگر یہ سب جھوٹ ہوا تو میں کبھی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہوں گا...... نہیں نہیں میں گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ روز کی طرح آؤں گا جاؤں گا پھر جو ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔ دل کو ہزار بار مطمئن کر کے بھی وہ غیر مطمئن ہی تھا۔

☆☆☆

پاکستان آتے ہوئے وہ جتنا ڈر رہی تھی یہاں آ کر اسے اتنا ہی اچھا لگا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ نہ ہو اس کا باپ اور بہن اسے پہچاننے سے ہی انکار کر دیں۔ لیکن یہاں سب کچھ اس کی توقع کے برعکس نکلا۔ اس کا باپ نہایت نرم خو، شائستہ اور محبت کرنے والا تھا جبکہ بہن ہو بہو اس کے جیسی تھی۔

ثانیہ کا رنگ وینس سے تھوڑا دبتا ہوا اور آنکھیں خالص سیاہ تھیں اور یہی دونوں میں فرق تھا ورنہ دونوں کا روپ، قد کاٹھ سب ایک جیسا تھا۔ ثانیہ سنجیدہ مزاج اور مذہبی لڑکی تھی۔ مسلمان باپ کی معیت میں عبایا اور اسکارٹ اوڑھتی، پردے کا خاصا اہتمام کرتی تھی۔

شروع شروع دن وینس اپنے مغربی حلیے میں رہی پھر رفتہ رفتہ وہ بھی ثانیہ کی طرح عبایا اور اسکارف اوڑھنے لگی۔ وینس اگرچہ عیسائی تھی لیکن ثانیہ مسلمان تھی۔ وینس پر مذہب کے حوالے سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا البتہ اس کا نام ضرور مسلمانوں والا رکھ دیا گیا۔

ثانیہ اور اس کا مسلمان باپ اسے تانیہ کہہ کر بلاتے تھے۔ تانیہ کو پاکستان آنے سے پہلے ہی اردو پر عبور حاصل تھا۔ وجہ اس کا ایشین سوسائٹی میں اس کے باپ کا وہ گھر تھا جس میں اس نے زندگی کے اکیس سال گزارے تھے۔

ثانیہ کم گو اور بردبار جبکہ تانیہ شوخ چنچل اور باتونی لڑکی تھی۔ تانیہ کو یہاں آ کر بہت اچھا لگا تھا۔ اس کی زندگی میں ماں کی کمی کو باپ کی محبت اور شفقت نے کسی حد تک پورا کر دیا تھا۔ گاہے گاہے وقت نکال کر وہ دونوں بہنوں کو گھمانے لے جاتے۔ تانیہ کو آئے دو تین مہینے ہو گئے تھے۔ تانیہ نے جی بھر کر خریداری کی۔

کپڑے، جوتے، ہینڈ بیگز، ڈیکوریشن پیس...... وہ اور ثانیہ ایک ہی کمرے میں رہ رہے تھے۔ اگرچہ گھر کافی بڑا تھا پھر بھی اپنے بابا کے حکم کی تعمیل میں وہ مشرق مغرب کی طرح ایک کمرے میں رہ رہی تھیں۔

ثانیہ نے کمرے کو اپنی ہی طرح سنجیدگی کا مظہر بنا رکھا تھا۔ تانیہ نے سب سے پہلے کمرے کی سیٹنگ چینج کی۔ پھر اپنی پسند کے مطابق زندگی سے بھرپور بنا دیا کمرے کو۔ ثانیہ کی گھٹی ہوئی طبیعت کے باوجود بھی تانیہ اس سے ہنسی مذاق یا ہلکی پھلکی گفتگو کرتی رہی۔ آہستہ آہستہ ثانیہ بھی اس کی بے سروپا باتوں میں دلچسپی لینے

لگ گئی تھی۔

پھر ایک روز جب تینوں باپ بیٹیاں سیر کے لیے نکلے تو ثانیہ کچھ دیر کے لیے انہیں تنہا چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ واپسی پر اس نے تانیہ کو ارمان کے پاس اسے روکنے کے لیے بھیجا۔ ثانیہ کو ارمان کی طرف اک کشش سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اکثر ارمان سے ملنے جاتی اور جب وہ نہ جا پاتی وہ تانیہ کو بھیج دیتی۔ تانیہ اچھی طرح ثانیہ کے ارمان کے لیے جذبات اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ دوسری طرف ارمان کی تانیہ کے لیے پسندیدگی اور ثانیہ کے لیے ناپسندگی چاہے انجانے میں ہی سہی تانیہ جان چکی تھی اسے نہیں پتا تھا کہ ثانیہ ارمان سے ملتی ہے تو کیا بات کرتی ہے۔

وہ نسبتاً ہلکے پھلکے موضوعات پر بات کرتی کیونکہ وہ ثانیہ کی طرح مشکل الفاظ بول سکتی تھی نہ مشکل جملے ترتیب دے سکتی تھی۔ اپنی نادانی میں اسے پتا ہی نہ چلا کب ارمان اس کا اسیر ہو گیا۔ وہ اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی لیکن ثانیہ کے پیپرز ہو رہے تھے سو اسے جانا پڑتا تھا۔

ثانیہ کو وہ منع کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک دو بار اس نے طبیعت خرابی کا بہانہ بھی کیا لیکن ثانیہ سنی ان سنی کر گئی تھی۔ بستر پر لیٹی ثانیہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ دل و دماغ میں ارمان...... ثانیہ...... ثانیہ...... ارمان کی تکرار جاری تھی۔ جانے کس پہر وہ نیند کی پرسکون وادی میں اتر گئی۔

☆☆☆

صبح کے انتظار میں اس کی رات بہت مشکل سے کٹی تھی۔ فائزہ نے سرخ متورم آنکھوں کا سبب پوچھا بھی تو وہ ٹال گیا۔ وہ کیا بتاتا کہ جو خواب اک عرصے سے اس کی آنکھوں میں تھے تعبیر بننے کو بے قرار ہیں۔ فون پر اس کی ملک صاحب سے بات ہو گئی تھی۔ نہار منہ گھر سے نکل کر سب سے پہلے وہ جگہ دیکھ کر آیا۔ پھر فون پر ہی ملک صاحب سے تبادلہ خیال کیا۔

ملک صاحب نے اسے کام کے تمام اختیارات سونپ دیئے تھے۔ پہلے ہی دن صبح سے شام تک مختلف لوگوں سے ملتا ملاتا رہا۔ شام کو تانیہ کا انتظار کرتا رہا۔ وہ نہیں آئی تو بابا کریمے کے پاس چل دیا۔

ملک صاحب نے اس کے بارے میں کریمے کو صرف اتنا کہا تھا "لڑکا محنتی ہے۔ ایماندار ہو تو اک دنیا فتح کرنے کے لیے تیار ہے۔"

اتنی سی بات نے ہی ارمان کا ڈھیروں خون بڑھا دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی ذمہ داری بھی بڑھا دی تھی۔ اس نے پوری ایمانداری اور لگن سے کام کرنے کا سوچا تھا۔ اپنا آپ ثابت کرنے اور اپنی پہچان بنانے کے لیے اسے ایک موقع، ایک پلیٹ فارم چاہیے تھا جو قسمت اسے بابا کریمے کے توسط سے مہیا کر رہی تھی۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ قسمت ایک دم سے اس پر اس طرح مہربان ہو سکتی ہے۔ کتنی دیر وہ بابا کریمے کے پاؤں دباتا رہا پھر جب وہ سو گیا تو خاموشی سے وہاں سے اٹھ گیا۔ دل چاہ رہا تھا اڑ کر گھر چلا جائے اور فائزہ کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری سنائے۔

اسے ابھی یہ نہیں پتا تھا کہ خوشخبری تو ابھی اس کے لیے بھی سرپرائز ہے۔ چلتے چلتے یونہی وہ مینار والی مسجد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ سڑک پر اکا دکا لوگ تھے مسجد کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا شکرانے کے نوافل ادا کر لے۔ مسجد میں اس نے عشاء اور نوافل ادا کیے اور کتنی ہی دیر رب کائنات کا شکر ادا کرتا رہا۔

جب وہ کچھ چھین لیتا ہے تو ہم شکوہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں لیکن جب وہ کچھ عطا کرتا ہے تو ہمارا فرض نہیں کہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ اس کا دل سکون کی گہرائی میں اتر گیا۔ سجدے کی حالت میں ہی وہ سو گیا۔

☆☆☆

"کہاں تھے؟ اتنے لیٹ کیوں ہو گئے؟" مسجد میں پڑے پڑے وہ سو گیا تو امام نے اسے مسافر سمجھ کر سونے دیا۔ جب وہ اٹھا تو کافی وقت گزر چکا تھا۔ اب رات کا ایک بجنے والا تھا اور فائزہ کے علاوہ اس کا کوئی انتظار نہیں کر رہا تھا۔

"مسجد میں گیا تو وہیں پڑا پڑا سو گیا۔" پرسوچ انداز میں پیڑھے پر بیٹھے ہوئے ارمان نے کہا تو رکابی میں سالن ڈالتی فائزہ نے ایک لمحے کے لیے رک کر اسے دیکھا۔

"میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی۔" کھانے کی ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے بظاہر عام سے لہجے میں کہتی فائزہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ جبکہ حیران تو وہ بہت تھی۔ ان کے گھر میں مرد حضرات عید کی عید مسجد جایا کرتے تھے۔

"پریشانی کے دن تو اب سمجھو ختم ہو گئے۔" ایک عرصے بعد اس نے تسلی سے کھانا کھایا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا فائزہ کو سب بتا دے لیکن پھر مصلحت آڑے آ جاتی۔ اک فائزہ ہی تو تھی جسے وہ سب کہہ لیا کرتا تھا۔ سونے سے پہلے اختصار سے کام لیتے ہوئے کافی حد تک اس نے فائزہ کو بات بتا دی تھی۔ پارٹنر شپ والا قصہ گول کر کے اس نے کم و بیش من و عن فائزہ سے ساری بات کر لی تھی۔

فائزہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ فائزہ کی کیفیت سے انجان نہیں تھا۔ حیرت کی یہ منزل اس کی راہ میں بھی آئی تھی۔ آج رات وہ اکیلا جاگنے والا نہیں تھا۔ فائزہ کی آنکھوں سے بھی نیند اڑ چکی تھی۔ اس نے ارمان کو مشورہ بھی دیا تھا کہ گھر بات کر لے لیکن ارمان سب کچھ کنفرم کر کے بات کھولنا چاہتا تھا۔

زندگی نے ماں باپ کی لعل و جواہر سے قیمتی محبت دے کر بلا جواز ہی چھین لی تھی۔ اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ بوڑھی ماں اور کمزور باپ کو پھر سے خواب دکھائے۔ وہ خواب جو پورے ہی نہیں ہوئے۔ اب اسے خواب نہیں تعبیریں چاہیے تھیں۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے ماں باپ اور فائزہ کے لیے۔ شاید تانیہ کے لیے بھی اس رات دیر سے ہی سہی لیکن وہ بڑی پرسکون نیند سویا۔ سونے سے کچھ دیر پہلے تک اس کی آنکھوں میں تانیہ کا چہرہ تھا۔

☆☆☆

"کیا......؟ ...... پچیس...... پچیس ہزار......" اماں کے ہاتھ سے ہزار ہزار کے پچیس نوٹ پھسل کر میلے کچیلے بستر پر جا گرے۔ اماں کے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی کپکپا رہی تھی۔

"کہاں سے آئے اتنے پیسے......؟" اماں کے حواس تھوڑے بحال ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے بستر پر پھیلے نوٹ سمیٹے۔ ان کے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔ شاید یہ ان کی زندگی میں پہلا موقع تھا جب انہوں نے اتنے پیسے ایک ساتھ دیکھے تھے۔

"اماں میری نوکری لگ گئی ہے...... فی الحال پکی نوکری تو نہیں پھر بھی جتنا وقت گزر جائے وہی سہی۔" بہرحال یہ ایک مہینے کی ایڈوانس تنخواہ ہے۔

"ارمان اماں کے پاؤں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ فائزہ رات کے لیے بستر بچھا رہی تھی۔ لیکن اس کا ذہن پوری طرح اماں اور ارمان کی طرف لگا ہوا تھا۔ فیضان اور ابا ابھی آئے نہیں تھے۔ آج بہت عرصے بعد ارمان رات کو اتنی جلدی گھر آیا تھا ورنہ اب تو ایک عرصہ ہوا اس نے وقت کی فکر کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"نوکری پکی کیوں نہیں ہے......؟" اسے لگا تھا اماں پوچھیں گی کام کیا ہے......؟ لیکن وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"اماں یہ تو مالکوں کو پتا ہو...... کام ٹھیک ہوا تو نوکری بھی پکی ہو جائے گی اور تنخواہ بھی زیادہ ہو جائے

گی۔'' تنخواہ بڑھنے کے نام سے اماں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ہاں تو پورے دھیان سے کام کرنا۔ مالک جیسا کہیں ویسا کرنا۔'' اماں کا پورا دھیان ہاتھ میں دبے نوٹوں کی طرف تھا ورنہ ارمان کا دھواں ہوتا چہرہ ضرور دیکھ لیتیں۔

''کوشش کروں گا اماں۔'' بے دلی سے کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

''فائزہ اسے دودھ میں شکر ڈال کر دے دے یا ایسا کر...... چل اچھا کھانا دے دے اسے۔ باقی میں اٹھ کر دیکھتی ہوں۔'' اماں کی کایا پلٹ ارمان اور فائزہ کے لیے غیر متوقع تو نہیں البتہ تکلیف دہ ضرور تھی۔ اماں بے یقینی کی کیفیت میں ہاتھ دوپٹے میں چھپا کر بیٹھی تھیں۔ فائزہ نے بستر پہ تکیہ رکھا اور تاسف بھری نظروں سے اماں کی طرف دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

بابا کریمے نے تو ارمان کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ اکھڑ مزاج فیضان اب مودب اور فرمانبردار بھائی کے روپ میں ڈھل چکا تھا۔ وجہ ملک عبدالمطلب کی ارمان کو دی جانے والی بائیک تھی جو وقتاً فوقتاً فیضان کے تصرف میں بھی آجاتی تھی۔

اماں اب اٹھتے بیٹھتے اس کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں۔

''میں تو پہلے ہی کہتی تھی میرا بیٹا میرے سارے ارمان پورے کرے گا۔'' ارمان دل ہی دل میں ہنس پڑتا۔ اب رشنا کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ میرا کوئی بڑا بھائی ارمان بھی ہے۔ کسی سہیلی کے گھر جانا ہو، کچھ بازار سے منگوانا ہو یا نئے کپڑوں کی فرمائش کرنی ہو۔ بھاگی بھاگی ارمان کے پاس آتی۔ اماں ابا کے جھگڑوں میں بھی کمی آگئی تھی۔ صرف فائزہ تھی جو پہلے جیسی ہی تھی۔

چند مہینوں میں ہی گھر اور گھر والوں نے یوں روپ بدلا کہ دور نزدیک کے رشتے دار بھی ان کی کایا پلٹ پہ حیران تھے۔ شاہین کی شادی ہوگئی ہوئی تھی۔ ابا تایا شاہین سے چھوٹی فرحین کا ارمان کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہتے تھے۔ اماں نے سختی سے انکار بھجوا دیا تھا جس پر تایا برہم تھے۔

ابا کو بڑی سخت سست سنائی تھیں لیکن اب تو ابا کی بھی تو رہی نرالی تھی۔ سب ویسا ہو رہا تھا جیسا ارمان چاہتا تھا لیکن زندگی کے حقیقی رنگ دیکھ لینے کے بعد شاید ہی کوئی ہو جو دنیا کی رنگینی میں کھونا چاہے۔

زندگی کے کٹھن سال اس نے فائزہ کی اخلاقی سپورٹ کے سہارے گزار لیے ورنہ کب کا راہ بھٹک چکا ہوتا۔

ملک صاحب بیرون ملک چلے گئے تھے۔ اس لیے ہوٹل کا کام ٹھنڈا پڑ گیا تھا ورنہ اب تک تو ہوٹل شروع ہو چکا ہوتا۔

ملک صاحب بھی عجیب انسان تھے۔ جن دنوں وہ گھر میں فارغ بیٹھا تھا ان دنوں میں بھی اسے تنخواہ کے پیسے بینک کے ذریعے بھیجتے رہے۔ ارمان کا مطمع نظر تنخواہ نہیں ہوٹل کی تکمیل تھا۔ وہ جی جان سے محنت میں لگا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا جب ہوٹل کا افتتاح ہو تو تانیہ اس کے ساتھ ہو۔

تانیہ کو اس نے اپنی جاب یا اس کی نوعیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ تانیہ کو افتتاح والے دن پرپوز کرے اور شام کی پری کو دن کے اجالے میں لے آئے۔ ویسے بھی وہ اسے یہ گڈ نیوز خوشگوار موڈ میں دینا چاہتا تھا۔

جبکہ پچھلے کافی عرصے سے تانیہ اپنے خول سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس کا وہی تپ چڑھانے والا سنجیدہ کٹھور رویہ اور اکھڑ سا مزاج ارمان کو ہمیشہ بے تکلف ہونے سے روکتا تھا۔ ارمان اسے ملنے جاتا تو بائیک کہیں دور

کھڑی کر دیتا۔ اس کی خواہش تھی جب تانیہ کا موڈ اچھا ہو تو وہ اسے اپنی کامیابی کا بتائے۔

دوسرے لفظوں میں وہ تانیہ کی غیر موجودگی چاہ رہا تھا۔ لیکن انسان پھر انسان ہے جتنا بھی سوچ لے۔ جتنے بھی ارادے باندھ لے لوح پر لکھی ہوئی تقدیر نہیں بدل سکتا۔

☆☆☆

''فائزہ دعا کرنا آج خصوصی...... نماز کے بعد یسین بھی پڑھنا۔'' ارمان کو جب سے ہوٹل والی مصروفیت ملی تھی وہ اللہ کا شکر ادا کرتا نہ تھکتا تھا۔ پانچوں وقت نماز پڑھتا اور کبھی کبھی تو تہجد کے وقت بھی خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر شکر ادا کرتا۔

''آج ملک صاحب ہوٹل آئیں گے پہلی بار آنا ہے اور کل افتتاح ہے، میرا دل ڈر رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ پر بھروسہ کرو۔ تم نے کسی کا غلط نہیں سوچا تو اللہ تمہارے ساتھ نہ کچھ غلط کرے گا اور نہ غلط ہونے دے گا۔ فائزہ کی نرم آواز بھی اسے سکون نہ دے سکی۔ بے چین دل کے ساتھ اس نے فجر ادا کی اور پھر جمیل شاہ دربار کی طرف چل پڑا۔

اتنی ڈھیر مصروفیت کے بعد بھی ہر شام وہ تانیہ اور ہر رات بابا کریمے کے لیے وقت نکالنا نہیں بھولتا تھا۔ آج جی اداس تھا اور طبیعت بے چین اس لیے صبح ہی صبح قبرستان چلا آیا۔

بابا کریمہ اپنی میل خوردہ چادر پر کروٹ لے کر لیٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔ ارمان کو لگا تھا وہ حیران ہوگا لیکن وہ تو ایسے مسکرا مسکرا کر استقبال کر رہا تھا جیسے اسے ارمان کے آنے کا الہام ہوا ہو۔

''بابا آج طبیعت بہت بے چین ہے۔'' سلام دعا کے بعد وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

''کوئی پریشانی؟''

''نہیں بابا''

کوئی مسئلہ ہے تو پتر بتا دے...... میرے پاس ایک کروڑ حل موجود ہیں۔ اسے بے ساختہ بابا کریمے پر پیار آیا۔

''نہیں ناں...... کوئی مسئلہ نہیں بس یونہی اداسی اور بے چینی سی ہے۔'' اس نے قبر کے کتبے سے ٹیک لگا لی۔ کوئی اور حالات ہوتے تو وہ قبرستان کا رخ تک نہ کرتا اس وقت یہ بابا کریمے کی ذات تھی جس کی کشش میں وہ ہر ڈر، ہر خوف بھلا کر وہاں بیٹھا تھا۔

''کوئی تو وجہ ہوگی پتر جی......''

''وجہ تو کوئی نہیں بس...... سمجھ نہیں آ رہا...... یوں لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے...... کچھ ایسا جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں...... دل کو سکون نہیں مل رہا۔'' وہ بے بسی سے بولتا ہوا مٹی کرید رہا تھا۔

''ہر بات کی، ہر احساس کی وجہ ہوتی ہے...... وجہ ڈھونڈ لو تو بے چینی آدھی کم ہو جاتی ہے...... اور دوسری بات...... کائنات میں ہر لحظہ کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے......'' بابا کریمے نے منہ آسمان کی طرف اٹھا کر شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔

''ہمیں کچھ پتا ہو یا نہ ہو اسے سب پتا ہوتا ہے...... اسے پتا ہے وقت کی ضرورت کیا ہے...... کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے...... تمہیں پتا ہے......'' بولتے بولتے بابا سانس لینے کو رکا۔

''بعض اوقات ہمیں لگتا ہے جو ہوا وہ بہت غلط ہوا ہے۔ حالانکہ اگر ہونی نہ ہو تو یہ جو رب تعالیٰ کا ایک سرکٹ ہے ناں...... اس میں ایک ہونی رکنے سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ''ہونیاں'' رکنی پڑیں...... تم دردر نہ بھٹکتے تو تمہیں اس دنیا کا حقیقی چہرہ کیسے نظر آتا؟ مخلص اور بے لوث محبت کا مزہ کیسے چکھتے...... یہ اللہ کے کام ہیں انہیں اس پر ہی چھوڑ دو...... وہ جو کرے گا اچھا کرے گا۔ وہ بہتر کارساز

ہے۔" ارمان بابا کریمے کی باتیں دھیان لگا کر سن رہا تھا۔ دل تھا کہ بے چین ہی تھا۔

"بابا دل نہیں مان رہا میرا......" وہ رو دینے کو تھا۔

ایک بار ایک آدمی کا آپریشن ہو رہا تھا تو ایک بچے نے فون کر کے پولیس کو بلا لیا۔ بچہ کہہ رہا تھا چار چھے لوگوں نے چھری چاقو سے ایک آدمی کاٹ ڈالا۔ اب اس بچے کو کون سمجھائے کہ یہ تو اس شخص کے بھلے کے لیے ہی ہے۔ کاٹنے کاٹنے میں فرق ہوتا ہے اور یہ جو دل ہوتا ہے ناں کریمے نے اپنا دایاں ہاتھ نیم دراز ارمان کے سینے پر بائیں جانب عین دل کے مقام پر رکھ دیا۔ یہ بھی بچہ ہوتا ہے...... اسے بھلے برے کا پتا نہیں چلتا۔ پھر یہ جو اوپر ڈاکٹر ہے ناں...... یہ جانتا ہے کب کیا کاٹنا ہے...... دل بچے کی طرح واویلا مچاتا رہے گا۔ اس کا تو کام ہی یہی ہے۔ ارمان آہستگی سے مسکرا دیا۔

"بابا مجھ میں کچھ کھونے کا حوصلہ نہیں ہے۔" اس نے بے چارگی سے کہا تو بابا کریمے نے اپنا ہاتھ شفقت سے اس کے سر پر پھیرا۔

"جب اللہ تعالیٰ کی ذات نے تجھے کچھ عطا کیا تو اس وقت تو نے کہا تھا کہ اللہ مجھے عطا نہ کر میں لوٹا نہ سکوں گا۔" ارمان چپ رہا۔

جو پیسہ جو مقام تجھے ملے گا وہ تیرا نہیں ہو گا...... تجھے وہ آگے دینا ہے...... جیسے تجھے کوئی دے رہا ہے...... جہاں تو دینے کا عمل روکے گا اسی جگہ تجھے ملنے کا عمل بھی رک جائے گا...... پاگل دینے سے نہ ڈر" ارمان کو پتا بھی نہ چلا اور ڈھیروں سکون اس کے دل میں اتر گیا۔

"بابا دعا کرنا میرے لیے۔"

"کیا چاہیے میرے پتر کو...... سچ سچ بتا دے اب۔" وہ دل کھول کر ہنسا۔

"بابا میری ایک دوست ہے...... ہے تو اجنبی پر......" وہ ہچکچا رہا تھا۔ اس کی نیچی نظریں بوڑھی آنکھوں میں اترتی کھبر نہ دیکھ سکیں۔

"پھر......" کریم بہ مشکل بولا تھا۔

"بہت اچھی فطرت کی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ ایک ہی سانس میں بول گیا۔ کریمے کے دل سے ہوک نکلی۔

"اللہ پاک بہتر کرے سب۔" ٹوٹے لفظوں میں اس نے ارمان کو دعا دی۔

"آج رات میں اسے پوچھوں گا۔ ابھی پوچھا نہیں اسے...... بابا دعا کرنا تانیہ مان جائے۔" تانیہ کے نام پر کریمہ چونک پڑا۔

ارمان سے اس کا حلیہ اس کی باتیں پوچھیں اور پھر یکدم اس کا چہرہ تاریکی میں بھی چمکنے لگا۔ اس نے ارمان کو صرف محبت اور انس کی وجہ سے اونچے مقام پر دیکھنا چاہا تھا۔ پھر جانے کب اور کیوں وہ ارمان اور تانیہ کو ساتھ دیکھنے کے خواب دیکھنے لگا۔

تانیہ اس کی سگی بیٹی تھی۔ ارمان اس بات کو جانتا تک نہیں تھا۔ کریمے کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی پھر بھی وقت گزاری کے لیے اس نے پولیس فورس جوائن کر لی تھی اور اب منشیات فروش گروہ کو پکڑنے کے لیے بھیس بدل کر قبرستان میں سال ڈیڑھ سال سے بیٹھا تھا۔ گروہ پکڑے جانے کے بعد ارمان کی خاطر وہ یہاں تھا۔ اس کی سوچ اچھی تھی سو اللہ تعالیٰ نے اسے پھل بھی اچھا ہی دیا تھا۔

ارمان سے وہ بات کرتے گھبرا رہا تھا کہ کہیں وہ احسانات کا بدلہ اتارنے کے لیے نہ حامی بھر لے لیکن اب...... اللہ عزوجل نے اسے بیٹی کی خوشی تحفے میں عطا کی تھی۔ ارمان کی صورت میں وہ تانیہ کے دکھوں اور محرومی کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ جس کا اللہ تعالیٰ نے اسے بھرپور موقع دیا تھا۔

☆☆☆

افسانہ

خواب ہوئے عذاب

جویریہ ملک

ہمیشہ ویسا نہیں ہوتا جیسا انسان چاہتا ہے
بے صدا سی زندگی میں اسے کبھی خوشیوں کی آہٹ
سنائی نہیں دی تھی۔ امید کی راہ گزر پر وہ بارہا
اپنے مقام سے گری مگر کبھی سکون نصیب نہ ہو سکا۔

ایک حرماں نصیب کی داستان جس کے لیے خوشیاں سراب بن کر رہ گئی تھی

سردی اپنے عروج پر تھی...... حویلی کے سب لوگ اپنے کمروں میں جا کر سو چکے تھے۔ مگر ایک ہستی ایسی بھی تھی کہ جس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ان دنوں اس پر ایک ہی خبط سوار تھا جاگتی آنکھوں سے سپنے دیکھنے کا...... ہواؤں کے دوش پر اڑنے کا...... خیالوں میں کسی کے مضبوط گرفت میں سما جانے کا۔

اس نے تو کبھی سوتے میں خواب نہ دیکھے ہوں گے۔ مگر جاگتے میں خواب دیکھنے میں جو لذت اور سکون

ملتا تھا۔ اس کا اسے شاید پہلے اندازہ نہ تھا۔

یہ سب کیا تھا......؟ کیوں تھا......؟ یہ سب سوچنے کا اس کے پاس وقت نہ تھا۔ وہ پورے چوبیس سال کی ہو چکی تھی۔ زندگی ان دنوں بے حد پرسکون اور دلچسپ ہو گئی تھی...... کہ اچانک...... اس کا سکھ چین نیند...... سپنے ہوش وحواس غارت ہو کر رہ گئے۔ وہ اکیلے میں گھبراتی اور سوتے میں ڈر کر اٹھ جاتی۔

دو آنکھیں جو بڑی گہری چمکیلی اور سیاہ تھیں جو ہر پل ہر لحہ اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھیں۔ وہ کہیں بھی ہوتی۔ وہی دو آنکھیں اسے گھورتی رہتیں......

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب اس پر خوف کا شدید ترین دورہ پڑا۔ ان ہی دو آنکھوں کی سیاہ چمک نے اس کا دل اپنی گرفت میں بھینچ لیا۔

''بی بی ماں ہم آپ کے ساتھ سوئیں گے......''

وہ بغیر اجازت ہی بی بی ماں کے سرخ مخملیں لحاف میں گھس کر دبک گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں اب بھی اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ سیاہ چمکتی اور گھورتی ہوئی آنکھیں......

''تم کانپ رہی ہو نورالعین......''

بی بی ماں کی آواز میں ممتا سے کہیں زیادہ رعب تھا۔

''ہاں...... جی...... ہاں...... نہیں بی بی ماں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ابھی تم جواب دینے کی حالت میں نہیں ہو...... سو جاؤ۔'' بی بی ماں نے لحاف اس کے سینے تک اوڑھا کر سونے کی تلقین کی۔

''شکریہ......'' اس کا دل فرط جذبات سے بھر گیا۔ اپنی آنکھیں بھر آئیں تو ان دو آنکھوں کی چمک اور بھی گہری نظر آنے لگی۔

☆☆☆

وہ ہنستے ہنستے کھو جاتی۔ بولتے بولتے سہم جاتی۔ کھیلتے کھیلتے بیٹھ جاتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی۔ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ جو پورے خاندان کی ناک تھی۔

''کیا بات ہے نورالعین! ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ بے حد گھبرائی گھبرائی سی رہنے لگی ہیں......؟'' اس کی کزن سلمٰی جو اس کی دوست بھی تھی۔ یہ سب دیکھ کر خاموش نہ رہ سکی۔

''نہیں...... نہیں تو...... ہم کب گھبرائے......؟'' نورالعین کا دل پوری شدت سے دھڑکا۔

''کل آپ کی سالگرہ ہے۔ آپ کو یاد ہے ناں......!'' بی بی ماں نے بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ آپ اپنے لباس کا انتخاب کر لیں۔ یہ بی بی کا حکم ہے۔

سلمٰی جان بوجھ کر اپنے سوال کو نظر انداز کر گئی۔ شاید وہ جان گئی تھی کہ نورالعین حد سے زیادہ پریشان ہے۔ سفید لباس میں حوروں ایسے تقدس والی نورالعین اتنے لوگوں میں گھری ہو کر بھی اپنے آپ کو بالکل تنہا اور غیر محفوظ پا رہی تھی۔ اس کی ہر حرکت سے عیاں ہو رہا تھا کہ وہ بے حد خوفزدہ ہے اور یہ حقیقت بھی تھی۔ دو آنکھیں بڑی بے قراری سے اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

''شاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں نورالعین۔ بہتر ہے آپ اندر جا کر تھوڑی دیر آرام کریں۔''

لوگوں کا ہجوم ذرا کم ہوتو سلمٰی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ہوش کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔

تب وہ دونوں سلمٰی کے کمرے میں چلی آئیں...... سامنے ہی کارنس پر رکھی شاہ زیب کی تصویر بڑی خوبصورت مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے اسے تک رہی تھی۔ جیسے اسے تحفظ کا یقین دلا رہی ہو۔ تب وہ کافی حد تک سنبھل گئی۔

شاہ زیب جو اس کا پیار تھا۔ جو اس کا کزن تھا۔ اس کی جگری دوست سلمٰی کا بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا ہونے والا شریک حیات بھی تھا۔ ہم سفر تھا اس کے خوابوں کا، خیالوں کا۔

پورے خاندان میں اس کے اور شاہ زیب کے جوڑ کا جوڑا نہ تھا۔ ان دونوں کے پیار جیسا پیار نہ تھا۔ حسن نہ تھا، جب تین سال قبل ان دونوں کی منگنی کی رسم ادا کی گئی تھی تو شاہ زیب کس قدر خوش تھا۔

''نورالعین جانم......!'' وہ خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

گلابی زرتار سوٹ میں بڑا سا دوپٹہ سر پر ڈالے وہ بھی عمر کی ان منزلوں پر تھی۔ جب اس کا دل چاہتا تھا کہ اسے پر لگ جائیں اور وہ ہر پل شازہ زیب کے سنگ اڑتی پھرے۔

''اتنا سارا حسن کہاں سے چرایا تھا آپ نے......؟''

سنہری سنہری آنکھوں والا شاہ زیب بے قدر نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''آپ ہمیں بھول تو نہیں جائیں گے......؟ وہاں جا کر......'' نورالعین کا وہم زبان پر آ گیا۔

''سنا ہے وہاں کی لڑکیاں بے حد حسین ہوتی ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں ستارے چمک اٹھے۔

''نہیں جان...... ایسا نہیں کہتے۔'' شازہ زیب نے شدت سے اسے اپنے آپ میں بھینچا تھا۔ کتنی شدتیں تھیں ان دلوں میں...... نورالعین کا دل بے قرار ہونے لگا۔

☆☆☆

پھر شازہ زیب اپنی تعلیم مکمل کرنے انگلینڈ چلا گیا...... حویلی اداس ہو گئی۔ ہر شے پر بھی اداسیاں چھا گئیں نورالعین کا دل ویرانیوں کا مسکن بننے لگا۔ تب شازہ زیب نے بے حد چپکے سے اسے اپنا حال دل لکھنا شروع کیا...... وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑنے لگا...... حویلی کی رونقیں لوٹ آئیں۔ نوجوان پارٹی اپنے سپنوں میں جھوم رہی تھی۔ بی بی ماں اپنے گلستان کے پھولوں کی مہکار و رنگ سے بے حد خوش تھیں۔

ان دنوں جب نورالعین، سلمٰی، صائمہ، زیب، شینو، وقار، آفاق اور وہاب وغیرہ ان کے کمرے میں ان کے مخملیں لحاف میں گھس کر خشک میوے کھاتے ہوئے ان سے پرانے قصے کہانیاں سننے کی فرمائش کرتے تو انہیں سنہری سنہری شریر آنکھوں والا شاہ زیب بے حد یاد آتا۔

قصے سنانا تو صرف بہانہ ہوتا تھا۔ مقصد ایک دوسرے کو تنگ کر کے سرخ ہوتے ہوئے چہروں کا رنگ آنکھوں میں بھرنا ہوتا تھا۔ وہ جوانی کے اس کھیل کو اچھی طرح جانتی تھیں...... وہ سب جانتی تھیں کہ اس عمر میں شرمیلی مسکراہٹیں اور چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی آنکھیں کیا چاہتی ہیں اور پھر وہ مناسب وقت پر ان خوبصورت پھولوں کو رنگوں اور خوشبو کی مناسبت سے یکجا بھی کر دیتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آج تک کبھی کسی نے ان کے اعتماد کو دھوکہ نہ دیا تھا۔

وہ بے حد خوش رہنا چاہتی تھیں اتنا خوش کہ زندگی کی کوئی کڑواہٹ انہیں یاد نہ رہے۔

☆☆☆

کشمیری چائے کا دور جاری تھا۔ چلغوزوں اور مونگ پھلیوں سے جیبیں بھر بھر کر ایک دوسرے کو ستایا جا رہا تھا...... گلابی جاڑوں کی راتیں کس قدر دلکش ہوا کرتی ہیں۔ بی بی ماں بچوں کی دھینگا مشتی اور شرارتوں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ چائے کا بھرا ہوا سفید چینی کا پیالہ دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں تھا۔

''چلیے نورالعین! ہم بھی بی بی ماں کے پاس چلیں۔'' سلمٰی کا دل آفاق قیصر کی قربتوں کے لیے مچل مچل جا رہا تھا۔ مگر وہ کسی صورت یہ راز کسی پر آشکار ہونے نہ دینا چاہتی تھی۔

''بی بی ماں کا تو بہانہ ہے جان من! یوں کہو کہ تم آفاق کی بلندیوں کو چھونا چاہتی ہو۔''

نورالعین کے لب شرارت کے بوجھ سے عنابی ہو گئے۔

"بہت بدتمیز ہیں آپ...... ہم نے ایسا کب کہا بھلا۔" سلمٰی راز کھل جانے پر شرم سے گلابی ہوگئی۔

"سلمٰی! آپ چلی جائیں ہم نہیں جا پائیں گے وہاں......"

نورالعین ایک دم زرد سی ہوگئی۔ جیسے کسی چیز نے اس کا دم نچوڑ لیا ہو۔

"کیا بات نورالعین! آپ ایسے ایک دم ہی اکھڑ کیوں جاتی ہیں...... ایک بار نہیں بار بار نوٹ کیا ہے ہم نے کہ آپ عجیب وغریب سی حرکتیں کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ جیسے کہ کسی سے ایک دم خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ ایسا کیوں......؟" سلمٰی نے جو اتنے دنوں سے جو بات سوچ کر رہ جاتی تھی۔ آج پوچھ لی تھی۔

"یہ سچ ہے سلمٰی کہ ہم بے حد خوفزدہ ہیں۔" نورالعین نے اپنا بدن کرسی پر ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں میچتے ہوئے اقرار کیا۔

"کس شے سے خوفزدہ ہیں آخر......؟" سلمٰی نے اس کی پیلی پڑتی رنگت کو غور سے دیکھا۔

"سلمٰی! اگر یہی حال رہا تو ہم یقیناً پاگل ہو جائیں گے۔ اگر ان دو آنکھوں نے میرا تعاقب نہ چھوڑا تو ہم دیوانوں کی طرح چیخیں گے۔ چلائیں گے۔" نورالعین پوری شدت سے کانپ رہی تھی۔

"کیسی آنکھیں...... کن آنکھوں نے آپ کو اس قدر پریشان کیا ہوا ہے جان سلمٰی...... بتاؤ تو......؟" سلمٰی نے بھائی کی امانت کو یوں پریشان دیکھا تو بے حد گھبرا اٹھی۔

"جاننا چاہتی ہو کہ یہ آنکھیں کس کی ہیں تو غور سے سنو۔" نورالعین نے شدت خوف اور غم سے اپنی پوری آنکھیں کھول کر سلمٰی کی طرف دیکھا۔

"وہ ہر پل ہمیں گھورتی سیاہ چمکیلی گہری گہری...... ہر پل ہمارا تعاقب کرتی دو آنکھیں ہمایوں خان کی ہیں۔ ہمایوں خان کی......" نورالعین نے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیں۔

"ہمایوں خان...... کی......"

سلمٰی کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔ مارے حیرت اور خوف کے جیسے کسی نے اس کے بدن کا سارا خون نچوڑ دیا ہو۔

"یہ آپ کا وہم بھی تو ہو سکتا ہے نورالعین......!" اس نے جیسے ڈوبتے میں تنکے کا سہارا مانگا۔

"ہاں بالکل ٹھیک کہا تم نے سلمٰی! ہم بھی یہی سمجھتے تھے مگر......" نورالعین کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ عنابی ہونٹوں پر پپڑیاں سی جمی تھیں۔

"مگر کیا...... ہوا...... نورالعین خدارا بتاؤ تو......" سلمٰی کی جان جیسے لبوں پر اٹکی تھی۔

"ہم بہت دنوں سے نظر انداز کر رہے تھے ان کی آنکھوں کی شدت کو اور شاید ہمیشہ کرتے رہتے...... مگر کل رات جب ہم بی بی ماں کے کمرے سے واپس لوٹ رہے تھے تو وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا...... سلمٰی...... ہم نے اسے نظر انداز کر کے گزر جانا چاہا لیکن......"

نورالعین نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا کہا اس نے نورالعین......؟" سلمٰی کی بے قراری قابل دید تھی۔

"تب اس نے ہمیں پکارا......" نورالعین جیسے خواب سے بول رہی تھی۔

"نورالعین......" ہمایوں خان کی آواز میں غراہٹ تھی۔

"جی" نہ چاہتے ہوئے بھی نورالعین کے قدم واپس پلٹ گئے۔

"ادھر آؤ...... یہاں ہمارے پاس......" سیاہ شلوار قمیص میں بکھرے بکھرے بالوں والا ہمایوں خان اتنی

سردی میں بھی آگ کی طرح جل رہا تھا...... نورالعین کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی نہ بھاگ سکی۔

"آؤ ناں...... نورالعین...... ہم سے اتنی دور کیوں ہو آخر......؟"

ہمایوں خان کی آنکھوں میں نہ جانے کون سا طلسم بھرا تھا کہ نورالعین آپ ہی آپ اس کے قریب چلی آئی۔

"ہم تو تمہیں صرف دیکھنا چاہتے ہیں......" اس نے خوف سے کانپتی ہوئی نورالعین کو اپنی بانہوں کی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

باہر سردی کا زور تھا اور اندر جذبات کی حدت...... عشق اور حسن کی زبردست جنگ جاری تھی۔ کتنے پل کتنی صدیوں میں بیتے...... دونوں کو ہوش نہ تھا۔ وہ ان کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لیے یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے کبھی نہ دیکھا ہو۔

وہ جو اس کا ایمان بن گئی تھی۔ ایک تقدس شے تھی۔ اس کی ذرا سی بے ادبی پر خدا اس کو کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی...... نہ جانے کون سا پہر تھا اور رات کا جب ان کی نگاہوں کا طلسم ایک پل کے لیے ٹوٹا تو جیسے نورالعین کو ہوش آ گیا۔ اس کے حواس پوری طرح جاگ اٹھے۔

"اب ہم جائیں......" وہ اس کے مضبوط بازوؤں کے حلقے میں آہستہ سے کسمسائی

"کیوں اتنی جلدی کیا ہے......؟" ہمایوں خان نے اسے اور بھی زور سے جکڑ لیا۔

تب نورالعین کو ایسا لگا جیسے ساری کائنات صرف اور صرف ہمایوں کی بانہوں میں سمٹ آئی ہے۔ ان دو آنکھوں میں جواب بھی پوری سچائی سے اس کے سر چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"ہمیں نیند آ رہی ہے جانے دو ہمیں......" نورالعین کے سانسیں رکنے لگی تھیں۔ اتنی شدت سے کوئی اسے چاہ رہا تھا...... یہ احساس بڑا جان لیوا تھا۔

"جھوٹ مت بولو جان جاناں...... ایسے میں نیند کس کافر کو آتی ہے۔" ہمایوں خان نے بڑی آہستگی سے اس کا چہرہ اپنے سینے کی بے چین دھڑکنوں میں چھپا لیا۔

☆☆☆

نورالعین کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ گزرے لمحوں کے اذیت ناک کرب کا عکس اب بھی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"اوہ میرے خدا! یہ سب کیا ہو گیا نورالعین......!" سلمٰی کی آنکھوں کے کنارے جل اٹھے۔

"نورالعین...... بی بی ماں کا ردعمل کیا ہوگا......؟" اس کے پنکھڑیوں جیسے لب سوکھے پتوں کی طرح لرزے...... ہمایوں خان اور شاہ زیب کے چہرے آنکھوں کے سامنے بننے اور بگڑنے لگے۔

"نورالعین کی گرتی ہوئی حالت...... یہ سب دیکھ کر بی بی ماں کا شدید ردعمل۔" سلمٰی کی آنکھوں میں اندھیرے سے چھا گئے۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

کئی روز سے بارش ایسے برس رہی تھی۔ جیسے جوان بیوہ کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی جھڑی۔ جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ رات بھی بے حد سیاہ اور ٹھنڈی تھی۔ جانے وہ کون سا پہر تھا۔ جب وہ دونوں بی بی ماں کے کمرے سے لوٹ رہی تھیں۔ دونوں چاہتے ہوئے بھی بی بی ماں سے اس کا ذکر نہ کر پائی تھیں۔ جو نورالعین کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

"سلمٰی......" نورالعین کی آواز میں گھٹی ہوئی چیخیں پوشیدہ تھیں۔

"وہ...... دیکھو...... وہاں......"

اس کی نگاہوں کے تعاقب میں سلمٰی کی نظریں بھی پائیں باغ کے کونے میں درخت کے نیچے بیٹھے ہمایوں پر پڑیں۔

اس قدر جان لیوا ٹھنڈ...... اتنا طوفانی موسم اور وہ یوں اکیلے باغ میں بیٹھا اتنی رات کو یقیناً نورالعین کی راہ دیکھ رہا تھا...... برستی بارش...... کڑکتی بجلیاں...... قہر برساتی سردی...... کچھ بھی تو اثر انداز نہیں ہوا تھا اس پر...... ان دو آنکھوں پر جو بڑی چاہ سے نورالعین کی بربادی پر آمادہ تھیں۔

"چلیے نورالعین......! آپ تو جانتی ہیں کہ وہ......"

اس سے پہلے کہ سلمٰی اپنی بات پوری کرتی...... نورالعین اس سے بہت دور جا چکی تھی۔

"آپ جانتی ہیں آپ نے کیا کیا......؟" سلمٰی کے ماتھے کی شکنیں بہت گہری تھیں۔

"صرف جانتے ہی نہیں...... اس جرم کی سنگینی سے بھی آگاہ ہیں۔" نورالعین کی پلکیں سجدہ ریز تھیں۔

"جو سزا چاہو دے ڈالو۔ ہم تیار ہیں۔ لیکن اتنا جان لو سلمٰی کہ جو کچھ ہوا۔ اس میں ہمارے کسی بھی ارادے کا دخل شامل نہیں تھا۔ کسی جذبے کی گرمی شامل نہ تھی۔"

"اور جانتی ہو...... سلمٰی...... آج ہمایوں نے ہم سے کیا کہا......؟" نورالعین کے نین جل تھل ہو گئے۔ گزرے لمحوں کا کرب چہرے پر سمٹنے لگا۔

"کیا...... کہا......؟" سلمٰی کو اس کی بے چارگی پر ترس آیا جو جانے کن ناکردہ گناہوں کی سزا پا رہی تھی......

ان دنوں......

ہم جب اسے اٹھا کر کمرے میں لے گئے۔ بستر پر لٹانا چاہا تو...... نورالعین...... ہمایوں خان کا وجود بخار کی شدتوں سے جل رہا تھا۔ خوبصورت آنکھوں میں وحشتیں تھیں۔" نورالعین کی قربت نے ان آنکھوں کو کئی گنا زیادہ بڑھا دیا تھا۔

"جی کہیے......" نورالعین ان آنکھوں کی شراب سے مست ہونے لگی۔

"جان جاناں...... ہم...... ہم تمہارے ہونٹوں کا زہر پینا چاہتے ہیں۔" ہمایوں کی آواز میں غراہٹیں شامل تھیں۔

"آپ...... آپ بے حد بدتمیز ہیں ہمایوں......" نورالعین نے مارے غصے کے اس کا کھلا ہوا گریبان چیر ڈالا۔

"بدتمیز ہم نہیں...... آپ کا حسن بے ادب ہے۔ گستاخ ہے جو ہماری دیوانگی میں مخل ہوا......" ہمایوں کی مضبوط بانہوں نے نازک سی نورالعین کو جھنجوڑ ڈالا۔

"ہم شاہ زیب کی امانت ہیں۔" حسن بری طرح تڑپا۔

"آپ میری عبادت ہیں۔" عشق بے حد گستاخی پر آمادہ تھا۔

"ہم شاہ زیب کو بے حد چاہتے ہیں۔ وہ ہماری آرزوؤں کا حاصل ہے۔" حسن التجا آمیز ہوا۔

"زندگی ہے ہماری شاہ زیب......" حسن کی آنکھوں میں بے حد تڑپتی آرزوئیں دم توڑ رہی تھیں۔

"اور آپ ہماری موت ہیں...... موت جو زندگی پر ہمیشہ سبقت لے جاتی ہے...... نورالعین جانم...... جیت ہمیشہ موت کی ہوتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جیت ہماری ہو گی۔"

عشق کی مغروریاں زوروں پر تھیں...... باہر بجلی آسمان پر عشق کی گستاخیوں پر دل گرفتگی سے تڑپی...... اور حسن نہ جانے کس طرح عشق میں مدغم ہو گیا۔

☆☆☆

"آپ جانتی ہیں آپ کا فیصلہ ہماری جان لے لے گا......" شاہ زیب کا لہجہ ایک دم ٹوٹا ٹوٹا سا تھا۔

"ہم کب زندہ ہیں...... ہم تو کب کے مر چکے ہیں۔ برباد ہو چکے ہیں۔" نورالعین کی آنکھیں کہیں دور

خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔

"نورالعین! ایک دفعہ صرف ایک دفعہ ہماری آنکھوں میں دیکھ کر کہہ دو کہ تم......" شاہ زیب کی آواز ٹوٹ گئی۔

"یہاں کوئی نورالعین نہیں...... یہاں تو صرف ایک دیوانے کی عینی ہے۔ عینی جو نورالعین کی موت ہے۔ موت جو ہمیشہ زندگی پر سبقت لے جاتی ہے۔" نورالعین نے بے دردی سے اپنی پلکوں کو مسل ڈالا۔

"یہ آنسو بھی کم بخت بے وقت تنگ کرنے چلے آتے ہیں۔" وہ جیسے خود سے مٹ جانا چاہتی تھی۔

"انہیں بھی شاید ہمارا نصیب ملا ہے۔ جو صرف چند پل آپ کی نظروں میں آئے اور چل دیئے۔" شاہ زیب کا شکوہ بڑا پر زور تھا۔

"آپ کو تو ہمارے آنچل میں بھی جگہ نہیں مل سکتی شاہ زیب! چلے جایئے یہاں سے۔"

نورالعین نے اپنا سفید آنچل آنکھوں پر رکھتے ہوئے سارے موتی چن لیے۔

"ہمارا ذکر چھوڑیے بی بی ماں کا کہیے...... پورا خاندان...... تمام دوست احباب...... بھونچال آ جائے گا۔ قیامت کا سماں ہو گا۔" شاہ زیب نے کمال ضبط سے کام لیا۔

"قیامت اور بھونچال...... یہ چیزیں تو کب کی ہمارے وجود سے پار ہو چکیں...... اب یہاں تو صرف ایک دیوانے کا بسیرا ہے۔ وہ جسے لوگ ہمایوں خان کہتے ہیں۔ ہمایوں جو پاگل ہے۔ جو اپنے حواس کھو چکا ہے۔" نورالعین نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

☆☆☆

شکست وہ چیز ہے جو زندگی میں ایک بار کہیں ٹکرا جائے تو بار بار ملنے چلی آتی ہے۔ بی بی ماں کا بھی اس سے بے حد پرانا رشتہ تھا۔ یہ ان سے تب ٹکرائی تھی جب وہ پیدا ہوئی تھیں۔ بیٹی کی پیدائش کے جرم میں باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ ماں بھی سوکن برداشت نہ کر پائی اور چل بسیں۔ سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن کا برتاؤ بے حد دل شکن تھا......

روتے دھوتے جانے کب جوان ہوئیں...... کچھ خبر نہ تھی کہ اچانک نواب اعجاز علی نے جیسے انہیں سوتے میں جگا دیا تھا۔ جانے کب اور کیسے وہ ان کے دل میں اتریں اور گھر میں آ گئیں...... مگر یہاں بھی پرانی سہیلی انہیں ملنے چلی آئی...... شکست جو کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سوتیلی بہن کا حسن زیادہ دل پذیر تھا۔ نواب اعجاز علی رنگین مزاج آدمی تھے۔ اگر انہیں اجازت نہ بھی ملتی تو وہ ٹلنے والے نہ تھے...... سوتیلی بہن سوتن بن کر کیا آئی کہ ان کی تو زندگی کو صدموں نے آن گھیرا۔ وہ پھر بھی برداشت کرنے کا مادہ نہ کھو سکیں۔ اپنے دونوں بیٹوں اور بچیوں کے ساتھ خوش رہنے کی کوشش کرتیں مگر یہاں قسمت ایک بار پھر مات دے گئی۔

سوکن کا بیٹا بے حد پیارا تھا۔ ماں کی طرح خوبصورت اور باپ کی طرح عاشق مزاج بابر خان ایک دم بے حد اکھڑ اور خودسر تھا۔ ایک ہوائی حادثے میں اعجاز علی اور ان کی دوسری بیگم اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔ دکھ کا مقام تھا مگر بی بی ماں کو کوئی خاص صدمہ نہ ہوا۔

جو زندہ ہو کر اپنا نہ تھا۔ اس کے مرنے کا دکھ کون مناتا۔ ویسے بھی وہ اپنے بچوں میں مگن ہو چکی تھیں۔ سب بچوں کو مرضی سے خاندان میں بیاہ دیا۔ مگر بابر خان اپنی مرضی سے ایک نیچ خاندان کی لڑکی بیاہ لایا۔ سارے خاندان کی نگاہیں حویلی پر لگی تھیں۔ بی بی ماں چاہتے ہوئے بھی بابر خان کو عاق نہ کر سکیں۔ گھر سے نکل جانے کا حکم دیا اور بابر خان نے مقدمہ دائر کر دیا۔ پورا سال مقدمہ چلتا رہا اور بی بی ماں کی لاکھ بے رخی کے باوجود پرانی دوست...... شکست نے انہیں آن گھیرا......

بابر خان بیوی کو ساتھ لے کر گھر چھوڑ گیا اور ساتھ میں آدھی جائیداد بھی لے گیا۔ جو اس نے اپنے بیٹے ہمایوں

خان کے نام لکھوائی تھی۔

راستے میں زبردست ایکسیڈنٹ نے دونوں کو موت کی آغوش میں سلا دیا اور یوں گھوم گھما کر دولت سمیت تنہا ہمایوں خان بی بی ماں کی گود میں آن پڑا۔ اس کی پرورش بڑی جانفشانی سے کی گئی۔ پورا گھرانہ اس پر پلکوں کی چھاؤں کیے رہتا گو کہ یہ سب مصنوعی تھا۔ آخر کو وہ ان کی آدھی جائیداد کا وارث تھا۔ جانے کیسے کب وقت گزر گیا...... بچپن جوانی میں ڈھل گیا۔

ہمایوں خان میں باپ اور دادا کا مزاج اور ماں کی دلکش خوبصورتی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ابھی بھرپور جوان بھی نہ ہو پایا تھا کہ...... وہ عشق کی تمام کٹھنائیاں پار کرنے کی ٹھان بیٹھا۔ بانو بے حد معصوم تھی بے حد غیور خاندان کی خوبصورت دوشیزہ تھی مگر عشق نے اسے بھی جیسے پاگل کر دیا تھا۔ ہمایوں خان کی اک آواز پر وہ اپنے پٹھان خان کے جاہ و جلال کی پروا کیے بغیر دوڑتی ہوئی چلی آئی۔ بی بی ماں کو وہ لڑکی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ شاید انہیں دولت کے کھو جانے کا خوف لگا تھا مگر ہمایوں کی ضد انہیں ایک بار پھر مات دے گئی۔ بی بی ماں کے لاکھ نگاہ چرانے کے باوجود شکست نے اپنا چہرہ ان کی طرف سے نہ پھیرا۔

وہ جتنا بھی سوگ مناتی کم تھا۔ نہ صرف جواں خوبصورت رشتہ ہاتھ سے گیا تھا بلکہ آدھی جائیداد کے تمام کاغذات سمیت ہمایوں خان بانو کو لے کر علیحدہ ہو گیا تھا۔

نہ جانے بی بی ماں کی آہوں کا اثر تھا یہ کہ ہمایوں خان کا نصیب...... جو بھی تھا بڑا خطرناک مرحلہ تھا...... بانو...... ہمایوں خان کے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ تب ہی جانے کیسے پاؤں پھسلا اور وہ ہمایوں خان کے گھر پہنچنے سے پہلے اپنے بچے سمیت اس دنیا سے کوچ کر گئی۔

ہمایوں خان جو بچپن ہی سے حقیقی پیار کا بھوکا تھا۔ جس نے زندگی کا پہلا سکھ اور سکون بانو کی آغوش میں محسوس کیا تھا۔ پیار کی پہلی مہک بانو کی سانسوں نے اسے بھائی تھی۔ جس نے ان دس ماہ میں لاکھوں مرتبہ ہمایوں کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں...... اتنی جلدی یوں ساتھ چھوڑ گئی تھی وہ...... ہمایوں خان تو یقین ہی نہ کر پایا تھا...... اور جانے کب وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

☆☆☆

شکست در شکست نے بی بی ماں کو پتھر بنا دیا تھا...... یہ موقع ان کی پہلی جیت بن گیا تھا۔ بازی خود بخود پلٹ گئی تھی۔ ساری دولت اب ان کی مٹھی میں آ گئی تھی۔

سوتیلی ماں...... سوتیلی بہن...... سوکن اور پھر اس کا جوان گستاخ بیٹا اور پھر ہمایوں خان جیسا خوبرو نوجوان اور اس کی نافرمانیاں......

انہیں یقین ہی نہ آیا کہ بازی یوں بھی پلٹ سکتی ہے۔ اور وہ اپنی اس پہلی جیت کی خوشی میں یوں مست ہوئیں کہ اس کا علاج تو در کنار...... اس کا حال احوال تک نہ پوچھا گیا اور یوں وہ صرف ایک کمرے کا ہو کر رہ گیا۔ ایک بہت بڑا کمرہ تھا...... رنگ تھے...... برش تھے اور وہ تھا۔

وہ آج تک کوئی تصویر مکمل نہیں کر پایا تھا۔ چند ایک ٹیڑھی میڑھی لکیریں تھیں جو اس کی دیوانگی کا کھلا ثبوت تھیں۔ کوئی محفل، کوئی جشن، کوئی تقریب ایسی نہ تھی۔ جس میں ہمایوں خان کو شامل کیا جاتا...... وہ تھا اس کی دیوانگی تھی اور اس کی تنہائیاں تھیں......

اور جب کبھی بی بی ماں کو جیت کی خوشی سے ذرا ہوش آیا تو انہوں نے اپنے چشمے کی اوٹ سے دیوانے ہمایوں خان کو یوں نفرت سے دیکھا۔ جیسے وہ ان کا خون نہیں...... ایک بے جان پتھر ہے جو کبھی ان کی راہ میں حائل ہوا تھا اور پھر وہ ان کے راستے سے ہٹا کر ایک طرف پھینک دیا گیا ہو......

"پاگل...... دیوانہ...... اب کر بھی کیا سکتا ہے ہمارا......؟"

انہوں نے بڑے غرور اور تکبر سے یہ الفاظ کہے تھے۔

مگر آج ایک بار پھر وہ شناسا شکست...... سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

ہمایوں خان اور...... نور العین کی محبت بانو کے روپ میں۔

"تم جانتی ہو وہ پاگل ہے...... دیوانہ ہے...... مگر تم تو پاگل نہیں ہو...... ہوش سے کام لو......"

کمرے کی ایک ایک چیز بی بی ماں کے گالوں کی طرح دہک رہی تھی۔ سارا خاندان جمع تھا۔ تین روز ہوئے شاہ زیب بھی لوٹ آئے تھے۔ کتنے ارمانوں سے سب نے اس کے لوٹنے کا انتظار کیا تھا...... مگر وہ لوٹے بھی تو...... کیسے...... کہ انہیں اپنے لوٹنے کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

وہ کیسے مان لیتے کہ یہ وہ گھر ہے...... وہی جگہ ہے...... جہاں وہ اپنی نور العین کو چھوڑ کر گئے تھے۔ اور آج یہاں انہیں سوائے ہمایوں خان کی نور العین کے انہیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

ہوش کسے کہتے ہیں؟

نور العین کی آنکھیں دور خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔

"نور العین" بی بی ماں کی آواز شدت ضبط سے پھٹ گئی...... اس وقت تم اپنے آپ میں نہیں ہو تم نہیں جانتی۔ تم پتھر کے لیے...... ہیرا گنوا دینے پر تلی ہو بے وقوف لڑکی......

"شاہ زیب ہمارا کوہ نور ہے۔ جسے ہم تمہارے سر کے تاج میں جڑنا چاہتے ہیں اور تم ہو کہ......" وہ اپنے ہونٹوں کو کاٹ کر خاموش ہو گئیں۔

"کوہ نور......" نور العین ایک دم سسک اٹھی۔

سچ ہی تو تھا...... شاہ زیب اس کی دعا تھی۔ اس کا دل تھا۔ اس کے سر کے تاج کا کوہ نور تھا مگر وہ اس پتھر کا کیا کرتی جو اس کی راہ کی دیوار بن گیا تھا۔

اس کی دیوانگی میں جانے کیا چھپا تھا...... وہ کیا چاہتا تھا۔

نور العین تڑپ اٹھتی تھی......

"نور العین! ہم تمہیں سات روز کی مہلت دیتے ہیں...... ہم چاہتے ہیں۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو...... کہ دیوانوں کے ساتھ ایک دو پل تو اچھے گزر سکتے ہیں...... وہ جو دیوانگی سے باہر ہوتے ہیں مگر عمر بھر کا ساتھ نبھانا مشکل ہی نہیں...... ناممکن بھی ہوتا ہے۔

"شریک حیات افسانہ نہیں حقیقت کا نام ہے اور حقیقت صرف شاہ زیب ہے۔ ہمایوں نہیں...... اب تم جا سکتی ہو۔" بی بی ماں نے محفل برخاست کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

☆☆☆

سات روز کی مہلت سات صدیوں کے برابر لگ رہی تھی۔ روز روز مرنے سے تو بہتر تھا کہ وہ ایک بار ہی مر جاتی...... شاہ زیب کی التجا آمیز نگاہیں...... سلمیٰ کا ہمدردی بھرا انداز...... بی بی ماں اور خاندانی بزرگوں کی تیز نگاہیں۔ ہم عمر دوستوں کا طنزیہ انداز...... اف میرے خدا...... وہ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے بے دم ہو رہی تھی اور وہ سات دن تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا...... سردی کی لہریں جیسے جسم کو چیرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ہمایوں کا کمرہ اور ہمایوں کا حلیہ دونوں ہی بے حد نکھرے نکھرے تھے۔ مگر انہیں نکھارنے والی خود بے حد بکھری ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی بند کر کے مڑی تو سامنے ہی سیاہ کمبل میں لپٹا ہوا ہمایوں اسے یوں لگا جیسے وہ بے حد چین کی نیند سو گیا ہو۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ اس قدر پر سکون ہوا تھا کہ نور العین کے سامنے ہوتے ہوئے بھی آنکھوں پر نیند نے بسیرا کر لیا تھا۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ فیصلہ اسی کے حق میں ہو گا...... تب ہی وہ بے چین ہو کر وہاں سے ہٹ

آئی۔

صبح فیصلہ کی صبح تھی اور رات تھی کہ ہر پل صدی بنتا جا رہا تھا۔ جانے کب اور کیسے...... وہ سلمٰی کے سینے پر سر رکھ کر سو گئی۔ تب ہی کسی نے بہت دھیمے سے اس کے سر میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"نورالعین...... ہم ہیں شاہ زیب...... اٹھو اور ہمارے جانے سے پہلے ہماری مبارکباد قبول کرو......" بھائی کی آواز میں جو درد کا کرب تھا وہ سلمٰی کی برداشت سے باہر تھا۔ تب ہی وہ ان دونوں کو تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

"ہم تمہیں اور ہمایوں خان کو ایک ہونے کی مبارکباد دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں رہنے سے تمہیں اور بی بی ماں کو فیصلہ کرنے میں دقت ہوگی۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم صبح ہونے سے پہلے یہاں سے اس گھر سے۔ اس ملک سے...... تمہارے دل سے اور بی بی ماں کے دماغ سے دور ہونا چاہتے ہیں۔

بالکل دور...... بہت ہی دور......!

"شاہ زیب......! آپ......؟"

نورالعین کو شاہ زیب اتنی بلندی پر نظر آئے۔ جسے شاید وہ چھونے کا تصور بھی نہ کر سکتی ہو۔ وہ اس سے بہت دور بہت دور ہوتے چلے جا رہے تھے اور وہ انہیں روکنا بھی نہیں چاہتی تھی...... تبھی سلمٰی کی آمد نے ان دونوں کو حیران کر دیا۔

"نورالعین! خدا کے لیے اٹھ جاؤ......" سلمٰی کی آنکھوں سے ساون بھادوں برس رہا تھا۔

"سلمٰی کیا ہوا......؟" شاہ زیب کا دل بے طرح بیٹھ گیا۔ شاید بی بی ماں نے کوئی فیصلہ کر ڈالا تھا۔

"ہمایوں خان...... ہمایوں خان......" سلمٰی کی آواز ڈوب گئی۔

"ہاں شاید ہمایوں خان نے ہمیں یاد کیا ہے......نور العین ایک پل میں جانے کتنے تپتے صحراؤں سے گزر گئی...... فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ وہ سلمٰی اور شاہ زیب کی پروا کیے بغیر ہمایوں خان کے پاس چلی آئی۔ لیکن وہ اب بھی بالکل بے خبر اور بے حد پرسکون طور پر محو خواب تھا۔

"پاگل...... دیوانہ......" وہ دل ہی دل میں اس کی معصوم مسکراہٹ پر زیر لب مسکرا کر رہ گئی۔ کتنا یقین ہو گیا اس دیوانے کو اپنی جیت کا...... کہ ابھی تک بے خبر سو رہا تھا...... جوں کا توں ہلا تک نہیں تھا اپنی جگہ سے......

مگر شاہ زیب نے آ کر ہمایوں خان کے دل پر ہاتھ رکھ کر جیسے نورالعین کا دل نچوڑ دیا تھا اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا نورالعین کی چھٹی حس نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

☆☆☆

ہمایوں خان کی دلپذیر اور پر فتح مسکراہٹ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ ایک بار پھر بی بی ماں کو شکست دے گیا تھا۔ جیسے وہ ہار کر بھی سب کچھ جیت گیا تھا۔ شکست ایک بار پھر بی بی ماں کے لیے بانہیں کھولے کھڑی تھی۔ نورالعین کی دماغ کی رگیں اس قدر تنی تھیں کہ وہ کسی بھی قسم کا فیصلہ کرنے یا سننے کی حالت میں نہ تھی۔

☆☆☆

شاہ زیب کی فلائٹ مس ہو چکی تھی اور انہوں نے ہمایوں خان کی آخری رسومات اپنے ہاتھوں سے ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا...... وہ دیوانہ اتنی بے کراں خوشیاں پا کر سانس لینا ہی بھول گیا تھا۔ شاہ زیب اسے اس کی آخری آرام گاہ پہنچا کر واپس لوٹے تو حویلی میں جیسے حشر برپا تھا۔ کوئی فیصلہ کیے بغیر ہر فیصلہ آپ ہی آپ ہو گیا تھا...... وہ دیوانہ جاتے ہوئے نورالعین کی سانسیں بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

بی بی ماں بال کھولے نورالعین کے سرہانے بیٹھی اپنی پرانی شناسا کو دیکھ رہی تھیں...... اور جانے کب تک انہیں اس درد کی دہلیز پر کھڑے رہنا تھا۔ جسے لوگ زندگی کہتے ہیں۔

☆☆☆

افسانہ

اک نئے موڑ پر

عابدہ طارق

جدائی کا کرب سہنا آسان نہیں ہے
دلوں میں محبت اور خلوص کی جگہ لالچ اور وقتی مشاورت
لے لیں تو خون کے رشتے بھی جیتے جی مر جاتے ہیں۔

معاشرتی ناہمواریوں کا پردہ چاک کرتی ایک پُر اثر تحریر

بس زندگی یوں ہے کہ کبھی
کانٹوں پہ گزر جاتی ہے تو کبھی
پھولوں کی سیج بن جاتی ہے
ہے یہ سانس کی ڈوری کی مانند
ذرا سی چوٹ لگے تو ٹوٹ جاتی ہے
کبھی ہنسنا کبھی رونا یہ دو ہی کام ہیں
کبھی ہنستے گزر جاتی ہے تو کبھی روتے گزر جاتی ہے

اوہو سعد بیٹا...... یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا حشر کر دیا ہے تم نے اس بے چاری سائیکل کا چند دن پہلے ہی تو تمہاری ماما نے لا کر دی ہے اور دیکھو تم نے اپنے کپڑے بھی اس قدر گندے کر لیے۔

ماما آ کر تمہیں ڈانٹیں گی اور پھر تم نے رونا شروع کر دینا ہے۔ اٹھو شاباش میرا بیٹا، ادھر آؤ میرے پاس تمہارے کپڑے مٹی سے اٹ گئے ہیں صاف کر دوں۔

سعد! جو لان میں اپنی سائیکل کے ساتھ سواری کرتے کرتے اس کو کھول کے بیٹھ گیا تھا۔ بہت ذہین تھا جو بھی چیز ہاتھ آ جاتی اس کے آپریشن میں لگ جاتا۔ اور فاطمہ اس کی اس عادت سے بہت پریشان تھی۔ جمیلہ بیگم جو لان میں چیئر پہ بیٹھی سعد کو کھیلتا دیکھ رہی تھیں۔ اس کے پیچھے دوڑی اور سعد کو پکڑ کر اندر لے آئیں۔ جہاں پر فاطمہ استری اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر کپڑے پریس کر رہی تھی۔ سعد کو اس حالت میں دیکھا تو غصے سے چیخی۔

مگر جمیلہ بیگم درمیان میں آ گئیں کہ فاطمہ کوئی بات نہیں بچہ ہے ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر فاطمہ آگ بگولہ تھی کہ چھٹی کا ایک دن ملتا ہے آرام و سکون کا اس میں بھی سارا دن اس کے پیچھے بھاگتے رہو۔

لیکن فاطمہ کی کل کائنات تو بس سعد ہی تھا۔ جس میں اس کی جان تھی۔ غصہ بھی کرتی لیکن پیار اس سے بھی بڑھ کر۔

☆☆☆

سعد چار سال کا تھا۔ فاطمہ کی بہت خواہش تھی کہ سعد فوج میں جائے تاکہ معاشرے میں ایک اچھا شہری بن سکے۔ سعد تھا بھی بہت ذہین، فرسٹ کلاس فرسٹ آتا ہر کلاس میں۔

اس لیے فاطمہ نے سعد کو آرمی پبلک سکول میں داخل کروا دیا تھا اور مطمئن تھی اس کی پڑھائی سے۔ جب بچہ ذہین اور لائق بھی ہو تو اس کی ہر خواہش پر بات ماننے کو دل کرتا ہے۔

یہی حال فاطمہ کا بھی تھا وہ غصہ تو بہت کرتی مگر لاڈ بھی بہت بگھارتی اس سے۔ دادی یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوتیں۔ سعد تو ان کا اکلوتا اور لاڈلا پوتا تھا۔ اس پہ صدقے واری جاتیں ہر دم...... دادی اور فاطمہ کی آنکھوں کا تارا تھا وہ......

لے دے کے ایک ہی پھوپھو تھی وہ جب بھی آتی سعد کے وارے نیارے ہو جاتے۔ اتنا کچھ وہ سعد کے لیے لے کر جو آتی تھیں۔ جس دن پھوپھو آتیں اس دن سعد کی عید ہوتی خوشی سے پھولے نہ سماتا۔

آج بھی دوپہر کے کھانے کے بعد رمشہ سعد کی پھوپھو نے آنا تھا اپنی ننھی منھی سی حریم کے ساتھ۔

فاطمہ نے خود بھی کام والی کے ساتھ مل کر گھر کو صاف کیا اور دو چار کھانے پکانے میں زرینہ کو ساتھ لگانا تھا۔ زرینہ جو ان کے گھر میں شروع سے کام کرتی تھی۔ نہایت شریف اور ایماندار بلکہ گھر کے ایک فرد کی طرح رہتی تھی۔ جمیلہ بیگم اور فاطمہ نے کبھی اس کو ملازم نہیں سمجھا۔

رمشہ نے شام کو آنا تھا اس لیے فاطمہ جلد از جلد کام ختم کر کے نہا دھو کر فریش ہو کے کچن میں جانا چاہتی تھی کہ سعد نے لان میں اپنے کپڑے اس قدر گندے کر لیے تھے کہ فاطمہ کو غصہ آنا ہی تھا۔

کچھ دیر پہلے ہی سعد کو وائٹ شلوار قمیص پہنا کر نہا کر دادی کے ساتھ سائیکل دے کر لان میں بھیجا کہ کچھ ٹائم تو سکون سے گزرے گا اور میں گھر کا کام ختم کر لوں اور کچھ پکا بھی لوں۔

شام تک کام کر کے فاطمہ فریش ہو گئی ہلکے پنک رنگ کے شفون کے دوپٹے کے ساتھ والے سوٹ میں فاطمہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ مگر دل کی نگری میں کوئی ہلچل نہ تھی۔

خیر شام کو رمشہ، حریم اور بلال آ گئے خوب رونق ہو گئی۔ سعد تو ننھی حریم کو گود میں لے کر بہت خوش تھا۔ اپنی زبان میں اس سے باتیں کرتا تو سب دیکھ کر بہت ہنستے۔

فاطمہ کو کوکنگ بہت اچھی کرنی آتی تھی۔ آج بھی بہت کچھ بنایا۔ شامی کباب، بریانی، مٹن کڑاہی، رائتہ، دال ماش، سلاد، روٹی، کھیر حتیٰ کہ بہت کچھ بنا ڈالا۔

کھانے سے فارغ ہو کر آئس کریم کی باری تھی اور ساتھ چاکلیٹ بھی۔ جو پھوپھا اور پھوپھو اپنے ساتھ لائے تھے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا سعد کے لیے۔

سعد بہت بے چین تھا کہ سب کچھ اس کو ابھی کھول کے دکھا دیا جائے۔ مگر فاطمہ نے اس کو سمجھایا کہ بیٹا آپ کے لیے ہی ہیں سب چیزیں صبر کرو، پھوپھو تھکی ہوئی آئی ہیں۔ کھانا کھا کر تھوڑا ریسٹ کر لیں پھر آپ کو دکھا دیں گی۔ یہ سن کر سعد نے منہ تو بنایا مگر فاطمہ کی آنکھوں کے غصے کو دیکھ کر چپ ہو گیا اور فاطمہ کو اندر ہی اندر ہنسی آ گئی۔

چھوٹی حریم دودھ پی کر سو گئی تو رمشہ نے اس کو جا کر روم میں لٹا دیا ساتھ ہی بلال بھی لیٹ گئے۔ رمشہ پھر اٹھ کر فاطمہ کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں پر جمیلہ بیگم مصلیٰ ڈالے نماز پڑھنے کی تیاری کر رہی تھیں۔

فاطمہ اور زرینہ نے برتن سمیٹے اور فاطمہ نے اچھی سی چائے بنائی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

''بلال بھائی کو چائے دے آؤ رمشہ۔'' بھابی وہ تو سونے لگے ہیں کہتے ہیں بعد میں چائے پیوؤں گا۔ مجھے آپ کو بتانا یاد نہیں رہا کہ ان کے لیے چائے مت بنایئے گا۔

رمشہ نے شرمندگی سے کہا۔

''چلو کوئی بات نہیں جب وہ اٹھیں گے تو اور بن جائے گی۔'' فاطمہ نے خوش دلی سے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں چائے پیتے پیتے باتیں کرنے لگیں۔ سعد نے چونکہ سکول جانا تھا۔ فاطمہ نے اس کو بھی زبردستی سلا دیا کہ صبح اٹھنے میں مشکل ہو گی۔

جمیلہ بیگم نماز سے فارغ ہوئیں تو فاطمہ نے ان کو بھی چائے لا کر دی۔ اس طرح باتوں باتوں میں چائے کا پتہ نہ چلا۔

امی جان شاہد بھائی کی کوئی اطلاع ملی کہ وہ کدھر ہیں آج کل......

جمیلہ بیگم ہاتھ میں تسبیح پکڑ کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے روہانسی ہو کر بولیں نہیں بیٹا...... کچھ پتہ نہیں بس سعد کے ہونے کے بعد ایک بار فون آیا تھا وہ کہاں ہے کیا کر رہا ہے؟ کس دیس میں ہے؟ کس شہر میں؟ ہمیں تو وہ انتظار کی سولی پر لٹکا کے چلا گیا ہے۔ ہمارا نہیں تو کم سے کم اپنے بیٹے کا ہی خیال کر لیتا۔ اس کو بتایا بھی تھا کہ خدا نے بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔ مگر نہ اس نے سلیقہ شعار بیوی کی قدر کی نہ بیٹے کی اور نہ بوڑھی ماں کا سوچا۔ وہ تو بس ذمہ داریوں سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ جس میں وہ کامیاب ہو گیا۔ اتنی سمجھدار تابعدار محبت کرنے والی گھر سنبھالنے والی بیوی کو چھوڑ کر وہ بھلا خوش ہو گا۔ پتہ نہیں کہاں دھکے کھا رہا ہو گا۔ اگر شادی نہیں کرنی تھی تو پہلے ہی بتا دیتا کم از کم اس معصوم کی زندگی تو خراب نہ ہوتی۔ میں تو خود کو قصوروار سمجھتی ہوں جب جب اس معصوم کو دیکھتی ہوں۔

ہاں امی شاہد بھائی نے اچھا نہیں کیا۔ سب کے ساتھ بہت برا کر کے گئے ہیں۔ دعا ہے اب بھی گھر واپس آ جائیں۔ خوش رہیں اپنے بیوی بچوں میں۔ لوگ تو اولاد کے لیے ترستے ہیں۔ خدا نے تو ایک بیٹے سے نوازا ہے وہ بھی ماشاء اللہ اتنا سمجھدار اتنا پیارا۔ بہت بدقسمت ہیں شاہد بھائی خدا ہی ہے انہیں راہ راست پر لانے والا۔

فاطمہ خاموش بیٹھی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ بولتی بھی تو کیا؟ کس سے شکوہ کرتی۔

رمشہ، بلال ایک رات رہ کر اپنے گھر لاہور چلے

گئے۔ کیونکہ بلال کسی ٹور کے سلسلے میں یہاں آئے تھے تو ایک رات کے لیے ان کی طرف رک گئے تھے۔

فاطمہ ایک گورنمنٹ سکول میں نوکری کرتی تھی۔ سعد کو سکول چھوڑ کر وہ بھی سکول چلی جاتی تھی۔ امی جان آپ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ دوائی ٹائم سے لے لیجئے گا۔ ویسے تو میں نے زرینہ کو بھی کہہ دیا ہے۔

ہاں بیٹا تم بھی خیال سے جانا۔ پوتے کو پیار کرتے ہوئے فاطمہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دونوں کو رخصت کیا اور آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

دن گزرتے رہے۔ کبھی سردی کبھی گرمی، کبھی بہار کبھی خزاں۔

نہ وقت رکتا ہے تو نہ کبھی عمر رکتی ہے۔ وقت کا کام ہے چلتے رہنا۔

سعد جوانی کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اونچا قد، خوبصورت ڈیل ڈول، نیلی نیلی آنکھیں، جو ایک بار دیکھے تو دیکھتا ہی چلا جائے۔ وہ آرمی میں سینئر رینک پر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میں اس کو فوج کی وردی میں دیکھتی تو دل سے ڈھیروں ڈھیر دعائیں نکلتیں۔

خدا نے میرے صبر کا پھل بہت میٹھا دیا تھا اتنا کہ میں اس قابل تو نہ تھی۔ مگر اب سجدے کرتے نہ تھکتی۔

یہ اولاد بھی کس قدر عجیب چیز ہے۔ نیک ہو تو ماں باپ کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اگر نااہل ہو تو ماں باپ کے لیے زندگی بھر کا روگ۔

بس اولاد ایک ہو پر نیک ہو تو ماں باپ کو جنت اسی دنیا میں مل جاتی ہے اور بچے دس ہوں اور سب کے سب نالائق اور کاہل تو ماں باپ کی ساری زندگی امتحانوں میں گزر جاتی ہے۔

فاطمہ کو شاہد بہت یاد آتا۔ ہر نماز کے بعد بہت دعا کرتی کہ کاش وہ زندہ ہو اور واپس گھر آ جائے۔ اپنے بیٹے کی محبت میں ہی لوٹ آئے۔

کاش شاہد تم نے میری اور میرے بیٹے کی قدر کی ہوتی۔ میں نے تو ہر قدم پہ ہر لحہ تمہیں خوش رکھنے کی بہت کوشش کی۔ دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا اس گھر کی خدمت میں لگی رہتی کہ کسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو کوئی خفا نہ رہے۔ مگر جب قسمت کالی پڑ جائے تو اس کی سیاہی کو کون مٹائے۔

میری قسمت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ہم تین بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ ماں باپ ہم چاروں پر بہت جان دیتے تھے والد صاحب ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتے تھے۔ گھر ہمارا اپنا تھا۔ چھوٹا مگر ہر چیز سے مزین خوبصورت سجا ہوا۔ خدا کا شکر کہ ضرورت کی ہر چیز تھی گھر میں...... والد صاحب کو جو تنخواہ ملتی ہماری والدہ اس میں سے کچھ نہ کچھ بچا کر ایک سائیڈ پر رکھ دیتیں۔ کیونکہ ہم تین بہنوں کا بوجھ بھی تو اتارنا تھا۔ دو بہنوں کی منگنی ہو چکی تھی۔ ایک کی خالہ کے گھر دوسری کی ماموں کے۔ بھائی خدا نے دیا تو وہ بھی ٹانگوں سے معذور پولیو جیسی لعنت میں مبتلا۔

ویسے تو اللہ کا بہت کرم تھا گھر پر...... بس بھائی کی وجہ سے ماں باپ اپنی عمر سے زیادہ بوڑھے لگنے لگے تھے۔

بھائی کا بہت علاج کروایا کوئی کہتا ٹھیک ہو جائے گا کوئی کہتا نہیں ہو سکتا۔ کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا جس نے جو بتایا وہاں تک پہنچے۔ کتنی منتوں مرادوں کے بعد تین بہنوں کا اکلوتا بھائی خدا نے دیا بھی تو وہ بھی بیماری میں مبتلا کر کے۔ ہر دربار، تعویذ دعا، میری ماں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ پر یہ ایک ایسی آزمائش تھی جو ہمارے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

خیر ماموں اور خالہ نے شادی کی جلدی کرنی شروع کر دی تو امی ابو کو ان کی بات ماننا پڑی۔ اس طرح گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

میں چونکہ تیسرے نمبر پر تھی۔ دونوں بہنوں سے شکل وصورت میں بہت اچھی رنگت گوری، ناک کھڑی، نیلی نیلی آنکھیں لمبے بال قد کاٹھ بھی اچھا پہن اوڑھ کے سب سے اچھی لگتی۔ میں تھی تو ذہین پر پڑھنے کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی بس گھر کے کام کاج تھوڑی بہت سلائی کڑھائی وہ بھی موڈ بنے تو......

امی ابو بہت کہتے کہ بیٹا آگے بھی پڑھ لو میں نے بس پی ٹی سی کی اور تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا۔ کیونکہ یہ جاب ٹیچنگ مجھے پسند نہیں تھا۔ وہ تو بس کچھ دوستوں نے امتحان دیا تو میں بھی راضی ہو گئی کہ چلو کر لیتے ہیں۔ مجھے گھر میں رہنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ کیونکہ بھائی کی ذمہ داری اکیلی امی کہاں تک سنبھالتی اس کو سنبھالنا بھی بہت مشکل ہوتا۔ بہت غصہ کرتا تھا چڑچڑاپن اس کی طبیعت میں بہت تھا۔ بیماری کی وجہ سے اس کا جی چاہتا میں دوڑوں بھاگوں ابو کے ساتھ کام پر جایا کروں مگر ہم سب نے تو ہر طرح کی کوشش کر ڈالی مگر بے سود......

امی ابو اس کو بہت سمجھاتے کہ بیٹا ناامید مت ہو جایا کرو۔ دنیا میں کتنے لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں مگر وہ ہمت نہیں ہارتے...... مگر وہ سنی ان سنی کر جاتا۔

بس پتہ نہیں کیا تھا اس کو عجیب عجیب سی باتیں کرتا کبھی کبھی تو ہمیں خوف آنے لگتا۔ وہ یہی کہتا میری زندگی بیکار ہے میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ میں ایک بوجھ ہوں آپ سب پر، ہم لوگ اس کو سمجھا سمجھا کے تھک گئے۔ امی بہت روتی اکیلے میں مگر کسی کو نہ بتاتیں۔ میں چونکہ گھر ہوتی تو ہر منظر میرے سامنے ہوتا۔ امی ابو کو دیکھ دیکھ کے میرا دل کڑھتا کہ اتنا پیار کرنے والے والدین اور اتنا صبر ہے ان میں کہ خدا کا ہر دم شکر ادا کرتے ہیں۔ پر زبان پر ایک لفظ بھی شکوہ کا نہ لاتے۔

ماں باپ تو دس بچوں کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں مگر دس بچے ایک ماں باپ کا بوجھ کب اٹھاتے ہیں۔

دعا یہی کرنی چاہیے کہ جوان اولاد کا دکھ خدا کسی کو بھی نہ دے۔ اولاد نہ ہو تو اس کا دکھ اتنا نہیں ہوتا جتنا مل جانے کے بعد ہوتا ہے وہ بھی معذور اور اپاہج ہو۔ یہ مشکل گھڑی کٹھن آزمائش کٹے نہیں کٹتی۔ بہت بڑا امتحان ہوتا ہے ان ماں باپ کے لیے جو ساری زندگی اس اذیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ امی ابو بہت پریشان رہنے لگے بھائی کی ایسی باتوں کی وجہ سے۔

شادی کے دن قریب آ گئے دونوں بہنیں رخصت ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو گھر بالکل ہی ویران لگنے لگا۔ شروع شروع میں بہت تنہائی محسوس ہوئی۔ مگر بعد میں آہستہ آہستہ سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک ہونے لگا۔

ایک روز امی کسی کام سے خالہ کے گھر گئیں اور مجھے کہہ گئیں کہ بھائی کا خیال رکھنا میں ایک گھنٹے میں آ جاؤں گی۔ تم دروازہ بند کر لو۔

''میں نے کہا جی امی آپ بے فکر ہو کر جائیں۔''

امی چلی گئی تو میں گھر کے کاموں میں لگ گئی کہ جلد از جلد سارے کام ختم کر لوں۔

فاطمہ باجی...... فاطمہ باجی...... مجھے ایک گلاس پانی لا دیں۔ علی نے مجھے آواز دی تو میں کام چھوڑ کر اس کی طرف بھاگی۔

یہ لو پانی...... میں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے پانی پیا اور کہا میرا دل گھبرا رہا ہے مجھے باہر بیٹھنا ہے۔ میں اس کی وہیل چیئر باہر لے آئی۔

تو بولا آپ گیٹ کھولو میں دروازے کے ساتھ ہی بیٹھا رہوں گا۔ آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہوں گا۔

میں نے بہت منع کیا کہ امی آ جائیں تو پھر باہر بیٹھ جانا مگر ضدی تو وہ شروع سے ہی تھا۔ مجھے ہار ماننی پڑی اور گیٹ کھول کے باہر بیٹھا دیا۔

اب ادھر سے کہیں مت جانا ورنہ امی مجھے ڈانٹیں گی۔ میں اسے یہ کہہ کر اندر آ گئی۔ اکثر امی اور علی باہر

بیٹھ جاتے باتیں کرتے رہتے اور آتے جاتے لوگوں کو بھی دیکھتے۔

میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد علی کو جا کے دیکھتی رہی وہ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک دو دوست اس کے پاس آ گئے تھے اور وہ باتوں میں مصروف تھا ان کے ساتھ۔

میں نے سوچا علی دوستوں کے ساتھ لگا ہوا ہے تو میں اوپر کی چھت دھولوں۔ بہت گندی ہو رہی تھی۔ میں کچھ زیادہ ہی کام میں لگ گئی اور علی کا خیال ذہن میں نہ رہا۔

جب کچھ ٹائم گزر گیا تو میں نیچے آئی باہر دیکھا علی نہیں تھا۔ گھر کے اندر واش روم سب دیکھ لیا پر علی کہیں نہیں تھا۔ مجھے فکر لاحق ہو گئی۔ ایک علی کی پریشانی دوسرے امی کے غصے کا ڈر میرا سانس پھولنے لگا دماغ گھومنے لگا۔ آس پاس ادھر ادھر دیکھ کے آئی مگر علی کا کچھ پتہ نہیں۔ اس وقت علی کی عمر تیرہ سال تھی۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا میں نے فوراً خالہ کے گھر فون کیا کہ علی پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ امی خالہ بہن اور شہزاد جو میری بہن کے شوہر تھے آ گئے اور علی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔

مگر ہم قسمت کے پہلے ہی مارے ہوئے تھے کہ یہ خبر ہم پر قیامت بن کر ٹوٹی کہ علی روڈ کراس کرتے ہوئے گاڑی سے ٹکرا گیا اور اس کی فوراً ہی موت واقع ہو گئی۔

قیامت صغریٰ تھی آج ہمارے ہنستے بستے گھر میں ایک کہرام بپا تھا۔ پورا محلّہ رشتے دار کہاں کہاں سے لوگ آ گئے کچھ پتہ نہ تھا۔

علی کے دوستوں نے بتایا کہ اس وقت ہم سے باتیں کر رہا تھا اس کی باتوں میں بہت ناامیدی تھی آج مگر پہلی بار ایسا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اداسی پریشانی تھی۔ ہم نے پوچھا بھی علی کیا بات ہے مگر کچھ زیادہ بولا نہیں ہم نے بہت سمجھایا کہ ایسی باتیں مت کیا کرو۔ مگر پتہ نہیں آج کیوں وہ اتنا اداس تھا۔ ہم اپنے گھر چلے گئے۔ اب پتہ چلا کہ یہ روڈ کراس کر رہا تھا کہ ایک وین نے ٹکر مار دی اور علی وہیل چیئر سے دور جا گرا۔ دماغ پر اس قدر چوٹیں تھیں کہ ہاسپٹل جاتے جاتے ہی علی نے دم توڑ دیا۔

ماں باپ علی کی موت کے بعد اور بوڑھے ہو گئے۔ امی کو تو جیسے کوئی کام ہی نہ رہا۔ ہر وقت علی کی تصویر دیکھتی رہتیں اور روتی رہتیں۔

ابو سمجھاتے کہ نیک بخت مت رویا کرو۔ خدا نے ہمیں آزمائش میں ڈالا اور اس کا حکم اسی طرح تھا۔ ہمیں اس کڑی اور کٹھن آزمائش سے نکلنے کا بھی یہی ذریعہ بنتا تھا۔ بس شکر ادا کرو اور اس کی بخشش کے لیے دعا کیا کرو۔ یہ رونا دھونا اس کے کسی کام کا نہیں پڑھائی کرو جتنا کر سکتی ہو۔

ابو بہت حوصلے سے بات کرتے اپنا دکھ اپنی تکلیف کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔

"خدا بھی اپنے بندوں کو ان کی ہمت اور طاقت سے زیادہ انہیں تکلیف نہیں دیتا۔ جتنی ان میں برداشت ہو اتنا ہی آزمائش میں ڈالتا ہے۔"

خدا کے کام میں کچھ نہ کچھ راز پوشیدہ ہے۔ یہ تو بس ہم صرف انسان ہی ہیں جو اس کی اس حکمت کو سمجھ نہیں پاتے اور گھبرا کر شکوے کرنے لگ جاتے ہیں۔

علی کے قل، دسواں اور پھر چالیسواں ہو گیا۔ شب و روز اپنے اپنے مرکز پر گھومتے رہے چلتے رہے، گزرتے رہے۔

ایک روز میں گھر کی صفائی میں مصروف تھی کہ امی نے کہا۔

فاطمہ بیٹا ادھر آؤ۔ جی امی بس میں آئی۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے وہ کر لوں۔

جی امی بولیں کیا بات ہے؟ بیٹا تم سے ایک بات کرنی ہے امی خیر تو ہے ناں۔ اس میں پوچھنے والی کون

سی بات ہے؟ بولیں کیا بات ہے؟

ہاں بیٹا ایک رشتہ آیا ہے تمہارے لیے...... اچھے شریف لوگ ہیں۔

شام میں ہمارے گھر آنا چاہ رہے ہیں۔ مگر میں نے تمہارے ابو سے نہیں پوچھا اس لیے کل کا کہا ہے ان لوگوں کو۔

فاطمہ یہ سن کر رونے لگی۔ نہیں امی میں آپ دونوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی آپ پہلے ہی اکیلے ہیں پھر میں بھی چلی گئی تو......

"نہیں نہیں آپ ان لوگوں کو منع کر دیں۔" فاطمہ نے روتے ہوئے کہا۔

نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے۔ یہ تو ماں باپ کا فرض ہے کہ جب اولاد جوان ہو جائے تو وہ اپنے فرائض کو ادا کرنے میں دیر نہ کریں اور بیٹیاں کب گھروں میں بیٹھی اچھی لگتی ہیں۔

وہ تو معصوم سی تتلیاں ہوتیں ہیں جو اپنے پروں کے کچھ رنگ ماں باپ کو دے کر دوسروں کے گھروں کو رنگین کرنے چلی جاتی ہیں۔ یہ تو قانون فطرت ہے میری جان اور فاطمہ تو بس روتی رہی کر بھی کیا سکتی تھی۔

شام کو رضوان صاحب گھر آئے۔ ابو کا نام رضوان تھا میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی۔

ابو جب کھانا کھا کر اپنے کمرے میں گئے تو امی نے رشتے کا بتایا تو ابو نے حامی بھر لی کہ دیکھنے میں کیا حرج ہے؟

اس طرح شام میں وہ لوگ آ گئے شاہد نام تھا اس لڑکے کا جس کے لیے وہ مجھے دیکھنے آئی تھیں۔ متوسط گھرانہ تھا۔ سسر زندہ نہ تھے۔ ساس اور ایک بہن تھی۔

جاتے ہوئے کچھ پیسے میرے ہاتھ پہ رکھ دیئے اور امی ابو کو بھی آنے کا کہا دو چار دن بعد میری دو بہنیں امی ابو، شاہد کو دیکھنے کے لیے گئے اور اس طرح بات پکی ہو گئی۔ شادی بھی جلد کرنے کا کہا ان لوگوں نے۔

میں اپنی فیلنگ کس کو بتاتی کہ میں امی ابو کو چھوڑ کے جانا نہیں چاہتی تھی مگر میری کون سنتا۔

مایوں، مہندی، برات سب کچھ بہت اچھے طریقے سے ہو گیا۔ اور میں شاہد کی دلہن بن کر اس کے گھر میں آ گئی۔ دو سال شاہد نے میرا بہت خیال رکھا۔ ساس اور نند بھی اچھی تھیں محبت اور پیار کرنے والی۔ نند اپنے گھر کی تھی۔ خوشحال اور آباد آتی جاتی رہتی۔ ایک ملازمہ تھی جس کا نام زرینہ تھا۔ بالکل گھر کے فرد کی طرح۔ میں نے بھی کبھی اس کو ملازمہ نہیں سمجھا۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی۔ حتیٰ کہ ہر چیز کا وہ بھی مجھے بہت عزت دیتی مجھے کوئی کام کرنے نہ دیتی۔ مگر میں نے تو اپنا سارا گھر سنبھالا ہوا تھا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا کہ اسی دوران میری طبیعت کچھ ناساز رہنے لگی۔ ساس کو بتایا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ جہاں سے نئے مہمان کے آنے کی خوشی ملی۔ میری ساس پھولے نہ سمائیں، گھر آ کر مجھے کہا۔

فاطمہ اب تم نے اپنا بہت خیال رکھنا ہے کھانا پینا، سونا جاگنا ہر طرح کا خیال رکھنا اور کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے اب تمہیں۔

زرینہ ہے نا وہ سب کر لیا کرے گی تم بس کھاؤ اور آرام کرو۔

قسمت والوں کو ایسی ساس ملتی ہے۔ میں بھی ان میں سے ایک تھی۔ شام کو شاہد جب گھر آئے تو میں نے ان سے کہا شاہد ایک بات کرنی تھی آپ سے......

ہاں بولو...... شاہد جو لیپ ٹاپ پر مصروف تھے میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ایک خوشخبری ہے......

اچھا وہ کیا......!

شاہد نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

آپ باپ بننے والے ہیں۔

کیا......؟ کیا کہا۔ میں باپ بننے والا ہوں۔

یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ شاہد نے غصے سے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور مجھے گھور کے دیکھنے لگے۔

ہاں شاہد آپ واقعی باپ بننے والے ہیں میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گی۔

لیکن مجھے ابھی اولاد نہیں چاہیے میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ میں ان ذمہ داریوں میں ہرگز ہرگز نہیں پڑنا چاہتا۔ تم یہ سب ختم کروا دو۔ پلیز...... شاہد کی یہ بات سن کر میں ششدر رہ گئی۔

کیا یہ کیا کہہ رہے ہیں شاہد؟ میں کفران نعمت کروں۔ جو دو سال بعد مجھے اس خوشی سے نواز رہا ہے۔ اس کی رحمتوں اور نعمتوں کو ٹھکرا دوں۔

آپ نے یہ سوچا بھی کیسے؟ میں تو سمجھی تھی کہ آپ یہ سن کر خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے۔

میری محبت آپ کے دل میں اور بڑھ جائے گی۔ شاہد ہمارے گھر میں خوشی آنے والی ہے، آپ ایسی باتیں مت کریں۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کو اولاد جیسی نعمت ملتی ہے۔ شاہد میں نے ان دو سالوں میں کتنی دعائیں مانگی ہیں، کتنا روئی ہوں؟ اس نعمت کے لیے اس خوشی کے لیے، کتنا تڑپی ہوں؟ آپ کو کبھی خبر بھی نہ ہونے دی۔ آج خدا نے میری سن لی ہے تو میں ناشکری کروں۔

اس خوشی کو ٹھکرا دوں جو میرے گھر کی دہلیز تک پہنچ چکی ہے۔

نہیں شاہد میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔

بند کرو اپنی یہ بکواس...... مجھے اپنا ایک اسٹیٹس بنانا ہے۔ آگے بڑھنا ہے، بہت آگے۔ میں ان جھمیلوں میں پڑ کر قید ہو جاؤں گا اور قید مجھے پسند نہیں۔

اگر تم نے یہ سب ختم نہ کرایا تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ کرتی رہنا تم اکیلے پرورش، اپنی اس آنے والی خوشی کی۔ جب میں ہی نہیں ہوں گا ادھر تو، تو تم تنہا عورت کیسے پال سکتی ہو اولاد کو...... اچھی تربیت بھی نہ کر سکو گی۔ اس معاشرے میں اکیلی عورت کا کوئی مقام نہیں ہوتا، وہ مرد سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔

آپ کچھ بھی کہیں شاہد...... میں اس خوشی کو پروان چڑھاؤں گی۔ اچھا شہری بناؤں گی ٹھیک ہے اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو پھر اچھے برے کی تم خود ذمہ دار ہو۔

میں شاہد کی سوچ کو سوچتی رہی کہ شاہد ایسے تو نہ تھے۔ پھر کیوں ایسی سوچ رکھی انہوں نے وہ بھی اپنی اولاد کے لیے۔

اس بحث کے بعد شاہد مجھ سے زیادہ بات نہ کرتے۔ زیادہ وقت باہر گزارنے لگے۔ گھر میں آتے تو خاموش کسی سے بھی بات نہ کرتے۔ اپنی ماں کے پاس بھی زیادہ نہ بیٹھتے۔ میری ساس بھی ہر طرح سے ان کو سمجھا بیٹھی۔ اٹھتے بیٹھتے ساس کی شاہد کے ساتھ یہی تکرار یہی بات ہوتی۔

شاہد تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ آخر تمہارے ذہن میں ایسا کیا ہے جو گھر آئی خوشی کو ٹھکرا رہے ہو؟

بیٹا: میں اب بوڑھی ہو چکی ہوں میری زندگی کتنی ہے۔ کچھ پتہ نہیں۔ میں چاہتی ہوں میری زندگی میں ہی میرے بیٹے کے بچے اس گھر کے آنگن میں کھیلیں، پروان چڑھیں۔ میں کتنی حسرت سے فاطمہ کو اس گھر کی بہو بنا کر لائی ہوں۔ کتنی سلیقہ شعار، کتنی سلجھی ہوئی بچی ہے وہ۔

اس گھر کو اپنا گھر بنا لیا ہے اس نے کبھی شکایت کا موقع نہیں آنے دیا۔ تمہارا کتنا خیال رکھتی ہے۔

بیٹا تم بہت غلط کر رہے ہو اس کے ساتھ اپنے ساتھ بلکہ ہم سب کے ساتھ۔ ہوش کے ناخن لو مت کرو ایسا ظلم۔

مت خدا کی خدائی میں مداخلت کرو۔ ڈرو اس خدا سے، توبہ کر لو خوشی کو کبھی بھی نہیں ٹھکراتے۔ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

تم نے اب گھر بھی دیر سے آنا شروع کر دیا ہے۔ سارا دن تم کوئی خبر نہیں لیتے اس کی۔

مگر شاہد تھا ہر جذبے، ہر احساس سے لاپتہ۔ بس ایک ہی رٹ کہ مجھے ابھی اولاد نہیں چاہیے۔ میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ سب تھک چکے شاہد کو سمجھا سمجھا کے۔

گھر کا ماحول کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔ زندگی ایسے ساکت سی ہو چکی تھی شاہد نے اب راتوں کو بھی گھر آنا چھوڑ دیا۔

فاطمہ کی راتیں شاہد کا انتظار کرتے کرتے گزرنے لگی۔ بہت دعائیں مانگتی، بہت روتی لیکن قسمت کی ستم ظریفی کہ اس شخص کو کسی کا خیال ہوتا تو واپس لوٹتا۔

پھر ایک دن شاہد کا فون آ گیا۔ میری ساس جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ میں باورچی خانہ میں کھانا بنا رہی تھی کہ بیل کی آواز پر میں کام چھوڑ کر فون کی طرف لپکی۔

ہیلو...... السلام علیکم...... فاطمہ نے فون کان سے لگاتے ہی سلام کیا۔

دوسری طرف شاہد تھا۔

فاطمہ پھر تم نے کیا سوچا کیا فیصلہ کیا اس بچے کے بارے میں......

میرا جواب اب بھی وہی ہے میں اپنا فیصلہ کبھی نہیں بدلوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

تو ٹھیک ہے رہو تم اپنے فیصلے پہ قائم۔ میں آج شام یہ ملک ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے...... تمہیں تمہاری خوشی مبارک ہو اور پھر فون بند ہو گیا۔

ہیلو ہیلو...... شاہد...... میری بات سنیں۔ مگر فون تو کب کا بند ہو چکا تھا اور فاطمہ کی آواز حلق میں ہی اٹک گئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

فاطمہ پاس رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ جسم ایسے جیسے کسی نے روح نکال لی ہو۔ دل و دماغ دونوں پھٹ جائیں گے۔ مت جائیں شاہد واپس لوٹ آئیں۔ میری قربانیوں کی اتنی بڑی سزا مت دیں۔ میرا قصور تو بتائیں۔ میرا گناہ کیا ہے۔ شاہد اپنی بوڑھی ماں کا ہی خیال کر لیتے۔ یہ آہ و بکار، یہ گریہ زاری کون سنتا۔ وہاں تو صرف فاطمہ کی آواز کی گونج تھی جو صرف وہ خود سن سکتی تھی۔

فاطمہ نڈھال ہونے کو تھی کہ جمیلہ بیگم بھاگتی ہوئی آئیں تو فاطمہ کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں اور زرینہ کو آوازیں دینے لگیں۔

ان کا بی پی شوٹ کر گیا ہے۔ لیکن شکر ہے کوئی خطرے والی بات نہیں ہے یہ دوائی دے رہا ہوں۔ یہ لگاتار دیتے رہیں اور ان کا بہت زیادہ خیال رکھیے گا۔ ان کو آرام کی بہت سخت ضرورت ہے اور پلیز کوشش کریں کہ یہ زیادہ ٹینشن نہ لیں۔

جی بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب......

جمیلہ بیگم اور زرینہ اس کو لے کر گھر آ گئیں۔ جب فاطمہ کی طبیعت میں کچھ سکون آیا تو جمیلہ بیگم کو ساری بات سنائی۔

جمیلہ بیگم کو شاہد کے طور طریقوں سے یہی معلوم ہو

خمیازہ

ایک شخص نے بس میں اپنے قریب بیٹھے ہوئے مایوس اور افسردہ شخص کو دیکھ کر باتوں باتوں میں کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ جیسے آپ نے زندگی میں عشق کیا اور ناکام ہو گئے۔"

وہ صاحب جھلا کر بولے۔ "میں نے زندگی میں ایک ہی بار عشق کیا تھا اور بد قسمتی سے وہ کامیاب ہو گیا تھا۔"

(عظیم کھوکھر، لاہور)

رہا تھا وہ سوائے افسوس کے کر بھی کیا سکتی تھیں۔
وہ بس اتنا ہی کہہ سکیں کہ جو شخص خود اپنے ہاتھوں سے خوشیوں کا گلا گھونٹتا ہے خوشی پھر کبھی اس کے در پہ دستک نہیں دیتی۔ جمیلہ بیگم نے ایک سرد آہ بھری۔
اب گھر میں ساس میں اور زرینہ تھے۔ دن شاہد کی یاد میں گزرتے رہے گھر میں میری ساس اور خدا کی ذات کے سوا کوئی سہارا نہ تھا۔ میری ساس نے میری سگی ماں کی طرح میرا خیال رکھا اور ہر قدم پہ میری حوصلہ افزائی کی مجھے تنہائی کا احساس نہ ہونے دیا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا آسرا تھے۔ میرے سسر اچھی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے ساس کو پنشن مل جاتی کچھ جمع پونجی تھی تو گزارہ ہو رہا تھا۔
مگر دکھوں کو بھلانے کے لیے پیسہ نہیں اپنوں کی محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ دن بھی آ پہنچا جب سعد اس دنیا میں آیا۔ میری ساس اور میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ خالہ ماموں، امی ابو سب پہنچ چکے تھے۔ سب بہت خوش ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔
نہیں آیا تو بس ایک وہ ہی نہیں آیا۔ جس کی چاہت میں دن رات ایک کر دیا۔ میں سعد کو لے کر گھر آ گئی۔ اتنا پیارا، معصوم بھولا سا، ڈھیروں ڈھیر پیار کر ڈالا میں نے اسے۔ مجھے وقت گزارنے کے لیے مصروفیت مل گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ جمیلہ بیگم سعد اور میں اپنی خوشیوں میں مگن ہو گئے۔
سعد کچھ سمجھدار ہوا تو میں نے گورنمنٹ سکول میں جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ میری ساس نے مجھے بہت روکا۔
فاطمہ بیٹا کیا ضرورت ہے اس مصیبت میں پڑنے کی اللہ کا دیا بہت کچھ ہے میرے پاس وہ سب تمہارا اور سعد کا ہی تو ہے۔
امی جان وہ سب تو ٹھیک ہے مگر میں خود اپنا اور سعد کا بوجھ اٹھانا چاہتی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو جاب بھی جلدی مل جائے گی۔
ساس نے کیا کہنا تھا چپ ہو گئیں۔ فاطمہ کی خواہش کے آگے۔
سعد سکول کی زندگی سے گزر کر چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ تو میں نے بھی نوکری کو خیر آباد کہہ دیا۔ ساس کافی کمزور ہو چکی تھیں۔ مجھے یہاں تک پہنچانے میں مجھے اندھیروں سے نکال کر زندگی گزارنے کے گر سکھائے۔ ہر قدم پہ میری ہمت بندھائی بہت ساتھ دیا انہوں نے میرا۔ ورنہ شاہد کے بعد تو میں بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔
شاہد کو گئے ہوئے عرصہ بیت گیا ان کی نہ کوئی خبر، نہ اطلاع، وہ اپنی دنیا میں مست تو ہم اپنی خوشیوں میں مگن۔
زرینہ، فاطمہ بی بی کھانا لگا دوں یا بڑی بیگم صاحبہ کے فارغ ہوتے کا انتظار کریں گی۔
نہیں بی بی...... میں نے کبھی بھی زرینہ نام نہیں لیا۔ عمر میں مجھ سے بڑی تھیں۔
امی جان نماز سے فارغ ہو جائیں تو اکٹھے ہی کھانا کھالیں گے مگر فاطمہ بیٹی ان کو ابھی بھوک نہیں ہے میں نے پوچھا تھا ان سے۔
چلو ٹھیک ہے جب امی کو بھوک لگے گی تو میں بھی کھالوں گی۔
ابھی میرے سر میں درد ہے ایسا کریں تیل کی مالش کر دیں نا کہ کچھ سکون مل جائے میں تیل لے کر آتی ہوں ویسے بھی کافی دنوں سے آپ نے سر میں تیل نہیں لگوایا۔
آپ اپنا خیال بھی نہیں رکھتیں آئے دن سر درد کی شکایت کرتی رہتی ہیں۔
اس دفعہ سعد بیٹا آئیں گے تو کہوں گی کہ آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر کو چیک کروائیں۔
ارے نہیں بی بی ...... معمولی سا سر درد ہے موسم

بدل رہا ہے جس کی وجہ سے درد ہے میں بیمار تھوڑا ہی ہوں اور ویسے بھی ان چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کے لیے ڈاکٹر کے پاس کیا جانا۔
زرینہ نے سر کی مالش کی تو فاطمہ کو سکون ملا۔ پھر اس نے اٹھ کر نماز پڑھی اور امی جان کے کمرے کی طرف ہولی۔
آپ سو رہی ہیں امی جان کھانا نہیں کھائیں گی۔
بس بیٹا کچھ جی نہیں چاہ رہا تھا کھانے کو تو سو گئی نماز پڑھ کے۔ فاطمہ کیا تم نے کھانا کھا لیا۔
نہیں امی جان ہم گھر میں دو ہی تو لوگ ہیں تو کیا وہ اب الگ الگ کھانا کھائیں گے۔
چلو پھر زرینہ سے کہو کھانا لگا دے میں آ رہی ہوں۔
آج موسم میں کچھ خنکی سی تھی۔ ہلکی ہلکی شبنم گھاس پر پڑتی بھلی لگ رہی تھی۔ جیسے جگنوؤں کی روشنی سے موتی زمین پر بکھرے پڑے ہوں۔
فاطمہ نے ٹی وی آن کیا تو نیوز دیکھنے بیٹھ گئی۔ امی جان صبح کی نماز پڑھ کر ہلکا پھلکا سا ناشتہ کر کے کچھ دیر آرام کرتی تھیں۔ اس لیے فاطمہ اکیلے ہی چائے کا مگ لے کر ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔
سعد کو گئے ہوئے آج دس دن ہو چکے تھے۔ بہت یاد آ رہا تھا۔ حالانکہ اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کبھی ایک ہفتے بعد کبھی پندرہ دن بعد تو کبھی کبھی تو کچھ دن بعد ہی چکر لگ جاتا تھا۔ مگر آج فاطمہ کو سعد کی یاد شدت سے آ رہی تھی۔
سوچ رہی تھی کہ فون کر کے حال احوال پوچھوں جبکہ فون روز کرنا سعد کا معمول تھا۔ دن میں دو چار بار تو ضرور کرتا تھا۔
مگر ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ بچے سامنے بھی ہوں ذرا ادھر ادھر ہو جائیں تو ماں کو بے چینی ہونے لگ جاتی ہے۔
سعد اب جوان تھا مگر جب بھی آتا ماں اور دادی سے بچوں کی طرح لاڈ کرتا۔ گود میں سر رکھ کر گھنٹوں لیٹا رہتا۔
سعد نے اپنے باپ کو تو نہیں دیکھا تھا مگر تصویروں میں خوب پہچانتا تھا اور کئی بار پوچھا دادی سے ماں سے......
مگر فاطمہ نے ہمیشہ شاہد کا ایک اچھا تصور پیش کیا اس کے سامنے مگر اکثر تنہائی میں سعد نے اپنی ماں اور دادی کو شاہد کی تصویر کے سامنے روتے دیکھا تھا۔ سب سمجھتا تھا وہ مگر باپ کے بارے میں مزید پوچھ کر ان کو دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔
ٹرن ٹرن...... فون کی گھنٹی بجی...... فاطمہ صوفے پر بیٹھی تھی کہ فون بج اٹھا۔
السلام علیکم......!
دوسری طرف سعد بول رہا تھا۔
السلام علیکم امی جان......
جیتے رہو بیٹا...... میں تھوڑی دیر پہلے تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔ کیسے ہو میرے لال ڈیوٹی کیسی جا رہی ہے۔
طبیعت صحت کیسی ہے کب آ رہے ہو؟ فاطمہ نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔
سعید کو ہنسی آ گئی۔ امی جان میں بالکل ٹھیک ہوں۔ صحت بھی ٹھیک ہے۔ انشاء اللہ عنقریب گھر آؤں گا اور آپ سنائیں کیسی ہیں۔ دادو کیسی ہیں؟ کیا کر رہی ہیں میری بات کروائیں۔ بیٹا کچھ طبیعت نہیں ٹھیک تھی امی کی اس لیے اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔ اچھا امی جان ان کو میرا بہت بہت سلام اور پیار دیجئے گا اور آپ بھی اپنا بہت خیال رکھیے گا۔
اچھا اللہ حافظ......
اللہ حافظ بیٹا......
سعد کی سالگرہ بھی آنے والی تھی۔ فاطمہ سوچ رہی

تھی کہ اس بار سعد کو کیا تحفہ دوں چلو اس بار سعد کو مارکیٹ ساتھ لے جا کر گفٹ پسند کروادوں گی۔

سعد کو خدا نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ ذہانت، اچھی سوچ، اچھا شہری ہونے کے ساتھ ساتھ اس ملک اس دھرتی کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ آج کل وہ ضرب عضب آپریشن میں مصروف تھا۔

فاطمہ اور دادی ہر گھڑی ہر لمحہ اس کی کامیابی کے لیے دعائیں کرتیں۔

ایک شام دونوں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں کہ خبر آئی کہ آپریشن میں دہشت گردوں کا سرغنہ پکڑا گیا۔ کچھ دہشت گرد بھاگنے میں کامیاب ہو گئے کچھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں۔

زرینہ بی بی جی یہ تو بہت برا ہوا جو دہشت گرد فرار ہو گئے اب وہ نجانے کس کس جگہ جا کر دھماکے کریں گے۔ ایسے دہشت گردوں کو سر عام لٹکا کر گولیاں مار دینی چاہئیں۔

زرینہ جو کام کرتے کرتے اچانک سے ان کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اپنی رائے دینے لگی۔

فاطمہ! ہاں ہونا تو ایسے ہی چاہیے مگر حکومت کے کام حکومت ہی جانے۔ لیکن جب آرمی کو سارا ہولڈ دے دیا ہے تو وہ انشاء اللہ ضرور ایسے لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچائے گی۔

جمیلہ بیگم بھی بولیں...... اگر اس طرح کی سزائیں ہو جائیں مجرموں کو تختہ دار پر لٹکایا جائے تو یہ معاشرہ ایسی برائیوں سے پاک ہو جائے۔

دعا ہی کرتے ہیں یا اللہ اس پاک سر زمین کو دشمنوں اور دہشت گردوں کے ناپاک ارادوں سے ہمیشہ کے لیے پاک صاف کر دے۔

اب دونوں کو سعد کے فون کا انتظار تھا کہ وہ اس کامیاب آپریشن کی خوشخبری کب سنائے گا۔

پھر دونوں اٹھ کر عشاء کی نماز پڑھنے چلی گئیں اور کھانا کھا کر سونے لیٹ گئیں۔

صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد فاطمہ نے زرینہ کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی کروائی تھی اور کافی کام تھے جو طبیعت کی وجہ سے چھوڑے ہوئے تھے۔

دل تھا کہ اب تو سعد نے گھر آنا ہی ہے پھر سالگرہ کا انتظام بھی کرنا ہے۔ تو سب کام ختم ہو جائیں تو ٹینشن ختم ہو جائے گی۔

اتنی تھکاوٹ ہو چکی تھی آج تو کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ عصر کا وقت تھا۔

فاطمہ اور جمیلہ بیگم لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں کہ گیٹ کی بیل بجی۔

زرینہ جو پاس کھڑی پودوں کو پانی دے رہی تھی دروازے کی طرف لپکی۔

گیٹ کھولتے ہی سعد کو سامنے پا کر اندر کی طرف بھاگی تا کہ جلدی سے بتائے کہ سعد بیٹا آ گئے ہیں۔

پیچھے پیچھے سعد فوجی وردی پہنے ان دونوں کی طرف آ گیا۔ دونوں ایک دم سے سعد کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئیں۔ دادی نے جی بھر کر بلائیں لیں۔ ادھر فاطمہ کا بھی یہی حال تھا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ زرینہ سعد بیٹے کے لیے چائے کے ساتھ کھانے کو کچھ لے آؤ۔

پھر دادی نے آپریشن کے بارے میں پوچھا کہ کس طرح تم اس مشن میں کامیاب ہوئے اور مجرموں کو سزا سنائی کورٹ نے یا ابھی ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے۔

ادھر فاطمہ کے بھی یہی سوال تھے۔

خیر کچھ کھانے پینے کا سلسلہ چلا پھر باتیں کرتے کرتے تینوں اندر آ گئے۔ سعد چونکہ تھکا ہوا تھا کچھ آرام کرنا چاہتا تھا۔

اس لیے وہ فریش ہو کر اپنے روم میں چلا گیا۔

زرینہ جاؤ سعد کو اٹھا دو اب تو شام بھی ڈھل چکی

رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے پھر سو جائے۔

زرینہ! جی اچھا بیگم صاحبہ کہہ کر سعد کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

سعد اتنی بڑی کامیابی سے لوٹا تھا تو فاطمہ نے کھانے میں بہت کچھ بنالیا۔ کھانے کی ٹیبل پر باتوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔

سعد نے دادی اور فاطمہ کو صبح اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ دونوں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

کیوں بیٹا کدھر جانا ہے؟

خیر تو ہے ناں...... کوئی لڑکی پسند کر لی ہمارے بیٹے نے جو دکھانے لے جانا ہے۔

نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ شادی تو میں آپ دونوں کی مرضی اور پسند سے ہی کروں گا۔

تو پھر کدھر جانا ہے میرے لال......

دادی اتنے پیار سے اپنے پوتے کو دیکھ کر پوچھ رہی تھیں۔

بس دادو آپ اور مما صبح دس بجے میرے ساتھ چل رہی ہیں تو دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگیں۔

لیکن سعد تمہاری سالگرہ ہے پرسوں بیٹا......

اوہو مما میں اب بچہ تھوڑا ہی ہوں جو سالگرہ کرتا پھروں۔ میں اب ایک ذمہ دار آفیسر ہوں۔

مگر بیٹا تم ہمارے لیے تو چھوٹے ہی ہو ناں......

اچھا مما دیکھتے ہیں۔

صبح کا سورج اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ جمیلہ بیگم اور فاطمہ تیار ہو رہی تھی۔

دونوں سعد کی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ سفر آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا اور منزل قریب آ رہی تھی۔ کہ اچانک سعد نے گاڑی پولیس اسٹیشن روکی اور وہ دونوں سعد کے پیچھے آہستہ آہستہ چلنے لگیں۔

سعد سر جھکائے آگے آگے چلتا رہا آخر منزل آ گئی اور سعد ایک سلاخ کے پیچھے کھڑے انسان کے سامنے پہنچ گیا۔ پیچھے پیچھے فاطمہ اور جمیلہ بیگم سوچوں کے بھنور میں چلتے چلتے سعد کے ساتھ آ کھڑی ہوئیں۔

سعد بیٹا یہ تم ہمیں کدھر لے آئے ہو کون ہے یہاں کس سے ملوانا ہے۔

ماں کی آواز کانوں میں پڑتے ہی ہمت جواب دینے لگی۔ جذبات بے قابو ہو گئے۔ شرمندگی کے احساس نے دل کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اپنا آپ بہت چھوٹا اور غلیظ لگنے لگا۔ یا اللہ یہ کس مقام پر زندگی لے آئی مجھے میں اب کیسے سامنا کروں گا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

کانسٹیبل نے با آواز بلند کہا۔ کیا تمہیں آواز نہیں آ رہی کہ تمہاری ملاقات آئی ہے۔ آواز کے کان میں پڑتے ہی شاہد نے گھوم کر اپنی بوڑھی ماں اور معصوم بیوی کو دیکھا۔

ایک دم سے دونوں سکتے میں آ گئیں۔ شاہد تم اور یہاں اس جیل کی سلاخوں میں۔

شاہد نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کے ہاتھوں کو چومنا چاہا۔ مگر جمیلہ بیگم ایک دم سے پیچھے ہٹ گئیں اور منہ پھیر لیا۔

امی جان مجھ سے منہ مت موڑیں میں آپ کا گناہ گار فاطمہ کا گناہ گار اور خاص طور پر اپنے بیٹے کا......

آپ لوگوں کو چھوڑ کر میں ایک لمحہ بھی سکون سے نہ رہ سکا۔ بہت اذیت میں زندگی گزاری۔ بہت یاد کیا؟ آپ سب کو مگر میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ میں برائیوں میں پڑ گیا، آپ سے دور جانے کی سزا بہت کٹھن ملی ہے مجھے۔

جو لوگ خدا کے قانون اور اصولوں میں مداخلت کرتے ہیں اور ناشکری کرتے ہیں وہ دین و دنیا دونوں سے نکل جاتے ہیں۔

شاہد میں نے تمہیں کبھی بد دعا نہیں دی کیونکہ ماں کبھی بھی اپنی اولاد کو بد دعا نہیں دیتی۔ اس کی تو صرف

ایک آہ سے فرش سے عرش تک ہل جاتا ہے۔ تم معافی کے قابل تو نہیں ہو پر پھر بھی میں نے تمہیں معاف کیا۔

اب اس کی نظر فاطمہ کی طرف تھی کہ وہ بھی کچھ بولے شاہد کے پاس الفاظ جیسے ختم ہو چکے تھے۔ سوائے معافی مانگنے کے اور ہاتھ جوڑنے کے سوا۔

فاطمہ کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ ایک ہارا ہوا انسان جس کے پاس زندگی چند گھنٹوں کی مہمان تھی اس سے بیتی ہوئی زندگی کا کیا حساب لینا۔

بس وہ یہی کہہ سکی شاہد احمد دیکھ لو اپنے آفیسر بیٹے کو جو اس ملک کا ایک ذمہ دار شہری...... ایک پروقار شخصیت محبت کرنے والا بیٹا، ایک خاص شخص، زندگی کی ہر اونچ نیچ سمجھنے والا، ایک ماں کا فخر ہے۔

شاہد احمد ایک بات تم بھول گئے کہ عورت کبھی بھی کمزور نہیں ہوتی۔ عورت کا کام صرف مرد کی خدمت یا گھر کی چار دیواری تک محدود رہنا نہیں ہے۔ جب تم جیسے مرد جو عیش پرستی میں پڑ کے عورت کو بیچ راہ میں چھوڑ جاتے ہیں تو تم مرد کیا سمجھتے ہو کہ عورت کی زندگی اب ختم ہوگئی۔ نہیں شاہد احمد تم لوگ ہی اس کو زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ سکھا جاتے ہو۔ تاکہ وہ اپنا دفاع کر سکے معاشرے کے ایسے مردوں سے جو اسے میلی آنکھ سے دیکھتے ہیں میں نے بھی بہت سی نظروں کا سامنا کیا مگر میری منزل میرا جنون، میرا مقصد اپنے بیٹے کو پروان چڑھانا تھا۔ ماں ان پڑھ ہو یا پڑھی لکھی اس کی خواہش اس کی اپنی اولاد کے لیے ہی رہی ہے کہ وہ اچھا انسان بن سکے۔ دیکھو شاہد احمد تم ایک مرد ہو کر بہک گئے خود کو کس مقام تک لے آئے نہ اچھے شہری بن سکے اور نہ ہی اچھے انسان۔

آج میرا بیٹا میرا فخر، میرا مان ہے۔ تمہیں اپنے زور بازو پر یقین تھا اور نہ خدا کی ذات پر۔ تمہیں یقین تھا تو بس پیسہ، گلیمر سوسائٹی میں نام کمانا۔ خوب نام اور پیسہ کمایا تم نے شاہد احمد کہاں ہے وہ سب کچھ یہ جیل کی سلاخیں جن کے پیچھے کھڑے ہو کر تم کتنے مجبور اور لاچار لگ رہے ہو۔

فاطمہ کی آنکھوں کا سیلاب بہتا رہا وہ روتی رہی، بولتی رہی مگر جذبات تھے کہ کنٹرول میں نہ تھے۔

اور شاہد احمد معافی مانگتا رہا، سسکتا رہا۔

خدا نے عورت کا دل بہت بڑا بنایا ہے معاف کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ مرد کے ظلم و ستم سہنے کے باوجود۔

شاہد احمد میں نے تمہیں اپنے بیٹے کے صدقے معاف کر دیا۔

پھر جمیلہ بیگم اور فاطمہ گلے مل کر رونے لگیں۔ زندگی کس دوراہے پر لے آئی۔ آج پھر اس کی اور سعد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جذبات کو کنٹرول کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا کہ اتنے میں کانسٹیبل کی آواز آئی تالا کھلا اور شاہد احمد کو سلاخوں سے باہر لایا گیا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی پیروں میں بیڑی ڈالے شاہد احمد زندگی کی آخری بازی بھی ہارنے جا رہا تھا۔ کیونکہ شاہد ہی دہشت گردوں کا سرغنہ تھا اور آج رات بارہ بجے اس کو تختہ دار پر لٹکایا جانا تھا۔

شاہد سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے اپنے گھر کا ایڈریس پولیس کو دیا جہاں سے اسے پتہ چلا کہ اس کا بیٹا آرمی کا ایک بڑا آفیسر ہے۔

شاہد نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ سعد پہلے ہی مل چکا تھا۔ مگر دادی اور فاطمہ کو بتانے کی ہمت نہ تھی۔

باہر آ کر شاہد نے فاطمہ سے کہا کہ آخری بار میں اپنے بیٹے کو گلے لگا لوں تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔

فاطمہ بس گم صم شاہد کو تکتی رہی کہ زندگی نے شاہد سے ملوایا بھی تو کس دوراہے پر نہ وہ شاہد کو زندگی کی دعا دے سکتی تھی اور نہ ہی موت کی بددعا......

☆☆☆

افسانہ

نیکی برباد، گناہ لازم

صائمہ نور

حق کے سامنے ڈٹ جانا ہمت والوں
کا کام ہے، ایسے بہادر لوگ دوسروں کی مدد
کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ انہیں اس
نیکی کے بدلے کس کڑے امتحان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ایک باہمت نوجوان کی سرگزشت جسے وقت نے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا

"دوست تمہیں یہاں آئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے، اور تم سے ملنے تمہارے گھر سے کوئی بھی نہیں آتا......؟" میرے ساتھی قیدی نے مجھ سے استفسار کیا۔

"میرا وجود لاوارث زندہ لاش کی مانند ہے، اور لاوارثوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا...... جب گھر ہی نہیں تو کیسا گھر والا...... کیسی ملاقات؟" میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اوہ یار تم تو بہت خوبصورت بولتے ہو...... ورنہ میں نے تو تمہیں صرف خلاؤں میں گھورتے دیکھا ہے اور کسی بات کے جواب میں ہاں...... ہوں...... نہ...... نہیں...... جی...... ہی کرتے ہی سنا ہے...... کہاں سے سیکھا ہے اتنا اچھا بولنا۔" اس نے بلاوجہ ہی ہنستے ہوئے کہا تو میرا خون کھول اٹھا۔

جسے وہ خوبصورت بات کہہ رہا تھا وہ میری زندگی کی تلخ حقیقت تھی۔ میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"وقت اور حالات سب سکھا دیتے ہیں۔" میری یہ بات بھی شائد اس کے سر سے گزر گئی تھی۔

"اچھا تم نے کبھی بتایا نہیں کہ تمہیں کس جرم میں حوالات کی ہوا کھانی پڑ رہی ہے۔" وہ باتوں کا کچھ زیادہ ہی شوقین تھا اور شاید میرے زخموں کو چھیڑنے کا بھی۔

"یاد نہیں...... کس جرم کی سزا کاٹ رہا ہوں...... اور ضروری تو نہیں کہ سزا ہمیشہ جرم کرنے پر ہی ملے۔"

☆☆☆

میرا نام کاشان ہے پیار سے سب کاشی کہتے ہیں، چھوٹا سا تھا کہ ابا وفات پا گئے اور اماں نے ان کے جانے کے بعد مجھے اور میری چھوٹی بہن سارہ کو سلائی کڑھائی کر کے بہت محنت سے پالا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اماں کی بوڑھی آنکھوں کی روشنی کم ہونے لگی اور وہ بیمار بھی رہنے لگی تھیں۔ اسی وجہ سے میں نے میٹرک کے بعد ہی تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا اور گلی کی نکڑ پہ پرچون کی دکان کھول لی۔

اب ہمارے گھر کے حالات بہتر ہو گئے تھے۔ چھوٹی بہن سارہ سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی اور اس کی منگنی اس کی پسند سے خالہ کے بیٹے سے ہو چکی تھی۔

ایک شام جب میں دکان سے گھر لوٹا تو اماں بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ وجہ پوچھنے پر کہنے لگیں۔

"کاشی بیٹا آج سارہ کے سسرال والے آئے تھے، شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے۔"

"یوں اچانک...... مگر اماں سارہ تو ابھی پڑھ رہی ہے اتنی جلدی کیا ہے۔" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"بس بہت ہو گئی پڑھائی...... بیٹیاں جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائیں اتنا ہی اچھا ہوتا ہے...... ویسے بھی سارہ کے سسرال والوں نے اسے شادی کے بعد بھی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دی ہے اور میں نے سارہ سے بات کر لی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اماں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"چلیں اچھی بات ہے...... جیسے آپ بہتر سمجھیں...... اگلے مہینے کے آخر کی کوئی تاریخ رکھ لیں...... آج کل تو سارہ کے امتحان ہو رہے ہیں۔" میں نے سامنے دیوار پہ لگے کیلنڈر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تیاری تو پہلے سے مکمل ہے ہماری اب بس تاریخ ہی رکھنی ہے مگر بیٹا میں چاہتی ہوں کہ......" اماں کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"جی اماں کہیے...... کیا کہنا چاہتی ہیں آپ......؟"

"کاشی بیٹا دیکھو سارہ بیاہ کر چلی جائے گی تو گھر کتنا سونا سونا ہو جائے گا...... تو تو سارا دن دکان پر ہوتا ہے میں اکیلی بیٹھی دیواروں سے باتیں کرتے کرتے پاگل ہو جاؤں گی۔" اماں کی آواز بھرا گئی تھی۔

میں نے ایک دم اماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"خدانخواستہ اماں کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟"

کاشی اگر تمہیں میری فکر ہے تو بیٹا تو شادی کر لے۔ اماں

نے جیسے میرے سر پر بم پھوڑا۔

"اماں یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"دیکھ کاشی میری ایک بیٹی رخصت ہو کر جائے گی تو دوسری بیٹی میرے گھر کی رونق بن کر آ جائے گی۔ ویسے بھی میں بیمار رہتی ہوں۔ مرنے سے پہلے تمہارے سر پہ سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔" اماں نے مجھے جذباتی مار مار دی۔

"اماں مریں آپ کے دشمن...... اس خوشی کے موقع پر اس طرح کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ رہی بات میری شادی کی تو میں نے ابھی اس بارے میں سوچا نہیں ہے ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ بہت سا پیسہ کمانا ہے۔ اپنا گھر لینا ہے اماں میں نہیں چاہتا کہ جن محرومیوں کا سامنا میں نے کیا میرے بچے بھی کریں۔ انہیں زندگی کی ہر وہ خوشی دینا چاہتا ہوں جس کے لیے میں ترستا رہا۔ اپنی تعلیم تک مکمل نہ کر سکا...... اور اماں آپ نے میری اور سارہ کی پرورش میں جو تکلیفیں اٹھائی ہیں چاہ کر بھی میں ان کا بدلہ نہیں اتار سکتا۔ مگر پھر بھی آپ کی ہر خواہش پوری کرنے اور ہر غم دور کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے بھیگے لہجے میں کہا۔ تو اماں کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں اور وہ میری پیشانی چومتے ہوئے دعا دینے لگیں۔

"خدا تمہارا ہر جائز خواب جائز طریقے سے پورا کرے......" (آمین)

☆☆☆

ایک دن دکان پر فارغ بیٹھا تھا کہ میری نظر سامنے سیاہ گیٹ والے مکان پر پڑی جس پر کافی دنوں سے برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ مگر اب وہ بورڈ غائب تھا اور مکان کے باہر بھی کافی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گھر کسی نے خرید لیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہاں سامان سے لدا ٹرالا آ کر رکا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ گھر آ کر جب میں نے اماں اور سارہ سے ذکر کیا تو سارہ کہنے لگی۔

"جی کاشان بھائی میں جانتی ہوں وہ مکان کن لوگوں نے خریدا ہے۔" میں نے اور اماں نے سوالیہ نظروں سے سارہ کی جانب دیکھا کہ وہ کیسے جانتی ہے۔

"وہ بھائی میری کلاس فیلو ہے ارم اس کی فیملی گاؤں سے یہاں شہر میں شفٹ ہوئی ہے۔ ارم بتا رہی تھی کہ گاؤں سے روز کالج آنا تھوڑا مشکل تھا وہ تو پھر بھی کسی نہ کسی طرح آ ہی جاتی تھی مگر اب اس کے بھائی کے بچوں کو بھی کسی اچھے سکول میں داخل کروانا ہے۔ گاؤں میں تو ان کے معیار کا کوئی سکول ہے ہی نہیں۔ تو اس لیے ان کو شہر آنا پڑا ویسے بھائی یہ لوگ کافی امیر ہیں لیکن ہیں بہت کنجوس۔ تبھی تو ہمارے محلے میں گھر لے لیا...... کاشی بھائی ارم بتا رہی تھی کہ گاؤں میں اس کے بھائی ملک رضوان کا کافی رعب و دبدبہ ہے۔ لیکن بھائی ارم بہت اچھی ہے۔ مغرور تو بالکل نہیں اس لیے تو میری اس سے دوستی ہو گئی......

سارہ نے الف سے یے تک پوری کہانی سنا ڈالی اس سے پہلے کہ وہ میری معلومات میں مزید اضافہ کرتی میں نے اسے کھانا لگانے کا کہہ دیا۔

☆☆☆

سارہ کی شادی کی تاریخ رکھی جا چکی تھی۔ گھر میں تیاریاں عروج پر تھیں۔ اسی وجہ سے آج کل میں دکان جلدی بند کر دیتا تھا۔ ابھی بھی میں دکان بند کر کے تالا لگا ہی رہا تھا کہ میری سماعتوں سے آواز ٹکرائی۔

"جی سنیں بھائی...... ایک منٹ...... مجھے کچھ چیزیں چاہئیں۔" میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک گھبرائی لجائی سی سترہ اٹھارہ سالہ معصوم سی لڑکی کھڑی تھی۔

"جی اب تو میں دکان بند کر چکا ہوں۔" مجھے گھر جانے کی جلدی تھی۔ سو اسے ٹالنا چاہا۔

"دیکھیں پلیز دو منٹ کے لیے دکان کھول دیں۔ مجھے یہاں کسی دوسری دکان کا نہیں پتا...... اگر میں ابھی

سودا لے کر نہ گئی تو بڑی باجی بہت ناراض ہوں گی۔"
لڑکی کافی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔
آنسو اس کی آنکھوں سے چھلکنے کو بے تاب تھے۔
اس کی مجبوری دیکھتے ہوئے میں نے دکان کھول دی۔
اس نے مجھے شکریہ کہتے ہوئے سامان کی لسٹ تھما دی۔

"آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

"جی میں سامنے ملک رضوان کے گھر سے آئی ہوں۔" لڑکی نے سیاہ گیٹ والے گھر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... اچھا...... اچھا آپ لوگ گاؤں سے آئے ہو نہ......" عام طور پر میں لڑکیوں سے کم ہی بات کرتا تھا مگر جانے اس اداس آنکھوں والی لڑکی میں ایسی کیا بات تھی جو مجھے اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی۔

"جی بالکل" اسے شاید جانے کی جلدی تھی۔ وہ بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے سودا اور بل اس کی جانب بڑھا دیا، وہ بل ادا کر کے تقریباً بھاگتی ہوئی سامنے گھر میں گھس گئی اور میں سیاہ گیٹ تکتا رہ گیا۔

گھر آ کر بھی میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا کتنی معصوم اور سادہ لڑکی تھی، کیا وہ ارم تھی؟ اگر ہاں تو پھر وہ اتنی ڈری سہمی سی اداس کیوں تھی......؟

☆☆☆

دو چار روز ہی گزرے تھے کہ وہ لڑکی پھر میری دکان پر موجود تھی اب کی بار وہ نارمل دکھائی دے رہی تھی یعنی کہ گھبرائی یا پریشان نہیں تھی ہاں البتہ آنکھوں کی اداسی ابھی برقرار تھی۔ اس کے ساتھ دو تین بچے بھی تھے جو یقیناً ملک رضوان کے ہی ہو سکتے تھے۔

"جی بھائی بچوں کو بسکٹ، لیز اور جوس کے ڈبے دے دیں۔" لڑکی نے پانچ سو کا نوٹ مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"اور آپ کو کیا دوں......؟" میں نے مسکرا کر لڑکی سے کہا تو وہ ہڑبڑا کر بولی۔

"جی...... جی مجھے کچھ نہیں...... چاہیے اپنے لیے۔"

"آپ کا نام ارم ہے کیا......؟" میں نے ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا، تو وہ چونک کر بولی۔

"جی نہیں میرا نام عروبہ ہے...... مگر آپ کیسے جانتے ہیں چھوٹی باجی ارم کو......؟"

"میری بہن نے مجھے بتایا کہ آپ کی "چھوٹی باجی" اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی ہیں۔"

"آپ کی بہن بھی کالج جاتی ہیں......" لڑکی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"کتنے اچھے بھائی ہیں آپ...... اور ایک وہ تھا میرا بھائی جس نے......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور فوراً ہی بچوں کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

"چلو بچو گھر چلتے ہیں۔" میں نے اسے بقیہ روپے لوٹاتے ہوئے پوچھا، اگر آپ ملک رضوان کی بہن نہیں تو پھر کون ہیں؟

"جی میں ملک صاحب کی ملازمہ ہوں۔" وہ مجھے حیرت میں ڈال کر چل دی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی جو شکل اور حلیے سے کہیں سے بھی نوکرانی نہیں لگتی تھی۔ لیکن آنے والے دنوں میں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس گھر کی ملازمہ ہی ہے کیونکہ بارہا میں نے اسے چھت پر کپڑے ڈالتے اور گیٹ کے باہر صفائی کرتے دیکھا تھا اور سودا سلف سبزی وغیرہ لانا بھی اس کے ہی ذمے تھا، میری دکان پر دن میں اس کے کئی چکر لگ جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔

وہ مجھے بھائی کہتی تھی اور مجھے بھی وہ چھوٹی سی لڑکی سارہ کی طرح عزیز ہو گئی تھی۔ عروبہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ تین چھوٹی بہنیں اور ایک بڑا بھائی ہے دو سال قبل بھائی نے اپنی شادی کے لیے مجھے ملک رضوان کے پاس گروی رکھ کر

پچاس ہزار روپے کا قرض لیا تھا جو کہ ایک سال میں واپس لوٹانا تھا مگر بھائی وہ پیسے واپس نہ کر سکا اور یوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس گھر کی ملازمہ بن گئی۔

اب مجھے کسی بھی گھر والے سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ میری تعلیم بھی ادھوری رہ گئی۔ جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ یہاں سارا سارا دن کام کرتی ہوں اور پھر بھی جھڑکیاں گالیاں میرا مقدر ہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ سسک پڑی تھی۔ اتنی نازک سی لڑکی اپنے اندر اتنا درد چھپائے ہوئے تھی۔ مجھے اندازہ نہ تھا مجھے اس کی کہانی سن کر بہت دکھ ہوا تھا...... میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر کیسے......؟ یہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

سارہ کی شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا گھر میں ڈھولک بجنے لگی تھی محلے کی لڑکیاں آ کر خوب رونق لگاتی تھیں سارہ کی کلاس فیلو ہونے کی حیثیت سے ارم بھی آ جاتی تھی اور ارم کے ساتھ عروبہ بھی...... ایک طرف میری بہن سارہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مجھے پرسکون کر دیتی تھی تو دوسری طرف میری بہن جیسی عروبہ کی آنکھوں کی اداسی مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی۔

آج کل عروبہ معمول سے کچھ زیادہ ہی کھوئی کھوئی اور پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ مجھ سے بھی کم ہی بات کرتی تھی۔

ایک دن دکان پر آئی تو مجھ سے کہنے لگی۔

"آپ کے پاس چوہے مار دوائی ہو گی......؟"

"کیوں کیا ہوا گھر میں چوہا گھس آیا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور دوائی اس کو پکڑا دی۔

"ہاں گھس آیا ہے چوہا مگر مجھے یہ دوائی چوہے کے لیے نہیں چاہیے۔" وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔" میں چونک اٹھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ مختصر بولی۔

"پیسے ابھی دو گی یا......" میری بات کاٹتے ہوئے وہ بولی۔

"کاشی بھائی میرے پاس پیسے نہیں ہیں...... مجھے معاف کر دیں۔ میں اب اور نہیں جی سکتی میں مرنا چاہتی ہوں۔" عروبہ نے شیشی کا ڈھکن کھولتے ہوئے کہا تو میں نے فوراً سے پہلے اس کے ہاتھ سے دوائی چھین لی اور غصے سے بولا۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا...... یہ کیا گھٹیا حرکت کرنے جا رہی تھی تم......"

تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور میں اسے دکان کے اندر لے گیا۔ پانی پلایا تو وہ کچھ سنبھلی پھر میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے۔" وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

"وہ...... وہ گھر میں...... بڑی باجی کا بھائی آیا ہوا ہے...... (عروبہ ملک رضوان کی بیوی کو بڑی باجی کہا کرتی تھی) وہ بہت خبیث انسان ہے...... پہلے تو وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا تھا...... مگر اب اس نے مجھے باقاعدہ تنگ کرنا شروع کر دیا ہے...... مجھے بہت پریشان کرتا ہے۔" وہ پھر سے رونے لگی تو میں نے کہا۔

"تم نے گھر میں سے کسی سے بات کیوں نہیں کی۔" تو وہ کہنے لگی۔

"کوئی فائدہ نہیں ہے...... کوئی بھی میری بات کا یقین نہیں کرے گا...... بڑی باجی کا بھائی کہتا ہے اب اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑے گا......"

عروبہ آنچل میں منہ چھپا کر پھر سے سسک پڑی مجھے اس پر بہت ترس آ رہا تھا۔

"تو تم اپنے گاؤں اپنے بھائی کے پاس واپس چلی جاؤ۔" میں نے کہا۔

"نہیں یہ ناممکن ہے وہ تو پہلے ہی میرا سودا کر چکا ہے اور اگر چلی بھی گئی تو یہ ملک لوگ مجھے پھر وہاں سے

لے آئیں گے۔"

"ہاں...... کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔" مجھے اپنے احمقانہ مشورے پر شرمندگی محسوس ہوئی۔

"کوئی تو رشتے دار ایسا ہوگا تمہارا جو تمہارا ہمدرد ہو جو تمہیں پناہ دے سکے۔"

میری بات سن کر وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ گئی۔

"ہاں...... میری ایک خالہ ہیں جس کے گھر کا مالکوں کو نہیں پتا...... وہ مجھے سہارا دے سکتی ہیں مگر......"

وہ خاموش ہوگئی۔

"مگر کیا بولو......"

"میں وہاں اکیلی نہیں جا سکتی...... اور خالہ بھی نہیں آسکتی...... اگر میں خود سے جاؤں بھی تو میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔" وہ بے بسی سے بولی تو میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کہاں رہتی ہیں تمہاری خالہ......"

"جی وہ پاکپتن رہتی ہیں۔"

"اچھا...... تو اب تم فکر نہ کرو...... تمہیں تمہاری خالہ کے پاس پہنچانا اب میری ذمے داری ہے۔" عروبہ نے حیرت بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور کہا۔

"کاشی بھائی آپ کیوں میری خاطر مشکل میں پڑنا چاہتے ہیں۔"

"بھائی بھی کہتی ہو اور غیروں جیسی باتیں بھی کرتی ہو...... ہر بھائی کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی بہن کی حفاظت کرے...... اچھا اب بند کرو یہ رونا دھونا...... یہ بتاؤ کہ کوئی نمبر وغیرہ ہے خالہ کا تمہارے پاس......"

"جی ہے نمبر مگر موبائل......"

"اچھا ٹھیک ہے...... یہ موبائل رکھو تم اپنے پاس اور اپنی خالہ کو موقع ملتے ہی ساری تفصیل سے آگاہ کر دینا۔"

میرے پاس دو موبائل تھے ایک میں نے اسے دے دیا۔

"اور سنو پرسوں سارہ کی مہندی ہے اسی رات مجھے تمہیں تمہاری منزل تک پہنچانا ہے تم تیار رہنا۔" عروبہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

سارہ کی مہندی کی رات آن پہنچی تھی مہندی کا فنکشن گھر میں ہی کیا تھا۔ سارہ کی ساری سہیلیاں خوب ہلہ گلہ کر رہی تھیں اور ان میں ارم بھی موجود تھی، ارم کے ساتھ اس کی بھتیجی اور عروبہ بھی آئی تھی۔ مہندی کی رسم ادا کی جا چکی تھی۔

اب لوگوں نے کھانا، کھانا تھا اور کھانے کے بعد رات دیر تک لڑکیوں نے ڈانس اور ڈھولک پر گیت وغیرہ گانے تھے۔ یہ مناسب وقت تھا۔ سو میں اماں سے کسی دوست کو اسٹیشن سے لانے کا بہانہ کر کے یہ کہتے ہوئے کہ "اگر دیر ہو جائے تو فکر نہ کریں...... میں دوستوں کے ساتھ ہی ہوں گا۔"

نو بجے گھر سے نکل آیا میں نے رینٹ پہ کار لے رکھی تھی جسے میں نے خود ہی ڈرائیو کرنا تھا۔ جس جگہ میں نے عروبہ کو پہنچنے کا کہا تھا میں وہیں کار میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دس منٹ میں پہنچ گئی عروبہ بڑی سی چادر اوڑھے ہوئے تھی اور ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ بھی تھا۔

میں نے کار کا دروازہ اس کے لیے کھولتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں...... اور کیا بہانہ کر کے آئی ہو......"

"فکر نہ کریں کاشان بھائی مجھے آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا...... ارم باجی ابھی آپ کے گھر ہی ہیں۔ اور میں ان سے یہ کہہ کر آئی ہوں کہ مجھے گھر میں کام ہے آپ پنکی (بھتیجی) کے ساتھ آجایئے گا...... اور پھر گھر آکر میں نے یہ بیگ اٹھایا اور اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے کھڑکی کے راستے سے باہر نکل آئی...... اب صبح تک کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ میں گھر پر موجود نہیں ہوں۔" عروبہ نے تفصیل بتائی تو میں نے ہنس کر کہا۔

"ارے واہ تم تو بہت چالاک نکلی...... لگتا ہے کافی تجربہ ہے اس کام میں......" تو وہ خفگی سے گھورتے ہوئے مسکرا دی۔

☆☆☆

ہم دو گھنٹے میں پاکپتن پہنچ گئے میں نے عروبہ سے اس کی خالہ کے گھر کا ایڈریس پوچھا تو وہ کہنے لگی۔

"میرے پاس پتہ نہیں ہے......" میں چونک گیا اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ کہنے لگی۔

"آپ گاڑی بابا فرید کے دربار پر لے چلیں میں نے خالہ کو فون کیا تھا وہ مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ وہیں لینے آئیں گی...... خالہ نے نیا گھر لیا ہے اور اس کا پتا مجھے سمجھ نہیں آیا تھا اس لیے میں نے کہہ دیا کہ وہ خود ہی آجائیں۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے کہا اور گاڑی دربار کی جانب بڑھا دی۔ دربار پر پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی ہماری گاڑی کے قریب ایک موٹر سائیکل آکر رکی جس پہ ایک سانولا سا لڑکا سوار تھا جس کو دیکھ کر عروبہ نے کہا۔

"یہ میرا خالہ زاد ہے......" اور ہم گاڑی سے نکل آئے رسمی سلام دعا کے بعد عروبہ نے اس سے میرا تعارف کروایا اور پھر وہ لڑکے سے پوچھنے لگی کہ خالہ کیوں نہیں آئیں تمہارے ساتھ مجھے لینے۔ تو وہ کہنے لگا۔

"امی کی طبیعت اچانک ہی کچھ خراب ہوگئی تھی اس لیے وہ دوا کھا کر سو گئیں تھیں...... رات بھی تو بہت ہوگئی ہے ناں......" تو مجھے بھی وقت کا احساس ہوا کہ گھر میں اماں پریشان ہو رہی ہوں گی اب چلنا چاہیے۔

"اچھا عروبہ اب میں چلتا ہوں۔"

"نہیں بھائی آپ ہمارے گھر چلیے چائے وغیرہ ہو جائے۔" لڑکے نے خوش دلی سے کہا۔

"نہیں بہت شکریہ گھر میں میری بہن کی شادی ہے اس لیے مجھے جلدی پہنچنا ہے...... زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی...... مجھے خوشی ہے کہ عروبہ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔"

"کاشان بھائی میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھلا سکتی۔ مجھے اس جہنم سے نکالنے اور نئی زندگی دینے کا بہت شکریہ۔" عروبہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"شکریہ میرا نہیں اس پاک ذات کا ادا کرو جس کی مرضی سے یہ سب ممکن ہوا ہے۔" اور پھر میں انہیں الوداع کہتے ہوئے واپس اپنے شہر آگیا۔ گھر پہنچا تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

☆☆☆

بارات آچکی تھی اور سارہ دلہن بن کر بالکل پریوں سی حسین لگ رہی تھی۔ نکاح ہونے ہی والا تھا کہ کچھ مسلح افراد زبردستی اندر گھس آئے اور مار پیٹ کرنے لگے۔ جس سے باراتیوں سمیت سب لوگ خوفزدہ ہوگئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک یہ مصیبت کیسے آن پڑی۔ پھر مجھے کسی کی گرج دار آواز سنائی دی۔

"کہاں ہے کاشی دکان والا سالا۔" میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ملک رضوان اپنے ساتھیوں کے ساتھ غصے میں کھڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔

ملک رضوان میری طرف بڑھا اور مجھے گریبان سے پکڑ کر پوچھنے لگا۔

"بتا کہاں ہے ہماری لڑکی" پتا نہیں ملک کو کیسے خبر ہوگئی تھی کہ عروبہ کی گمشدگی کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔

"کون...... لڑکی میں کچھ نہیں جانتا چھوڑو مجھے۔" میں صاف مکر گیا۔

"بکواس بند کر...... اس کے کمرے سے تمہارا موبائل ملا ہے اس میں جو سم ہے وہ تمہارے نام پہ ہے...... اب سیدھی طرح بتا کہاں بھگا کر لے گیا ہے تو عروبہ کو...... بتا کمبخت۔" ملک نے مجھے ایک زور تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا تو مجھے بھی غصہ آگیا۔

"نہیں میں کچھ نہیں بتاؤں گا...... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" یہ سننا تھا کہ ملک کے آدمیوں نے مجھ پر لاتوں
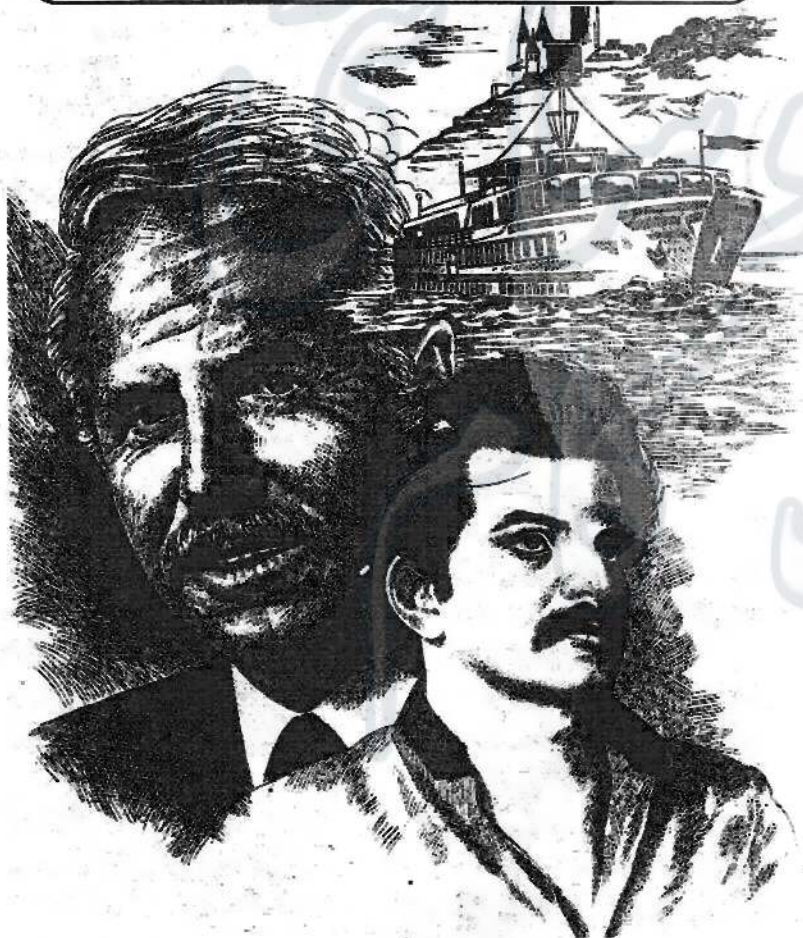
اور گھونسوں کی بارش کردی۔

میری چیخ و پکار سن کر اماں دوڑی چلی آئیں۔

"خدا کے لیے میرے بیٹے کو چھوڑ دو...... اس نے کچھ نہیں کیا...... آج میری بیٹی کی شادی ہے خدا کے لیے یہ ہنگامہ نہ کرو......" اماں کی فریاد سن کر ملک رضوان اور اس کے آدمیوں نے قہقہہ لگایا۔

"او...... مائی تیری بیٹی کی شادی ہے نہیں شادی تھی۔

"نہیں تم یہ ظلم نہیں کر سکتے۔"

"اوئے تم لوگوں میں سے دلہا کون ہے اگر اس کو اپنی جان پیاری ہے تو وہ فوراً یہاں سے بھاگ جائے۔" اور پھر سچ مچ دلہا بارات سمیت میری بہن کی ڈولی اٹھائے بنا ہی چلا گیا میں اور اماں انہیں روکتے ہی رہ گئے۔

سمارہ تک خبر پہنچی تو وہ سکتے میں آ گئی۔

"دیکھ کاشی ہمیں ہماری لڑکی کا بتا دے ورنہ ہم تمہاری بہن کو اٹھا کر لے جائیں گے۔" ملک رضوان نے دھمکی دی۔

"نہیں تم لوگ ایسا نہیں کر سکتے میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا چاہے میری جان لے لو۔"

اماں نے روتے ہوئے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"کاشان بیٹا اگر تو جانتا ہے تو بتا دے...... یہ لوگ تیری بہن کو برباد کر دیں گے...... کاشی تمہیں میری قسم بتا ان کی لڑکی کہاں ہے۔" اماں نے اپنی قسم دے کر مجھے مجبور کر دیا تھا۔

"وہ...... وہ عروبہ اپنی خالہ کے گھر ہے۔"

"خالہ...... ابے کونسی سی خالہ...... ملک جی ہماری کوئی خالہ والہ نہیں ہے اس دنیا میں...... یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے۔"

ایک سانولا سا دیہاتی آدمی بولا جو یقیناً عروبہ کا بھائی ہوگا۔

"اوئے کہاں چھوڑا ہے لڑکی کو پتا بتا اس کی خالہ کا" ملک رضوان نے کہا۔

"مجھے پتا نہیں معلوم...... میں نے عروبہ کو پاکپتن دربار پہ چھوڑا تھا...... جہاں سے اس کو اس کا خالہ زاد آ کر لے گیا۔"

"او...... لڑکے جھوٹی کہانیاں سنانا بند کر...... حوالات کی ہوا کھائے گا تو سب سچ اگل دے گا...... اوئے شیدے پولیس کو فون کر...... اور اندر جا کے اس کی بہن کو لا...... جب تک ہمیں ہماری لڑکی نہیں ملتی اس کی بہن ہمارے پاس رہے گی۔"

ظالموں میری بہن کا کوئی قصور نہیں ہے...... اس کو کچھ مت کہو۔" میں نے بے بسی سے کہا میرے دونوں بازو ملک کے آدمیوں نے پکڑے ہوئے تھے۔

اس سے پہلے کہ ملک رضوان کے آدمی سمارہ تک پہنچتے...... دھڑام کی آواز پہ سب چونک پڑے...... صحن کے فرش پہ سرخ عروسی جوڑے میں خون سے لت پت سمارہ کی لاش پڑی تھی...... سمارہ نے چھت سے کود کر اپنی جان دے دی تھی۔ اور اس اچانک صدمے سے اماں اپنے حواس کھو بیٹھی تھیں اور مالک مکان نے ملک رضوان کے دباؤ میں آ کر اماں کو بے گھر کر دیا تھا...... اب اماں کہاں ہیں مجھے کچھ خبر نہیں...... میں بدقسمت بھائی نہ تو اپنی بہن کی ڈولی رخصت کر سکا تھا اور نہ ہی بہن کے جنازے کو کندھا دے سکا تھا۔

اپنی منہ بولی بہن کی خاطر اپنی بچپن کی ساتھی جان سے پیاری بہن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو چکا تھا...... عروبہ نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا کہ وہ لڑکا اس کا خالہ زاد ہے...... اور اس نے یہ جھوٹ بول کر بہت اچھا کیا تھا...... اگر وہ سچ کہہ دیتی تو شاید وہ بھی آج خوش نہ ہوتی...... میری دعائیں میری بہن عروبہ کے ساتھ ہیں۔ وہ جہاں رہے ہمیشہ خوش رہے......!

☆☆☆

افسانہ

انتخاب

انجم فاروق ساحلی

والدین اپنی اولاد کے لیے ہمیشہ بہتر
ہم سفر کے انتخاب کی کوشش کرتے ہیں
مگر کبھی کبھی ان کا عمر بھر کا تجربہ اور مردم
شناسی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

ایک باپ کا قصہ جس کے نزدیک عزت کا معیار صرف پیسہ تھا

"میرے بچپن کے دوست شوکت علی جو گزشتہ ماہ ہارٹ اٹیک سے انتقال کر گئے۔ ان کا بیٹا ندیم جو حال ہی میں لندن سے آیا۔ خوبصورت، سمارٹ اور وجیہہ نوجوان ہے۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور حاضر دماغی صاف دکھائی دیتی ہے۔ اب باپ کی رائس کمپنی کا سارا کاروبار بھی وہی سنبھالے گا جو گزشتہ دو برسوں سے شوکت علی کے عارضہ قلب کی وجہ سے نقصان میں جا رہی تھی۔ وہ گریجویٹ ہے اور لندن میں ایک بڑی ڈیکوریشن پیس میکر کمپنی میں سیلز منیجر تھا۔ آتے ہی بے چارے کو باپ کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

میں نے دست شفقت اس کے سر پر رکھ دیا ہے۔ وہ کاروباری اور عملی آدمی ہے۔ اس کا مستقبل روشن ہے آخر میرے کاروبار کو بھی ایک ذہین نوجوان کی ضرورت ہے۔ شوکت مرزا نے آخری جملے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی میں اپنا انتخاب کر چکی ہوں اور مجھے کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔" عالیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔" شوکت مرزا نے تلخ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں ابا حضور بالکل آخری اور حتمی۔" عالیہ نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور ایک جھٹکے سے ناشتے کی میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ جذبات کے اتار چڑھاؤ سے اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ نتھنے پھولنے اور پچکنے لگے۔ شوکت مرزا نے بھی اسے نہیں روکا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کالج جانے کے لیے گیراج کی طرف نکل گئی۔ گاڑی کے ٹائروں کے چیخنے کی آواز نے عالیہ کے اضطراب کو گھر کی فضا میں منتشر کر دیا۔

"اف آج کل کے لڑکے اور لڑکیاں۔" سیٹھ شوکت نے جھنجھلا کر سر کو پکڑ لیا۔

بیگم شوکت ان کی کیفیت کو دیکھ کر قریب آ کر رک گئیں۔

"کیا بات ہے۔ عالیہ کے ابا۔" وہ متفکر نگاہوں سے ناشتے کی میز اور سیٹھ شوکت مرزا کو دیکھنے لگیں۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا تھا اور عالیہ کی نشست خالی تھی۔ بیگم شوکت خالی خالی نظروں سے نشست کو گھورنے لگیں۔ جیسے انہیں اپنی گود خالی محسوس ہونے لگی ہو۔

باپ اور بیٹی کے درمیان ہونے والی متعدد بحث و تکرار انہیں معلوم تھی۔

"عالیہ کے ابا کیا مسئلہ ہے۔" بیگم شوکت نے ہمدردانہ لہجے میں پاس بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

سیٹھ شوکت نے سر اوپر اٹھایا۔ ان کے چہرے پر پڑنے والی جھریوں نے انہیں کتنا عمر رسیدہ بنا دیا تھا۔ وہ بھی خالی خالی نگاہوں سے بیگم کو دیکھنے لگے۔

"آج کل کی لڑکیوں سے خدا بچائے، ایک نوجوان بیٹی کا باپ ہونا بڑی مصیبت ہے۔ ہر بات میں ضد کرنا، ہر کام میں من مانی، ہر لمحے خود پسندی اور دھونس جمانے کی عادت اور اگر انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرو تو پسماندہ، دقیانوس اور رجعت پسند جیسے الفاظ سننے کو ملتے ہیں۔

عالیہ کو تعلیم اور آزادی نے بے حد خود سر بنا دیا ہے۔ وہ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ ماں باپ کی پسند کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ سیٹھ شوکت نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

"میں اسے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کروں گی۔" بیگم شوکت نے اپنے خاوند کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بیکار ہے بیگم۔" سیٹھ شوکت نے جھلاہٹ کے انگارے چباتے ہوئے کہا۔

"اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ عشق کا بھوت اس پر بری طرح سوار ہے۔ اگر سختی یا باز پرس کی گئی تو کہیں

اس کا کوئی سنگین نتیجہ نہ بھگتنا پڑے میں اس ڈر سے خاموش ہوں۔ اندر ہی اندر سلگ رہا ہوں۔ وہ دو ٹکے کا مصور جو ہر وقت بے ڈھنگا دکھائی دیتا ہے۔ میری سب سے قیمتی متاع لوٹ چکا ہے اور اب میری دوسری دولت بھی اس کی زد میں ہے۔

ہم نے دن رات ایک کر کے اپنا سکھ چین لٹا کر اپنی ہر خواہش کو کچل کر اپنی بیٹی کو بیٹے اور بیٹی دونوں کا رتبہ دیا۔ زندگی کی ہر نعمت اس کے قدموں میں نچھاور کر دی۔ اس کے ہر سکھ اور آرام کا خیال رکھا۔ اعلیٰ تعلیم دلوائی لیکن آج اس اعلیٰ تعلیم نے ہمیں اس کی زندگی کے فیصلے سے بے دخل کر دیا ہے۔ کاش میں ایک بیٹی کا باپ نہ ہوتا یا اعلیٰ سوسائٹی میں اس کی پرورش نہ کرتا۔

سیٹھ شوکت نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور پھر ناشتہ چھوڑ کر تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ بیگم شوکت دیوار پر آویزاں عالیہ کی تصویر کو گھورنے لگی۔

☆☆☆

فن کدے میں داخل ہوتے ہی عالیہ مسرت سے کھل اٹھی۔ جیسے کسی سرسبز شاخ پر اچانک کوئی گلاب کھل اٹھے۔ سہیلیوں کے ساتھ گھوم پھر کر وہ ادھر ہی چلی آئی تھی۔ اس نے گھر فون کر دیا تھا کہ دیر سے لوٹے گی۔ سامنے ایزل پر اس کا خاکہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک خوبصورت باغ میں کھڑی تھی۔ شہزاد خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ پس منظر میں آبشار، گھنے درخت اور پھر جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

شہزاد نے اپنی نشست پر بیٹھ کر برش سنبھال لیا اور رنگوں سے کھیلنے لگا۔ عالیہ کچھ دور پڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ شہزاد اس وقت تصویر کے رخساروں پر گلابی رنگ مکس کر رہا تھا۔ عالیہ شرم سے دہری ہو گئی اور اسے اپنے رخساروں میں گدگدی سی محسوس ہونے لگی۔

شہزاد کی نگاہ بار بار کام کے دوران عالیہ کی طرف اٹھنے لگی تو اس نے مسکرا کر برش رکھ دیا۔ لیکن چند رسمی باتوں کے بعد اچانک گہری سنجیدگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور وہ افسردہ دکھائی دینے لگا۔

"یہ یکایک تمہارا رنگ کیوں اڑ گیا۔" عالیہ نے شہزاد کے بکھرے ہوئے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں رات میں نے خواب میں دیکھا میرے گھر کو آگ کے مہیب شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ میرے کمرے میں چاروں طرف آگ ہی آگ ہے۔ تپش اور آنچ بڑھتی جا رہی ہے، میرا برا حال ہو گیا۔ بچنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔" شہزاد نے مضطرب لہجے میں کہا۔

جیسے آگ کا کوئی مہیب شعلہ اچانک سامنے بھڑک اٹھا ہو۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی اور چہرے پر ملال سا چھا گیا۔

"خوابوں کی باتوں کا اتنا گہرا اثر نہیں لیتے۔" عالیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خوابوں میں حقیقت بالکل نہیں ہوتی۔ لیکن یہ تو کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ایک آگ تمہارے اردگرد ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اور اس کے شعلے کسی وقت بھی مجھے اپنی لپیٹ میں لے سکتے ہیں۔"

کیسی آگ؟ حیرت سے عالیہ کا منہ کھل گیا۔

اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ شوخی ہوا ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے جناب کی ذہنی رو آج کل بہک گئی ہے جو الٹی سیدھی باتیں اور ڈراؤنے خواب دیکھ رہے ہو۔" عالیہ نے ترش روی سے کہا۔ چند لمحے خاموش طاری رہی۔ خاموش نگاہیں متصادم ہوئیں۔ پھر شہزاد نے سکوت کو چابک سے چھیڑا۔

"دولت کی آگ عالیہ ہمارے درمیان حائل ہے۔ میں اس دیوار کو پھلانگنے سے قاصر ہوں۔ میں اپنی بساط سے بڑھ کے سوچنا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے منہ کے

بل گرنا پسند نہیں۔ ہم ندی کے دو کناروں کی مانند ہیں۔ جو ہمیشہ ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہیں۔ لیکن آپس میں نہیں ملتے۔"

"لیکن دریا تو مشترک ہی ہوتا ہے۔" عالیہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"عالیہ ملاقات میں تمہارے ڈیڈی نے بظاہر اچھا ہونے کا مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن باتوں ہی باتوں میں انہوں نے مجھے میری حیثیت کے ترازو میں کھڑا کر کے اپنی جاہ و حشمت کی طرف واضح اشارہ کر دیا تھا۔"

وہ تمہیں شہزادی کے مانند کسی شہزادے کے گھر رخصت کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی زندگی دولت سے جگ مگ جگ مگ کر رہی ہو میں تمہاری زندگی میں سیاہ رات کی مانند ہوں۔ تم اس سیاہ اور بدنما مکان میں کیسے زندگی بسر کرو گی۔ بڑی بڑی گاڑیاں، روز کی شاپنگ یہ سب میں تمہیں کہاں سے مہیا کروں گا۔ تمہارے ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں شوق اور جذبے سے زندگی کے اخراجات پورے نہیں کیے جا سکتے۔ کچن کا چولہا جذبات سے گرم نہیں کیا جا سکتا۔"

شہزاد سانس لینے کے لیے رکا تو عالیہ فوراً بول اٹھی۔

"ہمیں نئے زمانے میں ان پرانی زنجیروں کو ہی تو توڑنا ہے۔ ہمیں ان خود ساختہ پابندیوں اور رکاوٹوں پر کاری ضرب لگانی ہے کہ حسب و نسب اور مال و زر کا غرور ٹوٹ کر خاک میں مل جائے اور ایک حسین اور محبت بھری صبح طلوع ہو، ہر طرف محبت کا اجالا پھیل جائے۔ ذرہ ذرہ محبت کی کرنوں سے جگمگا اٹھے۔

میں اپنا آخری فیصلہ سنا کر آئی ہوں۔ میرا انتخاب تم ہو۔ عالیہ نے اس کے سینے کے بالوں کو فرط جذبات سے تھام لیا۔

"چلو سینما چلیں بہت اچھی رومانوی فلم ٹائی ٹینک چل رہی ہے۔ میں نے دو ٹکٹ منگوا لیے ہیں۔" اس نے ٹکٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔

"تم لیٹ ہو جاؤ گی اور تمہارے پاپا اور ممی ناراض ہوں گے۔"

شہزاد نے تردد ہوتے ہوئے کہا۔

"ڈونٹ وری، تم بالکل نہ گھبراؤ۔" آج سر میں کچھ درد ہے پھر کسی دن چلیں گے۔ شہزاد نے عذر پیش کیا۔

"اب چھوڑو بھی یہ بہانے بازی۔" عالیہ نے غصیلے لہجے میں کہا اور اسے شرٹ کے کف سے گھسیٹ کر لے گئی۔

☆☆☆

دونوں نیچے اتر کے گاڑی کے قریب آئے عالیہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ شہزاد اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ لیکن یہ بلائے بے درماں کہاں ٹلنے والی تھی۔

چند منٹ میں ہی گاڑی سینما کی طرف بڑھنے لگی۔ شام کا وقت تھا اور موسم خوشگوار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دلوں کے تار چھیڑتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کچھ منچلے بھی موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں میں اپنے اپنے رومان کو کوئی نیا موڑ دینے کے لیے متحرک تھے۔

تقریباً چار بجے فلم شروع ہوئی یہ ایک خوبصورت رومینٹک اور گیارہ ایوارڈ یافتہ فلم تھی۔ جس نے دنیا بھر میں بزنس اور مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ بعد میں دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے خوشگوار موڈ میں پارکنگ پر موجود کار میں آ کے بیٹھ گئے۔

عالیہ نے کسی فلمی ہیروئن کی مانند چابی اگنیشن میں داخل کی گھر گھراہٹ کی آواز ابھری لیکن گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی۔ عالیہ کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں۔ عالیہ نے پارکنگ کے ٹھیکیدار کو بلوایا اور اپنی مشکل بیان کی اس نے اپنے تین نوکروں کو دھکا لگانے کا اشارہ کیا۔

گاڑی دھکے سے مین روڈ پر آ گئی لیکن چلنے کا نام نہ لیا۔ اب تنگ آ کر عالیہ نے موبائل سے ایک نزدیکی ورکشاپ کی طرف پیغام بھیجا اور خود باہر نکل کر بونٹ اٹھا کر اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس وقت قریب سے گزرتی شوکت مرزا کی کار کے بریک چرچرائے اور گاڑی نزدیک آ کے رک گئی۔

شہزاد پہلے تو حواس باختہ ہو گیا۔ پھر اخلاقی طور پر ہکلاتا ہوا آگے بڑھا۔ ج جناب شوکت مرزا صاحب! آیئے آیئے...... شوکت مرزا نے ایک جلتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور پھر چونک کر بونٹ سے ہٹنے والی عالیہ کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔ کہ سب کیا ہے۔ تمہیں تو ملنے سے منع کیا تھا۔ چند لمحے خاموش نگاہیں ٹکراتی رہیں۔ پھر عالیہ نے ہمت کر کے سچ بول دیا۔

"ڈیڈی ہم دونوں ٹائی ٹینک فلم دیکھ کر گھر جانا چاہتے تھے کہ گاڑی نے آج دوسری مرتبہ دھوکا دے دیا۔ اسے صبح ہی کسی شوروم پر بھیج کر دوسری گاڑی منگوا دیجیے۔"

"ہاں ضرور کیوں نہیں ہمیں اپنی بیٹی کی تکلیف ایک پل کے لیے بھی گوارہ نہیں۔ اس وقت ورکشاپ مین آ پہنچا۔ اس نے معائنہ کیا اور کہا کہ نقص کافی بڑا ہے۔ مکمل معائنہ ورکشاپ میں ہو گا۔ چنانچہ عالیہ اور سیٹھ صاحب نے اس کا کارڈ دیکھ کر ورکشاپ بات کی اور پھر اسے گاڑی لے جانے کا اشارہ کیا۔

پھر وہ دونوں دوسری گاڑی میں سوار ہو گئے۔ شہزاد نے پچھلی سیٹ پر بیٹھنا پسند کیا تھا۔ عالیہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ورکشاپ دیکھ کر شوکت نے گاڑی کا رخ مال روڈ کی طرف موڑ دیا۔

چند لمحاتی سکوت کے بعد وہ اچانک عالیہ سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹی میں اپنی اور تمہاری امی کی ادویات لینے کے لیے نکلا ہوں جو صرف مال روڈ سے ہی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر

علم

☆ کسی سوال کا جواب معلوم نہ ہو تو لاعلمی کا اظہار کر دینا بھی نصف علم ہے۔

☆ دو چیزوں کی انتہا تک پہنچنا دشوار ہے۔ ایک عقل، دوسرا علم۔

☆ بے شک علم کو نقل کرنے والے تو بہت ہیں مگر اس کی حفاظت کرنے والے بہت ہی کم۔

☆ علم خدا کا بہترین عطیہ اور عمدہ زیور ہے۔

☆ جو انسان اپنے علم کو ضائع کرتا ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

☆ علم عقل کا چراغ اور معرفت دل کا نور ہے۔

☆ مال دنیا سے بہتر ہے کہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے، جبکہ تم مال و متاع دنیا کی حفاظت کرتے ہو۔

☆ ہر انسان کی قدر اس کے علم کے مطابق ہوتی ہے۔

(ڈاکٹر مبارک علی، اسلام آباد)

دو تین بار دوائیاں تبدیل کر چکا ہے لیکن بے خوابی اور ڈپریشن بڑھتا جا رہا ہے، رات رات بھر نیند نہیں آتی، وہم اور خوف اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ بلڈ پریشر بھی رہنے لگا ہے۔" سیٹھ شوکت مرزا نے پیشانی سے سردی کے باوجود پسینے کی ننھی ننھی بوندیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

اس وقت گاڑی مال روڈ کے سرخ سگنل پر رکی ہوئی تھی۔ شہزاد سکتے کی کیفیت میں باپ بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ ابھی تک شوکت مرزا کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں سے خود کو جھلسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں ڈیڈی آپ کو رات رات بھر نیند نہیں آتی شاید اس لیے کہ آپ ایک نوجوان بیٹی کے باپ ہیں۔ ایک آزاد خیال اور ماڈرن لڑکی کے باپ، جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ مری گھومنے پھرنے نکل جاتی ہے۔

اپنے دوست کے ساتھ سینما سے نکل کے رنگے ہاتھوں پکڑی جاتی ہے۔" شوکت مرزا خاموش رہے۔

"لیکن ڈیڈی ایک بات واضح کر دوں رات کتنی ہی گہری اور تاریک کیوں نہ ہو پر آپ کی بیٹی کی عصمت کو نہیں ڈس سکتی۔"

چند لمحوں کے لیے گاڑی میں پھر سکوت طاری ہو گیا۔ شوکت مرزا نے اندر ہی اندر سلگتے ہوئے گاڑی میڈیکل سٹور کے سامنے کھڑی کر دی اور نسخہ نکال کے شہزاد کی طرف بڑھا دیا۔ پھر دو ہزار روپے بھی نکال کر دیئے۔ "معافی چاہتا ہوں مسٹر شہزاد طبیعت کچھ ٹھیک نہیں اگر تم لے آؤ۔"

"ہاں...... ہاں سیٹھ صاحب کیوں نہیں۔" شہزاد نے ہلکاتے ہوئے کہا۔ وہ شرمندہ اور خجل دکھائی دے رہا تھا۔

وہ نسخہ ہاتھ میں لیے تھکے تھکے بوجھل قدموں سے میڈیکل سٹور کی طرف بڑھنے لگا۔ شوکت مرزا نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور پھر عالیہ سے مخاطب ہوئے۔

بیٹی زندگی کے فیصلے خوب سوچ سمجھ کر کرنے چاہئیں۔ کیونکہ غلط فیصلوں کو وقت کبھی بھی معاف نہیں کرتا۔ انسان ساری زندگی پچھتاوے کی آگ میں سلگتا رہتا ہے۔ کف افسوس ملتا ہے۔ لیکن زندگی کی رعنائیاں پھر دوبارہ ہاتھ نہیں آتیں۔

"ڈیڈی فیصلے دلوں کی پسند نہ پسند سے ہوتے ہیں۔ دنیا داری کے تقاضے اسے اپنا محکوم نہیں بنا سکتے۔ ہم نے خوب سوچ سمجھ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما ہے اور ہم زندگی کی اگلی منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں، نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ، حرص و ہوس کی ایک چنگاری بھی ہم نے بھڑکنے نہیں دی۔ کجا ہم ستے جذبات کے شعلوں میں پگھل پگھل کر بہہ گئے ہوتے۔

☆☆☆

شہزاد ادویات کا نسخہ لیے میڈیکل سٹور کی طرف جا رہا تھا۔ کاغذ کا پرزہ جو نسخہ تھا اسے اپنے خلاف قانونی دستاویز معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی جرم نامہ ہو۔ عالیہ کے والد کی ذو معنی باتیں اس کے دل میں چنگاریاں لگا رہی تھیں۔ شہزاد خریداروں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ جیسے کسی مجرم کو قید خانے میں دھکیل دیا گیا ہو۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ اپنا گھر اور شہر چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے لیکن خدا نہ کرے اگر عالیہ کو کچھ ہو گیا تو وہ خود کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

"اف یہ نادان لڑکی، بڑی ہی ضدی ہے۔"

ادویات لے کر وہ واپس آ گیا اور پچھلی نشست پر گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ضدی عالیہ شہزاد کی طرف جھکتی چلی جا رہی تھی وہ کسی پابندی یا روک ٹوک کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔ دوسری طرف شوکت مرزا اور ان کے دوست کے بیٹے ندیم میں قربت بڑھتی جا رہی تھی۔ دونوں میں گاڑھی چھن رہی تھی۔ ندیم نے شوکت مرزا کو شیشے میں اتار لیا تھا۔ ہر بات میں ان کی ہاں میں ہاں ملانا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔

عالیہ کو یہ بے جوڑ دوستی اور قربت بری طرح کھل رہی تھی۔ ندیم نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن عالیہ نے اسے مکمل طور پر مسترد کر دیا۔

اتوار کے دن ان دونوں میں شطرنج بازیاں بھی پائیں باغ میں جمنے لگی تھیں۔ شوکت مرزا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ندیم کی شخصیت میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن عالیہ چیخ اٹھی کہ اس سے کہیے کہ اب یہاں قدم بھی نہ رکھے لیکن سیٹھ شوکت مرزا نے کوئی جواب نہ دیا اور خالی خالی نگاہوں سے اسے گھورتے رہے۔

☆☆☆

مارکیٹ سے بسکٹ، جام اور کیک وغیرہ خرید کر شوکت مرزا عالی شان دکان سے باہر نکلے اور تیز تیز چلتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ سامان انہوں نے بیکری ملازم کے ذریعے پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ ان کی برابر والی نشست پر وجیہہ اور خوبصورت نوجوان ندیم بلیو جین اور سفید شرٹ میں کچھ زیادہ ہی پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی انگلیاں ہولے ہولے سر کے سنہری بالوں میں کنگھا کر رہی تھیں۔ سال نو کا آغاز تھا اور سیٹھ صاحب کے گھر ایک شاندار پارٹی کا اہتمام ہو رہا تھا۔ ان کے عزیز و اقارب کے علاوہ دوست احباب بھی تشریف لا رہے تھے۔ باورچی بڑے چولہوں پر باغ میں طرح طرح کی ڈشیں بنانے میں مصروف تھے۔ گھر روشنیوں سے ہر سال کی طرح جگمگا رہا تھا۔ نئے سال کو ایک خوبصورت استقبالیہ دیا جا رہا تھا۔ چار جانب تازہ رنگ روغن سے عمارت کھلی پڑی تھی۔

شوکت مرزا ہر سال اپنے کاروباری دوستوں کو نئے سال کی خوشی میں اپنے گھر مدعو کیا کرتے تھے۔ پارکنگ ایریا سے نکلتے ہی سیٹھ شوکت کی گاڑی اچانک ایک عجیب سی آواز کے ساتھ بند ہو گئی۔ سیٹھ شوکت نے دوبارہ چابی اگنیشن میں داخل کر کے گھمائی ریس بڑھائی گیئر لگایا لیکن گاڑی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اب ندیم دروازہ کھول کر باہر نکلا اور بونٹ اٹھا کر پرزوں کی دنیا میں الجھ گیا۔ لیکن جلد ہی اس نے وہ چھوٹا سا نقص ڈھونڈ نکالا اور سیٹھ صاحب کو گاڑی اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔ اب گاڑی فوراً اسٹارٹ ہو گئی۔ آواز بھی معمول پر آ گئی۔

ندیم مسکراتا ہوا برابر والی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔

"تم ایک ذہین اور عملی آدمی ہو اس لیے میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔" شوکت مرزا نے ستائشی نظروں سے ندیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس آپ کی نظروں کا کرم ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے۔" ندیم نے سر جھکا لیا۔

"تم ہر لحاظ سے ترقی پرور اور کامیاب انسان ثابت ہو گے۔ چاول کی نئی کھیپ آتے ہی تم میرے مشوروں کی روشنی میں ان کیٹریڈنگ کرنا پھر قسمت تم پر مہربان ہو جائے گی اور اگلے پچھلے سارے نقصانات بھی پورے ہو جائیں گے۔" سیٹھ شوکت مرزا نے گرم جوشی سے اس کے کندھے کو دباتے ہوئے کہا اور اسے خود سے اور قریب کر لیا۔

"شوکت صاحب! میں آپ کے احسانات کا بوجھ عمر بھر نہیں اتار سکتا۔"

آپ نے کبھی مجھے باپ کی محسوس نہیں ہونے دی۔ اتنی شفقت، محبت اور نظر التفات تو آج کل اپنے گھر میں بھی نہیں ملتی۔ جو آپ مجھ پر نچھاور کر رہے ہیں۔ دونوں میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے گھر آ گئے۔ لیکن جیسے ہی گاڑی نے اقبال ٹاؤن کی طرف موڑ کاٹا۔ سیٹھ شوکت کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہک گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ دماغ چکرا گیا۔

گاڑی آؤٹ آف بیلنس ہو کر ایک موٹر سائیکل کو روند کر رکھ دیتی مگر ندیم پھرتی سے سٹیئرنگ وہیل کو گھما کر بریک پر موجود ان کے پاؤں کو سختی سے دباتا چلا گیا۔ موٹر سائیکل سوار خوفزدہ نظروں سے گاڑی کو دیکھ کر سیٹھ شوکت کو کوستا ہوا آگے نکل گیا۔

"شاید پی کر چلاتا ہے۔" آخری جملہ اس نے بآواز بلند ادا کیا تھا۔ کئی گاڑیوں کے بریک عقب میں چرچرائے اور وہ رکتی چلی گئیں۔ چند لمحوں میں سیٹھ صاحب کے حواس بحال ہو گئے اور کار پھر دوڑنے لگی۔

"کیا بات ہو گئی تھی مرزا صاحب؟" ندیم نے چونک کر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"کیا بتاؤں بیٹے! ایک لڑکی کا باپ ہونا آج کل بڑی مصیبت ہے۔" سیٹھ شوکت نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

وہ ندیم سے یہ بات چھپا گئے تھے کہ سخت ممانعت کے باوجود وحدت روڈ موڑ پر عالیہ اپنی گاڑی میں شہزاد کو بٹھائے تیزی سے گزر گئی تھی۔ اس کڑوے منظر نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور گاڑی بہک گئی۔

"بیٹے میں ایک بار پھر تمہارا مشکور ہوں۔ تم انتہائی حاضر دماغ اور پھرتیلے نوجوان ہو، تمہارا مستقبل روشن ہے۔ میں نے کئی بار عالیہ کے سامنے تمہارا تذکرہ چھیڑا لیکن وہ تو یوں منہ بسورنے لگی جیسے دانتوں میں کوئی کڑوا بادام آ گیا ہو۔" سیٹھ شوکت نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں سیٹھ صاحب۔" پسند اپنی اپنی، ہر انسان اپنی پسند ارادے اور سوچ میں آزاد ہے۔ کب کون کس کا ہو جائے اور کس سے دور ہو جائے یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا، انسان کی ضرورت اور چاہت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ جو جس کو اہمیت دیتا ہے اس کے چکر میں زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے۔" سیٹھ شوکت مسکرا دیئے۔

"ماشاء اللہ کافی ذہین ہو اور فلسفہ بھی جانتے ہو۔"

"اگر آپ عالیہ کی وجہ سے پریشان ہیں تو عملی طور پر سختی سے کام لیں، صرف زبانی سرزنش آج کے دور میں کچھ اہمیت نہیں رکھتی، ایک کان سے سنی اور دوسرے سے نکال دی۔ پھر اکلوتے پن کا فائدہ سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔ ناز سے پالی ہوئی اولادیں ماں باپ کی فرمانبردار نہیں ہوا کرتیں تجربہ یہی کہتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" سیٹھ شوکت نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میں صرف اس لیے سختی سے باز پرس نہیں کرتا کہ کہیں عالیہ ٹوٹ پھوٹ نہ جائے۔ اس کی زندگی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ جس کی خاطر ہم نے تمام عمر اپنی جان کو تھوڑا تھوڑا قربان کیا ہے کہیں وہ کسی قربانی کی زد میں نہ آ جائے۔" سیٹھ شوکت نے فطری جذبہ عود کر آیا۔ ندیم نے خاموشی اختیار کر لی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

☆☆☆

اقبال ٹاؤن میں واقع شوکت مرزا کی چار کنال کی کوٹھی روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ کھانے کا دور ختم ہو چکا تھا اور اب فریش کریم کیک کے ٹکڑے میزوں پر تقسیم کیے جا رہے تھے۔ ڈائننگ ہال میں بڑی میز کے گرد سیٹھ شوکت کے ساتھ چند اہم کاروباری دوست موجود تھے۔ شوکت مرزا بڑی بے تکلفی اور روانی سے ندیم کا تعارف کروا رہا تھا کہ عنقریب اس کی اور عالیہ کی شادی کر دی جائے گی۔ عالیہ یہ سنتے ہی غصہ میں آگ بگولہ ہو کر ہال سے سرک گئی اور دوسرے ہی لمحے گاڑی کے ٹائروں کے چیخنے سے ایک لمحے کے لیے ماحول ہل کر رہ گیا۔ وہ گاڑی میں گھر سے باہر جا رہی تھی۔

تمام لوگ چونک اٹھے۔ سیٹھ شوکت نے بات بنا دی کہ وہ ہمیشہ تھرلنگ انداز میں گاڑی چلاتی ہے۔ اکثر ٹائر بدلوائے جاتے ہیں کچھ دیر بعد آ جائے گی۔ کچھ دیر کے بعد سیٹھ شوکت اور اس کے دوستوں کی کاروباری گفتگو میٹنگ کا انداز اختیار کرتی چلی گئی۔ چند مہمان اب رخصت ہو رہے تھے۔ رشتہ دار مہمان خانوں کا رخ کر رہے تھے۔ البتہ ندیم قریب ہی موجود تھا۔

دو تین اہم کاروباری معاہدوں کے متعلق کاغذات کی لکھائی مکمل ہونے پر سیٹھ شوکت مرزا انہیں بریف کیس میں رکھ کر تجوری میں محفوظ کرنے کے لیے ہال سے نکل کے دوسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ زینہ قریب ہی تھا۔

سیٹھ شوکت مرزا نے تجوری والے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ اس نے بھیڑ دیا۔ کسی کے اس طرف آنے کا امکان نہ تھا۔ باغ میں میوزیکل پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ مہمان اور سیٹھ صاحب کے دوست بھی اب اس طرف جا رہے تھے۔ سیٹھ نے رک کر کمرے پر سرسری سی نگاہ ڈالی اور کمرے میں دروازے کے سامنے ایک طرف موجود ایک بڑے آرائشی گملے کے کسی حصے سے ایک جھٹکے کے ساتھ دیوار گیر الماری کی چابیاں نکال لیں۔ الماری کے ایک خانے میں سیف نصب تھا۔ باقی خانوں میں دوسری اہم اشیاء موجود تھیں۔ سیٹھ شوکت نے قریب جا کر تجوری کے سوراخ میں چابی لگائی ہینڈل پر دباؤ ڈالا، عین اسی لمحے ہلکی سی آواز سن کر سیٹھ نے مڑ کر دیکھا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ دوسرے ہی لمحے آنے والے نے کوئی شے تیزی سے سیٹھ کی کنپٹی پر ماری سیٹھ لڑکھڑا کر بے ہوش ہو گیا۔ بے ہوشی کے عالم میں بھی اس کی آنکھوں میں حیرت کا عنصر منجمد دکھائی دے رہا تھا۔

جب سیٹھ شوکت مرزا کو ہوش آیا تو تجوری خالی پڑی تھی وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے عالیہ کے لیے بنوائے گئے زیورات کے خالی خانے کو دیکھ کر دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر وہ تیزی سے ندیم ندیم پکارتا ہوا بھاگا۔ اس کی پھولی ہوئی سانس پھیلی ہوئی آنکھیں اور بگڑی حالت دیکھ کر سب ہی مہمان و حاضرین چونک پڑے۔ کافی لوگ تو اب جا چکے تھے جو موجود تھے ان کے گرد جمع ہو گئے۔

سیٹھ شوکت نے موبائل پر پولیس کو ڈکیتی کی اطلاع دی اور اپنے گارڈ اور چوکیدار کو ادھر ادھر بھگانے لگا۔ پھر عالیہ کا نمبر ملایا۔

"ہاں ڈیڈی بول رہی ہوں۔"

"ب...... بیٹی میں" ان کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا وہ ہکلا کر رہ گیا۔ گردن جھکی ہوئی تھی۔

"آپ تو ندیم کے ساتھ بڑے خوش نظر آ رہے تھے یہ یکایک اتنے گھبرائے ہوئے کیوں معلوم ہو رہے ہیں۔" عالیہ نے اپنے جدید ترین موبائل کی سکرین پر والد کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ...... وہ...... بیٹی...... میں بہت شرمندہ ہوں۔" سیٹھ شوکت اٹک اٹک کر بولا۔ جیسے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہوں۔

"بیٹی! وہ چالاک، چالباز، مکار، لٹیرا، چور دبے پاؤں میرے تجوری والے کمرے میں چلا آیا اور میرے تجوری کھولتے ہی کوئی شے میرے سر پر مار کر مجھے بے ہوش کر کے دو کروڑ کی نقدی اور تمہارے جہیز کے سارے زیورات چرا کر بھاگ نکلا ہے۔ میں اس حرام زادے ندیم کی بوٹیاں کتوں سے نچوا دوں گا۔" سیٹھ شوکت غصے سے چلا اٹھا۔

"بیٹی اب مجھے تمہارے شہزاد سے ملنے اور آگے بڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں۔"

عالیہ کو اس لمحے یوں محسوس ہوا جیسے شہزاد کا جلا ہوا سیاہ بوسیدہ مکان سرسبز و شاداب ہریالی میں گھیرا ہوا خوبصورت محل ہو جس کے چار جانب رنگ رنگ کے پھول مسکرا رہے ہوں۔ "بیٹی مجھے تمہارے انتخاب پر اب فخر محسوس ہو رہا ہے۔ فنکار واقعی سچے اور باکردار انسان ہوتے ہیں۔ میں نے جسے تیز اور زمانہ ساز سمجھا وہ بہت بڑا فراڈ نکلا۔ کوئی بات نہیں بیٹی کے انتخاب کی خوشی میں مجھے ڈھائی کروڑ روپے کا نقصان منظور ہے۔"

"ڈیڈی ایک خوش خبری ہماری طرف سے سنیئے۔" عالیہ نے چلا کر کہا۔

"ابھی کچھ دیر قبل ایک ڈاکو اپنے بریف کیس سمیت شاید پولیس ناکے سے بچتا ہوا شہزاد کے مکان میں گھس آیا تھا۔ اس نے ریوالور کے بل بوتے پر شہزاد کو یرغمال بنانے کی کوشش کی لیکن شہزاد کو دبنا پسند نہیں وہ موقع پا کر مسلح ڈاکو سے بھڑ گیا۔ اور اسے چت کر دیا وہ ویٹ لفٹنگ اور مکہ بازی بھی کر چکا ہے۔ وہ چور مار کھا کے بے ہوش پڑا ہے اور یہ مجرم آپ کے ندیم صاحب ہیں۔" عالیہ نے لہجے میں بے پناہ مسرت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"ارے ہائیں......" سیٹھ شوکت کا منہ حیرت، مسرت اور تعجب سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

تاریخ اٹک

شاہد سلیم
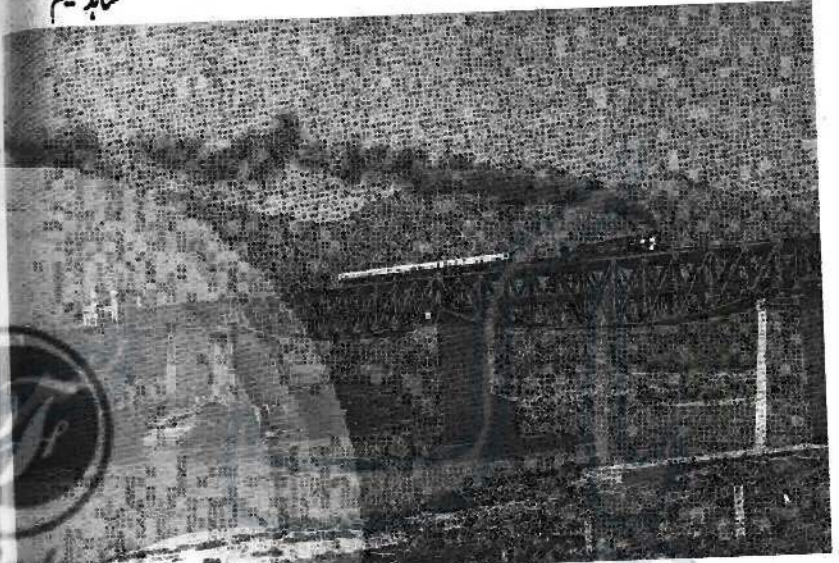
غداری کی سزا موت:

چنگیز خان کی عمر تقریباً 56 برس تھی۔ چین کی فتوحات سے فارغ ہو کر وہ آرام سے بیٹھا تھا۔ مسلمان تاجروں کی بہت آمد تھی جن کی بدولت اسے پتہ تھا کہ مغرب میں اس کا نزدیک ترین ہمسایہ علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ ہے جس کی سلطنت ہندوستان سے بغداد تک اور بحیرہ خوارزم سے خلیج فارس تک پھیلی ہوئی ہے جو ایک ترک خانہ بدوش خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی فوج کی تعداد چار لاکھ تھی۔ جب وہ چاہتا اردگرد کے علاقوں سے مزید فوج طلب کر سکتا تھا۔

چنگیز خان نے اسے دوستی کا پیغام بھیجا اور باہمی تجارت کو فروغ دیا۔ یہ سلسلہ چند سال تک جاری رہا مگر اچانک خوارزم شاہ کے ایک قلعہ دار نے کئی سو تاجروں کو گرفتار کر لیا اور ان پر جاسوسی کا الزام لگایا۔ محمد خوارزم شاہ نے بغیر سوچے سمجھے قلعہ دار کو تاجروں کے قتل کا حکم دیا۔ تاجر قتل کر دیئے گئے۔ جب یہ اطلاع چنگیز خان کو ہوئی تو اس نے احتجاج کے لیے قاصد خوارزم شاہ کے پاس بھیجے۔

خوارزم شاہ نے اقتدار کے نشے میں قاصدوں کے امیر کو قتل کر دیا اور اس کے باقی ساتھیوں کی داڑھیاں جلا دیں۔ چنگیز خان کو اطلاع ملی تو وہ مشتعل ہو گیا۔ اس کے نزدیک غداری اور وعدہ شکنی کی سزا موت تھی۔ چنانچہ اس نے علاؤ الدین خوارزم شاہ کو پیغام بھیجا۔

”تو نے لڑائی کا انتخاب کیا ہے اب جو ہونا ہے ہو کر رہے گا اور کیا ہو گا مجھے معلوم نہیں صرف خدا کو معلوم ہے۔“

1219ء کے موسم بہار میں قراقرم شہر جو آج صحرائے گوبی کی ریت میں دفن ہو چکا ہے کے قریب ایک ندی کے کنارے چراگاہوں میں دس ہزار جنگجوؤں کا لشکر اکٹھا ہوا اور خوارزم شاہ کو انجام تک پہنچانے کے لیے چل پڑا۔

جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے مختلف قبائل کے لشکر ساتھ شامل ہوتے گئے اور وہ تیزی سے منزل کی طرف گامزن رہے۔ راستے میں چنگیز خان نے اپنے بڑے بیٹے جوجی کو چند ہزار سواروں کے ساتھ الگ کیا اور اسے دوسرے راستے سے تیزی سے پہنچنے اور جائزہ لینے کو کہا۔ اصل لشکر مغرب کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا طوفانی ہواؤں، انتہائی سردی اور بدترین حالات کے باوجود دو لاکھ آدمیوں نے اپنا راستہ بنایا۔ راستے کی گرتی برف میں یہ لوگ آرام سے سو جاتے۔ غذا باقی نہ رہتی تو گھوڑے کی فصد کھولتے۔ تھوڑا سا خون پی لیتے اور پھر رگ کو ٹانکہ لگا دیتے۔ جب برف پگھلنے کا زمانہ آیا تو چنگیز خان کا لشکر 1200 میل کا فاصلہ طے کر کے مغرب کے میدانوں میں پہنچ چکا تھا۔ سامنے دنیائے اسلام کی حد شروع ہو رہی تھی۔ خوارم شاہ مغلوں کے پہنچنے سے پہلے ہی میدان جنگ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ چار لاکھ فوج تھی۔ جب اس کے جاسوسوں نے اسے مغل لشکر کے بارے میں بتایا تو ہر طرح کے سامان اور اسلحے سے آراستہ خوازمیوں نے مغلوں کو بڑی حقارت سے دیکھا۔

اسی دوران مغلوں نے چھوٹے چھوٹے حملے شروع کر دیئے وہ جہاں حملہ کرتے دوسرے دن اس سے پچاس میل دور حملہ ہو جاتا۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ لوگ کدھر سے آتے اور کدھر چلے جاتے ہیں۔ دراصل یہ جوجی کے دستے تھے جن کا کام فوج کے لیے سامان صرف فراہم کرنا تھا۔ جوجی چونکہ آسان راستے سے تیزی سے سفر طے کر رہا تھا۔ اس لیے وہ جلد ہی خوارزم شاہ کے قریب پہنچ گیا۔ خوارزم شاہ مغلوں سے کئی گنا زیادہ فوج لے کر جوجی کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے جب پہلی بار ان خانہ بدوشوں کو دیکھا جن کے پاس نہ زنجیریں تھیں نہ زرہیں تھیں اور نہ ہی ڈھالیں تھیں۔ تو اس نے ان خانہ بدوشوں کو ختم کرنے کے لیے فوراً حملہ کر دیا جوجی کے ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ کچھ وقت تک کے لیے پیچھے ہٹ کر خان اعظم کا انتظار کیا جائے مگر جوجی نے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر میں پیچھے بھاگ گیا تو اپنے باپ کو کیا جواب دوں گا۔
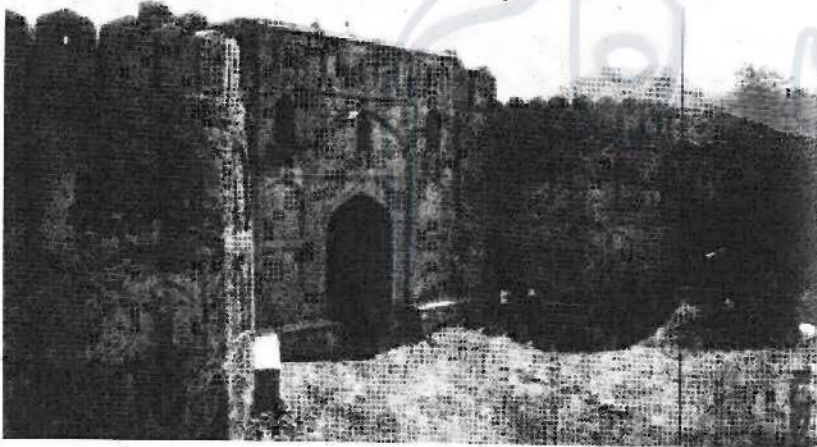
جنگ شروع ہوئی تو مغلوں کے سرفروش دستے، طوفانی سوار دستے، تلوار بردار اور نیزے بردار دستے خوارزم کی فوج پر ٹوٹ پڑے اور تھوڑی ہی دیر میں اپنے سے بہت بڑی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا۔

خوارزم شاہ مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ مغل ایک لاکھ سے زیادہ آدمیوں کو کاٹ کر واپس پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔ اس مقابلے کے بعد خوارزم شاہ کے فوجیوں میں مغلوں کا خوف سرایت کر گیا اور مغل یکے بعد دیگرے آگے بڑھتے اور شہر فتح کرتے چلے گئے۔ خوارزم شاہ پناہ کی تلاش میں بخارا پہنچ گیا۔ چنگیز خان کے لشکر نے اس کا تعاقب کیا مغلوں کی آمد کی اطلاع پا کر خوارزم شاہ بخارا سے بھاگ گیا۔ بخارا اسلامی سلطنت کا حامل ایک قدیم شہر تھا۔ مدارس کا مرکز، شہر کے وسط سے ایک نہر گزرتی تھی جس کے کنارے پر دلکش باغ اور خوبصورت محلات تھے۔ یہ شہر کئی اماموں، سیدوں اور علماء کا مسکن تھا۔ بیس ہزار سے زیادہ ترک فوج اور ایرانیوں کی بہت بڑی تعداد اس کی حفاظت پر معمور تھی۔

اس شہر کے سینے میں ایمان کی حرارت تھی۔ شہر کی حفاظت کے لیے بہت مضبوط فصیل تھی۔ مسلمان چاہتے تو اس شہر کی حفاظت کئی ماہ تک کر سکتے تھے۔ کھانے پینے اور لڑنے کا سامان وافر موجود تھا۔ مگر مغلوں کی ہیبت اس قدر سب پر طاری تھی کہ ترک افسرات کو چپکے سے شہر سے نکل کر فرار ہو گئے۔ مغلوں نے پہلے انہیں جانے دیا پھر تعاقب کر کے دریا کے کنارے سب کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ محافظ فوج کے جانے کے بعد شہر کے معززین نے متفقہ فیصلہ کیا اور شہر کی چابیاں مغلوں کو پیش کر دیں اور ان سے اپیل کی کہ شہر والوں کی جان بخشی کر دی جائے۔

مغل فوراً شہر میں داخل ہوئے غلے کے گوداموں کو لوٹ لیا۔ کتب خانے جلا دیئے اور انہیں اپنے گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا۔ عورتوں کی ان کے عزیزوں کے سامنے عصمت دری کی۔ پورے شہر کو اس قدر آگ لگائی کہ سیاہ دھوئیں کی وجہ سے آسمان پر سورج روپوش ہو گیا۔

اس اذیت ناک مصیبت اور اذیت کے بعد چنگیز خان تیزی سے خوارزم شاہ کے تعاقب میں بخارا سے سمرقند روانہ ہوا۔ سمرقند انتہائی مستحکم شہر تھا جس کی فصیلیں انتہائی مضبوط تھیں۔ شہر کے بارہ آہنی دروازے تھے۔ بیس مسلح ہاتھی اور ایک لاکھ ترک سپاہی شہر کی حفاظت پر معمور تھے۔ مغلوں کی تعداد ان لوگوں کی تعداد سے بہت کم تھی۔ شہر کے مکین اگر ہمت اور حوصلے سے کام لیتے تو مغل دستے کئی ماہ تک اس شہر کو فتح نہیں کر سکتے تھے۔ ڈرے ہوئے محصور فوجیوں نے صرف ایک دفعہ ہی مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر شکست کھائی اور ان کی رہی سہی ہمت بھی دم توڑ گئی۔

کچھ موڑ سے رخت سفر:

میرا نام شاہد سلیم ہے میں تحصیل حسن ابدال کے ایک خوبصورت اور دلکش قصبے کچھ موڑ کا رہنے والا ہوں۔ یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں دریائے ہرو گزرتی ہے۔ یہاں پر آٹے کے جندر ہیں جو پانی کی بدولت چلتے ہیں، یہ 1920ء میں بنائے گئے ہیں، کافی دور دور سے لوگ آٹا پسوانے آتے ہیں، اس کے ساتھ سیر و تفریح سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس سے قبل یہاں کے لوگ غاروں پہ پناہ لیتے تھے۔ جوں جوں آبادی بڑھتی گئی لوگ غاروں سے نکل کر اس گاؤں کچھ موڑ کی جانب نقل مکانی کرتے چلے آئے۔

اسی وجہ سے ہمارے گاؤں کا نام کچھ موڑ رکھا گیا۔ یہاں پہ اک بزرگ شاہ غریب بابا گزرے ہیں۔ آپؒ 1060ء میں نگراؤں میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کا سلسلہ نسب حضرت شیخ شہاب الدین کے ذریعے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ کا وصال 82 سال کی عمر میں 12 ذیقعد 1142 ہجری کو ہوا۔

آپؒ جلو موڑ وے اور کچھ موڑ کے درمیان قبرستان میں مدفون ہیں۔ کافی دور سے لوگ عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے آتے ہیں۔ آپؒ کی وجہ سے چوہا شاہ غریب میں پانی کا ایک چشمہ نمودار ہوا۔ جس کی وجہ سے کافی لوگوں کی بیماریاں دور ہوئیں، یہ خارش یا دانے والی بیماریوں کے لیے زیادہ موثر ہے۔

ہمارے گاؤں کے تین اطراف میں گندم کی لہلہاتی فصلیں عجیب بہار دکھا رہی تھیں۔ چوتھی جانب گاؤں کے مکان تھے۔ مجھے خیال آیا کہ یہاں سے دریائے سندھ کی جانب رخت سفر باندھا جائے۔ دراصل بات یہ تھی کہ میرے کزن بابر کے پاس موٹر سائیکل تھی اور میں یہ قیمتی موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اتنے دنوں میں دریائے سندھ کے کنارے سلطان جلال الدین کی یادگاروں کے بارے میں کچھ ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں۔

سلطان جلال الدین نے دریائے سندھ کے جس مقام پر چنگیز خان سے مقابلہ کیا تھا اسے نیلاب کہا جاتا ہے۔ دریائے سندھ اٹک کے قریب یک دم چوڑا ہو جاتا ہے اور پھر پہلے جنوب پھر مغرب اور جنوب کی جانب رخ بدلتا ہے۔ اس مقام پر سلطان جلال الدین نے چنگیز خان سے مقابلہ کے لیے فوج ترتیب دی تھی۔ وہ باغ نیلاب کی سمت جا رہے تھے تاکہ کشتیاں حاصل کر کے دریا پار کر لیں مگر اس سے پہلے ہی دشمن نے انہیں آلیا۔

نیز سلطان جلال الدین نے جس جگہ سے دریا میں چھلانگ لگائی تھی، اس کے بارے میں قدیم کتب تواریخ ''جہاں کشا جوینی'' اور روضۃ الصفا میں اشارے ملتے ہیں۔ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے دریا میں چھلانگ لگانے کے بعد دوسرے کنارے پر پہنچ کر اپنا گھوڑا جس ڈھلوان پر چڑھایا وہ آج بھی ''گھوڑا ٹپ'' کہلاتی ہے علاوہ ازیں ''بچوں کا اسلام'' کے قلم کار عبد الرحمٰن ابدالی سے بھی کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔

عبد الرحمٰن ابدالی نے بھی سلطان جلال الدین کی یادگاروں کی کھوج میں اس علاقے کا گشت کیا ہے۔ وہ اٹک شہر اور دریائے سندھ کے درمیان واقع گاؤں مانسر پہنچے۔ وہاں سے اپنے دو عزیزوں کے ہمراہ دریا کے کنارے خاک چھانتے رہے۔ بالآخر تلاش منزل انہیں دریا کے پار لے گئی۔ وہاں مقامی باشندوں سے معلومات کے بعد وہ اس میدان میں جا پہنچے جہاں سلطان جلال الدین اور چنگیز خان کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی۔

مگر انہیں اس چٹان کا پتہ نہ مل سکا جہاں سے سلطان نے جست لگائی تھی۔ انہوں نے دریا کے کنارے قدیم ''نیلاب گاؤں'' بھی تلاش کر لیا تھا۔ جس کا نام اب تبدیل ہو چکا ہے۔ اکثر لوگ اسے باغ کہتے ہیں۔ ان معلومات کے حصول کے بعد مجھے لگتا تھا کہ میں کامیابی کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ کچھ موڑ سے اٹک شہر کا فاصلہ تقریباً 28 کلو میٹر ہے اور دریا اٹک سے کوئی سولہ کلو میٹر دور ہے میرا اندازہ تھا کہ موٹر سائیکل پر 45 کلو میٹر کا یہ فاصلہ طے کرنا ہمارے لیے زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

بابر دل و جان سے ساتھ چلنے کو تیار تھا۔ اسی روز ہم نے اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ میرے کزن بابر نے مجھے ساتھ بٹھایا اور موٹر سائیکل تیزی سے دوڑا دی۔ مگر جب ہم جی ٹی روڈ تک پہنچے تو اچانک مجھے خیال آیا کہ کچھ تو کھانے کے طور پر ساتھ لے لیا جائے۔ روڈ کے کنارے جلو گاؤں میں میرے ماموں امیر حسین کا گھر ہے، ہم کچھ دیر وہاں رکے، انہوں نے جلدی سے ایک ٹفن میں بھنڈی کا مزے دار سالن اور کھیر پیک کر کے دے دی۔

ہم روٹی پکنے کا انتظار نہ کر سکے اور اللہ کا نام لے کر روانہ ہو گئے۔ اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ راستے میں پانی کی بھی ضرورت پڑے گی۔ تقریباً گیارہ بج رہے تھے، دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ راستے میں دریائے ہرو کا پل آیا۔ دریائے ہرو پوٹھو ہار کا مشہور دریا ہجو پہاڑوں، چشموں اور برساتی ندی نالوں سے خراج وصول کرتے ہوئے دریائے سندھ کی جانب بڑھتا جاتا ہے۔

اس کا زیادہ سفر دو طرفہ بلند و بالا ٹیلوں کے حصار میں ہوتا ہے۔ بالآخر اٹک سے آگے یہ دریائے سندھ کی جھولی میں جا گرتا ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے ہم نجوال کینٹ سے گزر رہے تھے۔ ابر آلود صبح کب کی رخصت ہو چکی تھی۔ اور اب گرم دوپہر جلد کو جھلسانے لگی تھی۔ تقریباً بارہ بجے ہم اٹک شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ ہمیں عبدالرحمٰن ابدالی کی بات یاد آئی کہ اب "نیلاب" کا نام متروک ہو چکا ہے۔ کچھ مقامی لوگوں نے باغ کا نام سن کر سر ہلایا اور ہمیں پتہ بتا دیا۔ بعض لوگ اسے باغ نیلاب بھی کہتے ہیں۔ مگر نیلاب کے لفظ سے اسے پہچاننے والے اب خال خال ہیں۔

گیدڑ چوک اور شیر کی کچھار:

اٹک کے مشہور گیدڑ چوک سے ایک سڑک پنڈی گھیپ کو جاتی ہے۔ اسی سے ایک ذیلی سڑک باغ نیلاب کی سمت مڑ جاتی ہے۔ گیدڑ چوک سے اسلام کے اس ببر شیر کے نقوش پا کی طرف چلتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ آج دریائے سندھ سے جبل الطارق تک عالم اسلام میں ہر سو گیدڑوں کا بسیرا ہے۔ وہ شیر جن کی دھاڑ سے چین کے فرمانروا اور یورپ کے تاج دار لرزتے تھے۔ ناپید ہو چکے ہیں۔ اٹک سے دریائے سندھ تک کا راستہ کتنا خوش منظر ہے۔ اس کا اندازہ گزرنے والے ہی کو ہو سکتا ہے۔

دونوں جانب چھوٹے چھوٹے دیہات، ہرے بھرے کھیت، سایہ دار درخت، دور سر اٹھائے ہوئے پہاڑ اور ان کی چوٹیوں پر کھیلتے ہوئے بادل۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دست قدرت نے حسن کے سارے موتی یہیں بکھیر دیے ہیں۔ سڑک اب بلندی کی جانب جا رہی تھی۔ اترائیوں کی نسبت چڑھائیاں زیادہ آ رہی تھیں۔ آٹھواں میل نامی مشہور اسٹاپ پہ ہمیں ایک دیہاتی طرز کا چھپر نما ہوٹل دکھائی دیا۔ جس کا ذکر اٹک کے مقامی باشندوں سے سنا تھا۔ ہوٹل سے مزید معلومات لے کر ہم دائیں ہاتھ کی پتلی سڑک پر مڑ گئے۔ ایک ڈھلوان پر دریائے ہرو ایک بار پھر چکر کاٹ کر ہمارے سامنے آ گیا۔ اب یہ دریائے سندھ سے گلے ملنے کو تھا۔

ایک چھوٹے سے پل کے ذریعے اسے عبور کر کے ہم پھر بلندی کی جانب بڑھنے لگے۔ بلندی بڑھتی جا رہی تھی، چکر دار چڑھائیوں پر موٹر سائیکل چلانا خاصا دشوار تھا مگر میرا کزن بابر بڑی مہارت سے اسے بھگائے جا رہا تھا۔ پھر ایک موڑ پر اچانک ہلکی ہلکی خنک ہوا ہمارے گالوں کو چھونے لگی۔ دریا کی موجوں سے بھیگے ہوئے جھونکے ہمارا استقبال کر رہے تھے۔ پھر بلندی کی طرف جاتی سڑک کے دائیں ہاتھ پر دور کہیں نشیب میں دریائے سندھ کا نیلا پانی جھلکتا دکھائی دینے لگا۔

شمال میں غازی بروتھا نہر پروجیکٹ کے دھندلے دھندلے آثار نظر آ رہے تھے۔ دریائے سندھ شمال سے جنوب کی طرف بہتا ہوا ایک دم مغرب کی سمت چکر کاٹ رہا تھا۔ یہاں اس کی شکل انگریزی کے حرف W کے مشابہ ہو جاتی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سانپ بل کھاتا جا رہا ہے۔ دریا کا یہ خوبصورت موڑ ہم اس وقت کوئی ایک کلو میٹر کی مسافت اور تقریباً 300 فٹ کی بلندی سے دیکھ رہے تھے۔ اس پتلی سی

سڑک پر کچھ آگے چل کر نشیب میں ہمیں ایک گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ باغ نیلاب تھا۔ دریا کی لہریں ساحل کی پتھریلی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر پلٹ رہی تھیں۔

سندھ کا نیلا پانی:

یہ پتلی سی سڑک اب نیلاب گاؤں کی جانب نیچے کو اترنے لگی تھی۔ ایک جگہ تو ڈھلوان اتنی خطرناک تھی کہ وہاں میرا موٹر سائیکل پر سوار رہنا یقینی حادثے کو دعوت دینا تھا۔ لہٰذا مجھے موٹر سائیکل سے نیچے اترنا پڑا۔ بابر احتیاط کے ساتھ موٹر سائیکل کو نیچے اتار لایا۔ گاؤں کے کچے پکے اور نیم پختہ مکانات کے درمیان گلیوں میں نوعمر بچے اور بچیاں ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

چونکہ ہمیں گاؤں سے زیادہ دریائے سندھ کے ساحل اور ساحلی سندھ سے زیادہ اس چٹان سے دلچسپی تھی۔ جسے سلطان جلال الدین نے تاریخ میں ہمیشہ کے لیے حوالہ بن جانے والی حیرت انگیز چھلانگ کے لیے منتخب کیا تھا۔ اسی لیے ہم چند لمحے گاؤں کا نظارہ کرنے کے بعد آگے ساحل کی طرف بڑھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ سڑک یہاں ختم ہو جائے گی مگر سڑک گاؤں سے گزر کر ساحل کے ساتھ ساتھ آگے چلی جا رہی تھی۔ کسی ایسے بغلی راستے کی تلاش میں جو ہمیں ساحل دریا تک لے جائے ہم سڑک پر آگے بڑھنے لگے مگر ایسا کوئی راستہ نہ ملا۔ کچھ دور جا کر ہم رک گئے۔ سڑک سے ذرا نیچے نشیب میں ایک دیہاتی طرز کی خوبصورت مسجد نظر آ رہی تھی۔ ہم ذرا دیر کے لیے اس خوبصورت منظر میں کھو سے گئے۔ پرسکون ساحل خاموش دریا، جس کی خاموشی صدیوں پرانی داستانیں اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔

ایسی داستانیں جنہیں کانوں سے نہیں دل سے سنا جا سکتا ہے۔ دریائے سندھ کا نیلا پانی دو صوبوں کے درمیان بہہ رہا تھا۔ جس طرف ہم کھڑے تھے کسانوں، محنت کشوں اور سپاہیوں کا مرکز صوبہ پنجاب تھا۔ دوسری سمت دلیروں، شہ زوروں اور غیرت مند فرزندان اسلام کی سرزمین صوبہ خیبر پختونخواہ کے دیہات، کھیت اور پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ دریائے سندھ کو پوٹھوہار کے باشندے "سن" کہتے ہیں سینکڑوں برس سے دیہاتی لوگ چار سمتوں میں سے ایک سمت یعنی شمال کی جگہ بھی اس دریا کا نام استعمال کرتے آئے ہیں۔

مثلاً اگر کسی نے شمال کی طرف واقع کسی بستی کا پتا معلوم کرنا ہے تو دریائے سندھ کے رخ پر اشارہ کر کے اسے کہا جائے گا۔

"جی! سینوں والے پاسے جاؤ۔" (جناب شمال کی طرف جائیے)

علاقوں کے لحاظ سے دریائے سندھ کے نام بدلتے رہتے ہیں۔ ہر صوبے کا باشندہ اسے الگ نام سے پکارتا ہے۔ یہ تبت میں کوہ ہمالیہ کی بلند و بالا برف پوش چوٹیوں سے پھوٹتا ہے اور دریائے ہنزہ، دریائے گلگت کے بعد کشمیر کے پہاڑی ندی نالوں اور چشموں سے خراج وصول کرتا ہوا صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں اسے "اباسن" کہا جاتا ہے۔

اٹک کے قریب سے گزرتے ہوئے دریائے کابل (لنڈا دریا) دریائے سوات اور دریائے کنٹر کا پانی اپنے دامن میں لیے اس سے معانقہ کرتا ہے، یہاں اسے دریائے اٹک یا سن کہا جاتا ہے، کچھ لوگ اسے نیلاب بھی کہتے ہیں اس علاقے میں مغربی جانب سے صوبہ خیبر پختونخواہ کے دریائے کرم، دریائے گومل، دریائے ٹوچی اور دریائے بولان بھی اس سے آ ملتے ہیں۔

مشرقی سمت سے پوٹھوہار کے دریائے ہرو اور دریائے سواں اس سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ یوں اس کی طاقت اور بہاؤ میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں دریائے سندھ کی سرکشی اور جولانی کا نظارہ قابل

دیہ ہے۔ اس کے خطرناک پیچ وخم اور جھاگ اڑاتی موجیں بتاتی ہیں کہ دریا ہر حد اور ہر بندش سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر اس علاقے میں خالق کائنات نے اسے دو طرفہ پہاڑوں، بلند چٹانوں اور سخت مٹی والے ٹیلوں کے حصار میں نہ رکھا ہوتا تو اس کا پاٹ نہ معلوم کتنے میل تک جا پھیلتا۔

پنجاب کے میدانی علاقے میں یہ پہاڑی حصار ختم ہوتے ہی دریائے سندھ دونوں جانب بے پناہ یلغار کرتا ہوا علاقوں کے علاقے اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ پنج ند کے مقام پر پنجاب کے پانچوں دریا راوی، جہلم، بیاس، ستلج اور چناب اس کی حاشیہ برداری قبول کر لیتے ہیں۔ اس طرح یہ عظیم دریائے سندھ کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں میدانی علاقے کی وجہ سے اس کی رفتار کم ہو جاتی ہے، لہریں پرسکون ہو جاتی ہیں۔ مچھیرے اور مسافر کشتیوں پر اطمینان سے ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ صوبہ سندھ میں اسے دریائے مہران یا دریائے سندھ کہا جاتا ہے۔ مہران کا نام اسے عربوں اور ایرانیوں نے دیا ہے۔ اس کا قدیم نام "سندھو" ہے۔ قدیم یونانی مورخ نے دریائے سندھ کو "انڈس" کہا ہے اور اسی سے انڈ، ہنڈ اور انڈیا ماخوذ ہیں اور غالباً اسی مناسبت سے دریائے سندھ کے اس طرف بالائی پنجاب کی زبان کا نام ہندکو پڑ گیا ہے۔ اپنے سفر کے 1800 میل مکمل کر کے بحیرہ عرب میں گرنے سے پہلے دریائے سندھ کا عظیم ڈیلٹا 125 میل طویل ساحل کو گھیرتا ہے۔ اس ڈیلٹا کا رقبہ تین ہزار مربع میل تک جا پہنچتا ہے۔ باغ نیلاب ہندکو بولی بولنے والوں کا گاؤں ہے۔ تہذیب و تمدن وہی ہے جو اٹک کے گرد و نواح کے دیگر دیہاتوں کا ہے۔ یہاں کے باشندے زراعت پیشہ ہیں یا گلہ بانی کرتے ہیں۔

بہت سے لوگ آس پاس کے جنگلات سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے ہیں۔ جنہیں قریبی قصبوں اور شہروں میں فروخت کیا جاتا ہے۔ نیلاب گاؤں کے باسیوں کا ایک اور ذریعہ آمدن کشتی رانی ہے۔ صدیوں سے یہ مقام دریائے سندھ کا خطرناک پاٹ عبور کرنے کے لیے گھاٹ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ دریائے سندھ کے پانی کا بہاؤ اتنا تیز اور زور آور ہے کہ اسے دیکھ کر ہی اچھے اچھوں کی ہمتیں جواب دے جاتی ہیں۔ وہ ماہر تیراک جو ہرو اور سواں جیسے دریا بڑی آسانی سے عبور کر لیتے ہیں۔ دریائے سندھ کی موجوں میں اترنے کا حوصلہ نہیں کر پاتے۔ اکثر مقامات پر چپوؤں والی کشتی بھی جواب دے جاتی ہے۔

یہاں تقریباً ایک سو کلو میٹر کے علاقے میں صرف دو مقامات ایسے ہیں جہاں دریا کا پاٹ غیر معمولی طور پر چوڑا اور اس کا بہاؤ نسبتاً پرسکون ہے۔ اتنا کہ اس میں کوئی خطرہ مول لیے بغیر کشتی اتاری جا سکتی ہے۔ ایک تو یہی جگہ نیلاب ہے جہاں کشتیوں کا گھاٹ آٹھ سو برس پہلے اس وقت بھی تھا جب سلطان جلال الدین چنگیز خان کے تعاقب سے بچنے کے لیے اس طرف آئے تھے۔ وہ اسی امید پر ادھر آئے تھے۔ کہ انہیں اس جگہ اتنی کشتیاں اور اتنا وقت میسر آ جائے گا کہ وہ اپنی فوج سمیت پار جا سکیں گے۔ مگر جب انہیں توقع کے برخلاف پار جانے کا موقع نہ مل سکا تو اسی میدان میں انہوں نے دشمن کا مقابلہ کیا۔ دریا پار کرنے کی دوسری جگہ صوبہ سرحد میں صوابی کی حدود میں "ہنڈ" ہے۔

ہنڈ سے ہند تک:

ہنڈ کسی زمانے میں قدیم گندھارا سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ یہیں سے سکندر اعظم نے دریا عبور کیا تھا۔ اس زمانے میں اسے "اوہنڈ" کہا جاتا تھا۔ اسی جگہ سید احمد شہیدؒ اور سکھوں کے درمیان ایک یادگار لڑائی بھی ہوئی تھی۔ دریائے سندھ دنیا کے بڑے دریاؤں میں

سے ایک ہے۔ اس کی تہذیب ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر آباد شہر، دیہات اور قصبے دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی یادگار ہیں۔ جسے آج بھی وادی سندھ کی تہذیب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے تہذیب و تمدن کے یہ نقشے بت پرستی کی نجاست سے آلودہ تھے۔ صدیوں پہلے یہاں اسلام کی روشنی جگمگائی تو یہ کثافت دور ہوئی اور ایک سادہ اسلامی تہذیب نمایاں ہو گئی۔ آج بھی یہاں وہی قدیم طرز زندگی ہے۔ وہی ہزاروں سال پرانے پیشے ہیں بکریاں چرانا، مویشی پالنا، کھیتوں میں کام کرنا، لکڑیاں کاٹنا، دریا کے اس جانب بولی جانے والی ہندکو زبان بھی اپنی شیرینی اور سادگی میں لاجواب ہے۔

نرم عاجزانہ لہجہ اور بات بات میں جی کی تکرار یہاں کے باشندوں کی خصوصیت ہے۔ ہندکو زبان برصغیر کی تمام زبانوں میں اردو کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے باشندے شہر جا کر با آسانی اردو پر عبور حاصل کر لیتے ہیں۔ دیہاتوں کے بڑے بوڑھے بھی اردو نہ جاننے کے باوجود سمجھ ضرور لیتے ہیں۔

پرسکون دریا میں دو تین کشتیاں چل رہی تھیں۔ مگر وہ ہم سے خاصی دور اور دوسرے کنارے سے زیادہ قریب تھیں۔ دریا کے پار ہمیں وسیع میدان صاف نظر آ رہا تھا۔ جس کی حدود میں سلطان جلال الدین اور چنگیز خان کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی تھی اور جہاں اب کھیتوں نے سبزے کی چادر تان رکھی تھی۔ میں نے بابر سے کہا بابر اس میدان تک جائے بغیر لطف نہیں آئے گا۔ کیا خیال ہے چلیں۔

جانے کی کیا صورت ہو گی۔ بابر نے پوچھا۔

دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یہاں سے اٹک پل تک جائیں جو کم از کم دس کلو میٹر دور ہو گا۔ پھر وہاں سے مڑ کر دوسرے کنارے کے ساتھ چلتے ہوئے اسی ساحل نیلاب کے بالمقابل آ جائیں۔ دوسرے کنارے پر سڑک ہو گی۔

جی ہاں! عبدالرحمٰن ابدالی کی بیان کردہ معلومات کے مطابق دوسرے کنارے پر بھی دریا کے ساتھ ساتھ سڑک ہے۔ مگر یہ ہمارے لیے لمبا چکر ثابت ہو گا۔ کیوں نہ کشتی کے ذریعے دریا پار کر لیا جائے۔ بابر نے مشورہ دیا۔

"اور موٹر سائیکل کا کیا ہو گا؟" میں نے سوال کیا۔

"موٹر سائیکل گاؤں میں کسی کے پاس رکھوا دیں گے یا کشتی میں ساتھ لے جائیں گے۔" بابر نے ترکیب بتائی۔

یہ ٹھیک ہے مگر پار جانے سے پہلے میں اس چٹان کو ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ جس سے سلطان جلال الدین نے دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔

ٹھیک ہے، پہلے ہم اس چٹان کو تلاش کر لیتے ہیں۔ چونکہ ہم یہ فرض کر چکے تھے کہ نیلاب گاؤں کے سامنے ہی سلطان جلال الدین نے گھوڑا دریا میں ڈالا تھا۔ اس لیے ہم گاؤں کے آس پاس دریا کے کنارے کو دیکھنے لگے۔ ساحل پر کوئی مقامی شخص دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے کسی سے پوچھنا بھی ممکن نہ تھا۔

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ہمیں گاؤں سے کسی رہنما کو ساتھ لے لینا چاہیے تھا۔ اب سورج تیزی سے ڈھل رہا تھا۔ میں نے مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ فی الحال واپس چلتے ہیں۔ اگلی بار بہتر منصوبہ بندی اور تیاری کے ساتھ آئیں گے۔

بابر نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور انہی پر پیچ راہوں سے گزرتے ہوئے ہم واپس ہو لیے۔

دریائے سندھ کے پار
کامرہ کے دوراہے پر!

برھان، لارنس پور اور ہٹیاں۔ جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ یکے بعد دیگرے گزرتے گئے ہٹیاں میں شیر

شاہ سوری کی جرنیلی سڑک کے کنارے بنا ہوا ایک بڑا کنواں اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔

ایسا ہی ایک کنواں واہ کینٹ میں بھی ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا تھا مگر وقت کی کمی کی بناء پر ہم یہاں رکے بغیر آگے نکل گئے۔ چند کلومیٹر آگے کامرہ آ گیا۔ اب ہم دوراہے پر تھے یہاں سے جی ٹی روڈ سیدھا مغرب کی جانب چلا جاتا ہے اور دریائے سندھ کو عبور کر کے صوبہ سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔

بائیں جانب ایک سڑک مڑتی ہے جو کامرہ چھاؤنی سے گزر کر اٹک شہر تک جاتی ہے۔ ہمیں باغ نیلاب اور گھوڑا ترپ جانے کے لیے اٹک شہر کی جانب مڑنا چاہیے تھا۔ مگر اس سے پہلے ہم اس میدان جنگ تک جانا چاہتے تھے جہاں سلطان جلال الدین اور چنگیز خان کے مابین تاریخی معرکہ ہوا تھا نیلاب ساحل سے میدان جنگ تک کشتیوں کے ذریعے رسائی مشکل ہے۔ میدان جنگ تک پہنچنے کا یقینی ذریعہ یہی ہے کہ جی ٹی روڈ کا اٹک پل عبور کیا جائے اور دوسرے کنارے پر چکر کاٹ کر نیلاب ساحل کے مقابل آیا جائے۔ اس سوچ کی بنیاد پر ہم سفر کی ابتداء ہی میں طے کر چکے تھے کہ ہم اٹک پل سے دریائے سندھ کے پار نکل جائیں گے اور اس طرف میدان جنگ کی سیر کے بعد نیلاب ساحل اور گھوڑا ترپ کا رخ کریں گے۔

اٹک قلعہ اور اٹک شہر:

ہم جی ٹی روڈ پر سیدھے آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ دریائے سندھ ہمارے سامنے آ گیا۔ بائیں ہاتھ پر اکبر کا تعمیر کردہ عظیم اٹک قلعہ، خاکستری چادر اوڑھے سویا ہوا دیو معلوم ہو رہا تھا۔ اٹک کا نام بھی اکبر کا دیا ہوا ہے۔ اس کا قافلہ کابل جاتے جاتے یہاں اٹک گیا تھا۔ دریا پار کرنے کی کوئی صورت نہ تھی، ان دنوں بھی یہاں آبادی تھی۔ بادشاہ نے اسے اٹک کا نام دے دیا۔ پھر اس نے دفاعی لحاظ سے اس مقام کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے یہاں یہ عظیم الشان قلعہ بنوایا۔

اس کی تعمیر 1580ء میں شروع ہوئی مشہور معمار خواجہ شمس الدین خوانی نے پتھروں اور چٹانوں کا یہ پرہیبت حصار اس طرح قائم کیا کہ وسط ایشیاء اور افغانستان سے آنے والے حملہ آوروں کو یہاں سے قدم آگے بڑھانا مشکل ہو گیا۔ ویسے تو اٹک شہر بہت قدیم ہے یہ ٹیکسلا، ہڑپہ اور موئن جوڈرو کا ہم عصر رہا ہے سکندر اعظم اور اس کے بعد وسط ایشیاء سے آنے والے تقریباً سب حملہ آور درہ خیبر کے بعد یہاں سے گزرے ہیں۔

ہندوستان پر سترہ حملہ کرنے والے سلطان محمود غزنوی نے 1001ء میں اپنی پہلی مہم یہیں سے شروع کی تھی۔ 1205ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے یہاں معرکہ آزمائی کی، 1519ء میں ظہیر الدین بابر ادھر سے گزرا، مگر اس شہر کو صحیح معنوں میں استحکام اٹک قلعے کی بدولت ملا۔ قلعے کی بہترین دفاعی نظام کی بدولت اسے مغلیہ سلطنت کا مضبوط مورچہ تصور کیا جانے لگا۔ اس کی آبادی بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ برطانوی دور حکومت میں مقامی انگریز افسر کیمبل کے نام پر اسے کیمبل پور کا نام دیا گیا۔ مقامی لوگوں نے اس لفظ کو آسان کر کے "کامل پور" بنایا اب بھی یہاں کے باشندے اسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔

1978ء میں حکومت پنجاب نے اسے سرکاری طور پر "اٹک" کا نام لوٹا دیا۔ اب یہ ایک بہت بڑا ضلع بن چکا ہے۔ جس کی حدود راولپنڈی، چکوال، میانوالی، جہلم، مردان، ہزارہ، کوہاٹ، نوشہرہ، خوشاب اور سرگودھا سے جا ملتی ہے۔ اٹک، پنڈی گھیپ، حسن ابدال اور فتح جنگ پر مشتمل اس ضلع کی آبادی پندرہ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ جبکہ اٹک شہر میں دو لاکھ سے زائد افراد بستے ہیں۔ کوئلہ چونے کے پتھر، سنگ مرمر اور تیل و گیس

یہاں کی معدنی دولت ہیں۔ طیاروں کی بناوٹ اور مرمت کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارے "ایروناٹیکل کامرہ کینٹ" اور اسلحہ ساز کمپنی پاکستان آرڈیننس فیکٹری نجوال کینٹ نے اٹک کی شہرت دور دور تک پھیلا دی ہے۔ اٹک قلعہ دریائے سندھ کے کنارے جس مقام پر ہے اسے اٹک خورد کہا جاتا ہے۔ دفاعی لحاظ اسے اب اس کی وہ اہمیت نہیں رہی مگر بہر حال یہ ہمارا تاریخی ورثہ ہے۔ قلعے کی بوسیدہ، سیم زدہ دیواریں، ٹوٹے ہوئے کنگرے اور افسردہ برج اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ ہم اس ورثے کی حفاظت میں سنگین کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

یہاں متعدد سرکاری دفاتر قائم ہیں قلعے کے ایک حصے کو عرصے سے جیل کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اسے پاکستان کی سب سے کٹھن جیل کہا جاتا ہے میاں نواز شریف جیسے حکمران، آصف زرداری جیسے سرمایہ دار اور مولانا اعظم طارق جیسے جواں ہمت عالم نے اپنی زندگی کے سخت ترین ایام یہاں گزارے ہیں۔

خیر آباد اور دریائے سندھ کا پل:

اٹک قلعے کی اداس دیواروں کے پاس سے گزرتے ہوئے ہماری گاڑی اب دریائے سندھ کے پل پر پہنچ چکی تھی۔ یہ پل حکومت پاکستان نے تعمیر کرایا ہے۔ ہم خیر آباد سے پل کے پار پہنچے تو خیر آباد قصبہ ہمارے سامنے آ گیا۔ کہتے ہیں یہ نام بھی اکبر بادشاہ نے دیا تھا۔ جب اٹک پر کچھ مدت اٹکے رہنے کے بعد اس کا کارواں بخیر و عافیت دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا تو سامنے آنے والی پہلی بستی کو اس نے خیر آباد کہہ کر پکارا۔ خیر آباد سے ہم بائیں ہاتھ پر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ اسے نظام پور روڈ کہا جاتا ہے۔ اب ہم صوبہ سرحد کے ضلع نوشہرہ کی حدود میں سفر کر رہے تھے۔ تقریباً اڑھائی دو کلومیٹر آگے دریائے سندھ پر انگریزوں کا بنایا ہوا دیو ہیکل لوہے کا پل نظر آیا، اس پل کی مضبوطی قابل دید ہے۔ ستونوں کی سنگینی، بلندی اور موٹائی بھی حیران کن ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، زیریں حصے پر سڑک ہے اور بالائی حصے پر ریلوے لائن راولپنڈی سے پشاور جانے والی ریل گاڑی یہیں سے گزرتی ہے۔ البتہ نچلا حصہ ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ اب گاڑیاں دریائے سندھ عبور کرنے کے لیے نیا پل استعمال کرتی ہیں۔

میدان جنگ کی تلاش:

گفتگو کے دوران ہمیں فاصلے کا صحیح پتہ ہی نہ چلا، سڑک بھی اب دریا سے خاصی دور ہو گئی تھی دریا بائیں ہاتھ پر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی جگہ سرسبز کھیتوں نے لے لی تھی۔ دائیں جانب پہاڑی سلسلہ تھا۔ ہم دریائے سندھ کی اس جانب باغ نیلاب کے مقابل آنا چاہتے تھے مگر غلطی سے کچھ آگے نکل آئے تھے۔ ایک جگہ پر رک کر راستہ پوچھا۔

مقامی لوگوں نے رہنمائی کی۔ ہم اس سڑک پر واپس لوٹے اور تقریباً اڑھائی تین کلومیٹر طے کر کے سڑک سے نیچے کچے راستے پر اتر گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ دریا چند سو گز دور ہو گا مگر سڑک اور دریا کے درمیان اب تقریباً چار کلومیٹر فاصلہ حائل ہو چکا تھا۔ یہاں سرسبز کھیتوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ ہم نے ایک گاؤں کے باہر گاڑی روکی تاکہ ساحل نیلاب تک رسائی کے لیے مزید رہنمائی لی جائے۔

صوبہ سرحد کے جنگجوؤں کی اک جھلک:

اچانک گاؤں کی ایک نشیبی گلی سے چھ مسلح نوجوان ہمارے سامنے آ گئے ان کے جسموں پر جنگ کا سامان سجا ہوا تھا۔ کلاشنکوفیں، پستول، اضافی میگزین، خنجر، دوربینیں، ٹارچ، پانی کی بوتلیں لگتا تھا کہ وہ کسی محاذ پر جا

رہے تھے یا ڈاکہ مارنے نکلے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے ہم چونک گئے مگر ان کا انداز دوستانہ تھا۔

انہوں نے ہمیں نیلاب ساحل کا پتہ اچھی طرح سمجھا دیا۔ جب ہم وہاں سے چلے تو حسن جمیل نے بتایا کہ یہ جنگجو قبائلی ہیں ان کی ساری عمر آپس میں لڑتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ غالباً یہ نوجوان بھی کسی دشمن سے نبرد آزما ہونے جا رہے ہیں۔ ہم کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے کچے مگر کشادہ راستے سے گزرتے ہوئے چند منٹ میں دریا کے ساحل پر پہنچ گئے۔ ہمارے قدم اس میدان کو چھو رہے تھے جس میں صدیوں پہلے حق و باطل کا تاریخ ساز معرکہ برپا ہوا تھا۔

تاریخ کے صفحات پلٹنے لگے:

دریائے سندھ کے پار گاؤں "باغ نیلاب" کے چھوٹے چھوٹے مکانات، پہاڑی ڈھلوانوں پر گڑیوں کے گھروندے معلوم ہو رہے تھے درمیان میں پانچ چھ سو فٹ تک دریا کی لہریں سورج کی روشنی میں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں اس ساحلی میدان کا جائزہ لینے لگا جو دریا کے کنارے کنارے دور تک چلا گیا تھا۔ یہ تقریباً دس کلو میٹر چوڑا اور کوئی 25 کلو میٹر لمبا ہوگا۔ اس میدان کی دوسری جانب ایک سنگلاخ پہاڑ دکھائی دے رہا تھا۔

ایک جانب سے دریائے سندھ کے موڑ اور دوسری جانب سے پہاڑی دیوار نے اس میدان کو کسی قدر بیضوی شکل دے دی تھی۔ یہ تھا وہ میدان جسے اسلام کے جلیل سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے نسل انسانیت کے قاتل اعظم چنگیز خان سے نبرد آزمائی کے لیے منتخب کیا تھا۔ آج یہاں کتنی خاموشی تھی۔ سکون تھا۔ معلوم ہوتا تھا کھیت، میدان اور پہاڑ سب گہری نیند سو رہے ہیں۔ مگر ایک وہ دن تھا جب یہاں گھوڑوں کی ہنہناہٹ، تیروں کی سنسناہٹ، تلوار کی جھنکار، سپاہیوں کی للکار اور زخمیوں کی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ دریا کی لہروں کا تموج ساحل کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر شاید یہ بھولی بسری داستان دہرا رہا تھا۔ میں اس منظر میں کھو گیا۔ تصور کے دھندلکوں میں تاریخ کے صفحات خود بہ خود پلٹتے جا رہے تھے۔

خوارزم سے نیلاب تک

چنگیز خان کا عالم اسلام پر حملہ:

ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں عالم اسلام میں سلطنت خوارزم سب سے وسیع و عریض اور طاقت ور مملکت تھی۔ اس کی حدود ماوراء النہر سے لے کر دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھیں۔

علاوہ الدین محمد خوارزم شاہ اس کا مطلق العنان فرمانروا تھا جو دنیا پر اپنی معرکہ آزمائی اور جہانگیری کا سکہ بٹھا چکا تھا۔ بغداد کا عباسی خلیفہ ناصر (جس کا تعلق اہل تشیع سے تھا) اس کا سخت مخالف تھا۔ دونوں میں ایک بار جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ اس دوران منگولیا سے چنگیز خان آندھی و طوفان کی طرح نمودار ہوا اور تاتاری وحشیوں کے بے پناہ سیلاب کے ساتھ چین، کوریا، تبت اور تمام مشرقی ایشیاء پر قابض ہو گیا۔ اس طرح تاتاری مملکت اور سلطنت خوارزم کی سرحدیں باہم مل گئیں۔

اب چنگیز خان نے خوارزم پر حملے کی منصوبہ بندی شروع کی۔ اس دوران اس نے خوارزم سے سفارتی اور تجارتی تعلقات بھی قائم کر لیے اور بغداد کے سیاسی پس منظر کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ عباسی خلیفہ نے اسے خفیہ پیغام رسانی کے ذریعے آگاہ کیا کہ اگر وہ خوارزم پر حملہ کرے گا تو عالم اسلام سے خوارزم کی حمایت میں کوئی آواز نہیں اٹھے گی۔

انہی دنوں خوارزم کے سرحدی شہر اترا کے حاکم نے چنگیز خان کی مملکت سے آنے والے ایک تجارتی وفد کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر کے ہلاک کرا دیا۔ چنگیز خان نے احتجاج کے طور پر علاوہ الدین محمد کے دربار میں قاصد بھیجا۔ علاوہ الدین محمد نے عاقبت نا اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے بھی قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد عالم اسلام کی بد نصیبی کا تاریک ترین دور شروع ہوا۔ چنگیز خان متوقع جنگ کے لیے مکمل منصوبہ بندی پہلے ہی کر چکا تھا۔ بغداد کے پیغام نے اسے مزید حوصلہ بخشا تھا اور اب تاتاری قاصد کے قتل کے بعد اس کے پاس حملے کا معقول بہانہ موجود تھا۔

سو اس نے آٹھ لاکھ درندہ صفت تاتاریوں کے ساتھ صحرائے گوبی سے کوچ کیا اور 616ھ میں خوارزم کی سرحدوں پر آ پہنچا۔ خوارزم شاہ نے پیش قدمی کر کے کاشغر کے قریب ایک تنگ وادی میں تاتاریوں سے ٹکر لی مگر اسے شکست ہوئی۔ 20 ہزار لاشیں چھوڑ کر وہ پسپا ہوا۔ تاتاریوں نے کئی اطراف سے خوارزم پر یلغار کی اور مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ آبادیوں کو خاکستر کر دیا، مدارس، مساجد، محلات، قلعوں اور فصیلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ فرغانہ، اترا، قوقند، بخارا، سمرقند، مرو، ترمذ، ہرات، نیشاپور، ہمدان، رے اور نسا جیسے اسلامی تہذیب و تمدن کے قدیم مراکز آناً فاناً پیوند زمین ہو گئے۔ خوارزم لٹتا رہا۔ جلتا رہا مگر عالم اسلام میں سے کسی ملک نے اس کی مدد کی زحمت گوارا نہ کی۔

ایک سال سے بھی کم عرصے میں تاتاری پامیر سے لے کر بحیرہ خزر تک تمام اسلامی شہروں پر قابض ہو گئے۔ سلطان علاوہ الدین محمد خوارزم شاہ نے تاتاریوں کے خوف سے بحیرہ خزر کے ایک جزیرے میں پناہ لی اور وہیں بے وطنی کی موت مر گیا۔ عالم اسلام پر خوف و دہشت کی وہ حالت طاری تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک ایک تاتاری درجنوں مسلمانوں کو ذبح کر ڈالتا اور وہ ہاتھ ہلانے کی جرات نہ کرتے ان وحشیوں کی طوفانی یلغار نے یورپ اور افریقہ تک کے حکمرانوں کو لرزا دیا تھا اور وہ ڈر رہے تھے کہ کسی دن تاتاری عالم اسلام کو مکمل طور پر روندنے کے بعد ان کے سروں پر آ پہنچیں گے۔

سلطان جلال الدین کا جذبہ جہاد:

مگر ان مایوس کن حالات میں علاوہ الدین محمد خوارزم شاہ کے بیٹے شہزادہ جلال الدین نے خوارزم کے بچے کھچے سپاہیوں، رضا کاروں اور مجاہدین کو جمع کر کے عالم اسلام کے دفاع کا بیڑا اٹھا لیا۔ انہوں نے مٹھی بھر افراد کے ساتھ کئی میدانوں میں تاتاریوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مختلف مقامات پر جہادی مراکز قائم کرنے کی کوششوں کے بعد 617ھ میں وہ ایران کے لق و دق صحرا پھلانگتے ہوئے افغانستان روانہ ہوئے جس کا مشرقی اور جنوبی حصہ اب تک تاتاریوں کی زد سے محفوظ تھا۔

مولف "طبقات ناصری" نے ثقہ زاویوں سے نقل کیا ہے کہ اس سفر میں ان کی ملاقات حضرت خضرؑ سے ہوئی جنہوں نے انہیں ایک اسلامی حکومت کی بادشاہت کی دعوت دی۔ یہ بشارت سچ ثابت ہوئی۔ افغانستان پہنچ کر سلطان جلال الدین نے غزنی پر قبضہ کیا اور پھر قبائلی سرداروں کی مدد سے تاتاریوں کو کئی محاذوں پر عبرت ناک شکستیں دیں۔ قندھار، زابل اور کابل سے بامیان جانے والی شاہراہ پر تاتاریوں سے تین زور دار معرکے ہوئے۔ ہر معرکے میں کفار عبرت ناک شکست کھا کر پسپا ہوئے۔

آخر کار چنگیز خان نے بھرپور تیاریوں کے ساتھ ایک عظیم لشکر سلطان جلال الدین کے مقابلے میں روانہ کیا۔ اس بار کابل کے شمال میں جبل السراج کے مقام پر دونوں لشکروں کی ٹکر ہوئی۔ جان توڑ لڑائی کے بعد تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی۔ مسلمانوں کو بے شمار مال

غنیمت ہاتھ آیا اور دشمنوں پر اسلامی لشکر کی بے جگری کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ موقع ایسا تھا کہ اگر مجاہدین اتحاد و تنظیم برقرار رکھتے تو تاتاریوں کو دیوار چین کا راستہ ناپنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ مگر برا ہو حرص مال کا کہ اس نے بڑوں بڑوں کو پھسلا دیا اور بار ہا ہاتھ آئی عظیم تر کامیابیوں کو ناکامیوں میں بدل ڈالا۔

انتشار اور پسپائی:

جبل السراج کے موقع پر فتح کے بعد مال غنیمت کی تقسیم میں اسلامی فوج کے دو سرداروں سیف الدین اغراق اور امین الملک میں جھگڑا ہو گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ سیف الدین اغراق اپنے 40 ہزار سپاہیوں سمیت سلطان جلال الدین کا ساتھ چھوڑ کر چل دیا۔ کئی اور امراء بھی اپنے اپنے گروہوں کو لے کر اس کے ساتھ ہو گئے۔

اسلامی فوج کی طاقت ایک تہائی رہ گئی۔ چنگیز خان کو یہ خبر ملی تو اس نے تمام صوبوں میں بکھری ہوئی تاتاری افواج کو مجتمع کیا اور بگولے کی طرح غزنی کی طرف لپکا جہاں سلطان جلال الدین اس کا منتظر تھا۔ سلطان اس مختصر سی فوج کے ساتھ تاتاری ٹڈی دل کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

نہوں نے جنوب مشرق کا رخ کیا تا کہ دریائے سندھ عبور کر کے مملکت ہندوستان میں داخل ہو جائیں اور وہاں کے حکمران سلطان شمس الدین التمش سے مدد لے کر دشمن کے خلاف متحدہ محاذ بنائیں۔ تاتاری بھی بڑی تیزی سے سلطان کا تعاقب کر رہے تھے اور بغیر رکے منزل پر منزل مارتے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ کئی سو کلومیٹر طویل سفر کے بعد سلطان جلال الدین دریائے سندھ کے کنارے اس میدان میں پہنچے جس کے دوسرے کنارے پر نیلاب گاؤں ہے۔

کشتیاں جلا دو:

زمانہ قدیم سے ساحل نیلاب کشتیوں کے گھاٹ کے طور پر مشہور رہا ہے۔ سلطان جلال الدین کو یہاں وافر مقدار میں کشتیاں میسر آ جانے کی امید تھی۔ مگر جب وہ یہاں پہنچے تو یہاں پر صرف چند کشتیاں تھیں۔

آٹھ دس گز لمبی، چپوؤں سے چلنے والی قدیم طرز کی یہ کشتیاں صدیوں سے اس گاؤں کے باشندوں کا ذریعہ معاش ہیں۔ شاید اس دن بھی یہاں اتنی ہی کشتیاں ہوں گی۔ جب سلطان جلال الدین یہاں پہنچے تھے۔ انہیں تیس ہزار سپاہیوں کو پار لے جانے کے لیے ایک پورے بحری بیڑے کی ضرورت تھی۔ اس قسم کی چند کشتیاں بھلا ان کے کیا کام آتیں۔

ہاں! یہ بات یقینی تھی کہ سلطان اپنے اہل و عیال اور خصوصی مصاحبین سمیت کسی دقت کے بغیر پار جا سکتے تھے۔ اپنی حفاظت کے لیے سپاہیوں کا ایک دستہ بھی دریا کے پار منگوا سکتے تھے۔ آج کل کے بے حمیت حکمران ہوتے تو یہی سوچتے۔ وہ اس کے سوا سوچ بھی کیا سکتے ہیں کہ قوم کو مصائب کے بھنور میں دھکیل کر اپنے شاندار مستقبل کا تحفظ کرتے رہیں اور اپنی عیش و عشرت کا سامان جمع کرتے رہیں مگر سلطان جلال الدین ایک غیور مسلمان تھے۔

اپنی قوم، اپنی فوج اور اپنے جان سے عزیز مجاہد ساتھیوں کو ایسے آڑے وقت میں چھوڑ جانے کا تصور بھی ان کے نزدیک گناہ تھا۔ انہوں نے اپنی اولاد، بیویوں اور والدہ کو بھی ایک عام مجاہد پر ترجیح نہ دی۔ حکم دیا کہ یہیں خیمے لگا دیئے جائیں اور لڑائی کی تیاری کی جائے۔

سلطان کے سپاہی کنارے پر موجود چند کشتیوں کے بارے میں حکم کے منتظر تھے۔ سلطان جلال الدین نے حکم دیا کہ انہیں آگ لگا دی جائے تا کہ کسی سپاہی

میری پہچان پاکستان

گزرتے لمحوں میں
وفاؤں کا پاس رکھیں گے
مرتے ہوئے بھی
تیری ہی پیاس رکھیں گے
تیرے کوچوں پہ نچھاور کر دینی ہے
اپنی جوانی کی راتیں
اپنی امنگوں کی چاہتیں
سب جذبوں کی ساعتیں
تیرا وجود ہی میرا وجود ہے
تیرا قیام ہی میرا قیام ہے
تُو ہے تو میرا نام ہے
تنہا دوپہر میں گلستان ہے
تُو میرا پاکستان ہے
میری ذات کی پہچان ہے
تُو میرا پاکستان ہے

کے دل میں فرار کا خیال بھی نہ آئے۔ وہ یہ یقین کر لیں کہ سلطان یا ان کا کوئی عزیز بھی میدان جنگ سے بھاگنے کا تصور نہیں کرے گا۔

یہ عاشق کون سی بستی کے

یارب رہنے والے ہیں:

ساحل نیلاب کے معرکے میں مسلمانوں کی تعداد 30 ہزار کے لگ بھگ تھی۔ جب کہ چنگیز خان کی ٹڈی دل فوج محتاط اندازے کے مطابق 4 لاکھ سے کم نہ تھی۔ سلطان جلال الدین نے چنگیز خان کی فوج کے پہنچنے سے پہلے پہلے یہ علاقہ اچھی طرح کھنگال ڈالا اور خوب سوچ سمجھ کر لڑائی کا نقشہ مرتب کر لیا تا کہ وہ اپنی مختصر سی فوج کے ساتھ اس کی کئی گنا بڑی طاقت سے بھرپور مقابلہ کر سکیں۔

اس پچیس تیس کلومیٹر طویل اور چودہ پندرہ کلومیٹر عریض میدان میں سلطان جلال الدین کے ایک جانب دریائے سندھ کا وسیع موڑ تھا اور دوسری جانب بلند چٹیل پہاڑی سلسلہ۔ سلطان جلال الدین نے طے کیا کہ وہ فوج کے دائیں بازو کو دریا کے موڑ کے ساتھ رکھیں گے۔ بائیں بازو کی صفیں پہاڑی سلسلے کے سائے میں مرتب کریں گے اور درمیان میں قلب لشکر کے جانبازوں کے ساتھ وہ خود ڈٹے رہیں گے۔ یہ ایسی مستحکم صف بندی کا نقشہ تھا کہ چنگیز خان کئی گنا بڑی طاقت کے باوجود اسے آسانی سے درہم برہم نہیں کر سکتا تھا۔

آج بھی اس میدان کے محل وقوع کو دیکھ کر سلطان جلال الدین کی ذہانت کی داد دینا پڑتی ہے اور اہل بصیرت یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ سلطان جلال الدین نے اپنی جنگی پالیسی میں ماحول کے ہر گوشے اور اونچ نیچ کو مد نظر رکھ کر دشمن کے دانت کھٹے کرنے کا مثالی منصوبہ ترتیب دیا تھا۔

رات کے وقت چنگیزی فوج مشرق سے یلغار کرتی ہوئی میدان جنگ میں آ پہنچی اور تین اطراف میں اس طرح پھیل گئی کہ سلطان جلال الدین اور ان کے ساتھیوں کے لیے کوئی راہ فرار نہ رہے۔ چنگیز خان کو معلوم تھا کہ دریائے سندھ کا گہرا اور ہلاکت خیز پانی اسلامی لشکر کے عقب میں اس طرح حائل ہے کہ اسے عبور کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر اپنے راستے کے اس آخری مزاحمتی پتھر کو چکنا چور کر دینا چاہتا تھا۔

جان توڑ لڑائی:

صبح دم یہاں دونوں فوجوں میں گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ تاتاریوں کے سیلاب بے کراں کے سامنے مجاہدین کمر کس کر میدان میں کود پڑے تھے۔ دو دن تک اس خونریز لڑائی کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

تاتاری اپنی کثرت کے باوجود مسلمانوں کی صفوں میں دراڑ نہ ڈال سکے۔ وہ مسلمانوں کے دائیں بازو پر حملہ آور ہوتے تو دریا کا موڑ انہیں اپنی پوری طاقت جھونکنے سے روک دیتا۔ مسلمان دائیں بازو کے سالار امین الملک کی قیادت میں مسلمان نہ صرف اپنا کامیاب دفاع کرتے رہے بلکہ انہوں نے بارہا پیش قدمی کر کے تاتاریوں کے دستوں کو تتر بتر کر دیا۔ بائیں بازو پر بھی تاتاریوں کے حملے کاری ثابت نہ ہوئے۔ یہاں سنگلاخ پہاڑ کی پشت انہیں بھرپور انداز میں آگے بڑھنے سے روکتی رہی۔ پہاڑی کی بلندی پر متعین خوارزمی تیر انداز دور ہی سے انہیں تیروں کی باڑھ پر رکھ لیتے تھے۔

چنگیز خان سے ٹکر:

اصل معرکہ قلب لشکر میں سلطان جلال الدین اور چنگیز خان کے درمیان تھا۔ 8 شوال 618ھ (24 نومبر 1221ء) کو معرکے کی شدت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ علامہ ابن الاثیر الجزریؒ اس کی ہولناکی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

”اس بات کا سب نے اعتراف کیا ہے کہ گزشتہ جنگیں اس لڑائی کی شدت کے سامنے محض کھیل تماشا تھیں۔“ اس دن سلطان جلال الدین نے اپنے قلب کے طوفانی دستوں کو لے جا کر بذات خود چنگیز خان پر حملہ کیا تا کہ اس دشمن اسلام کا سر قلم کر کے اس عالمی فتنے کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا جائے۔

دشمن کی صفوں کو چیرتے پھاڑتے وہ چنگیز خان کے بالکل قریب جا پہنچے۔ ان کے ایک جانباز نے چنگیز خان کے گھوڑے کو مار گرایا۔ چنگیز خان گھوڑے سے گرتے ہی اپنے محافظوں کے حصار میں بھاگ نکلا اور ایک محفوظ جگہ پہ جا کر دم لیا۔ کچھ دیر میدان جنگ کا جائزہ لینے کے بعد اس نے ایک حیرت انگیز چال چلی۔ اپنے سالار بلانویان کو چیدہ چیدہ سپاہی دے کر اسے حکم دیا کہ وہ عقب سے حملہ کر کے سلطان جلال الدین کے بائیں بازو کو تہس نہس کر دے۔

لشکر اسلام کی پشت پر حملہ:

بائیں بازو نے جس پہاڑ پر مورچے بنا رکھے تھے، اسے عقب کی جانب سے عبور کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ مگر بلانویان نے ایک لمبا چکر کاٹ کر سہ پہر کے وقت پہاڑ کو اس جانب سے عبور کر لیا اور پھر اسلامی لشکر کے بائیں بازو پر یکا یک ٹوٹ پڑا۔ بائیں بازو کے سپاہی تعداد میں بہت کم تھے۔ وہ جان توڑ لڑائی لڑے مگر کب تک، ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے۔ بائیں بازو کو راہ سے ہٹانے کے بعد چنگیز خان کو اسلامی لشکر کے باقی حصوں پر مختلف اطراف سے آزادانہ حملے کرنے کا موقع مل گیا۔

اس نے اپنی بڑی طاقت دائیں بازو کے مقابلے پر لگا دی اور اسے گھیر کر جلد ہی منتشر کر دیا۔ اب قلب لشکر میں سلطان جلال الدین جانبازوں کی چند صفوں کے ساتھ باقی رہ گئے تھے۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ کر کے وہ تیزی سے دریا کی طرف لپکے۔ انہیں معلوم تھا کہ فنا و بقا کا آخری معرکہ اسی جگہ لڑا جا سکتا ہے۔ چنگیز خان کے اشارے پر تاتاری سپاہی تمام اطراف سے سمٹ کر سلطان کا راستہ روکنے کے لیے آگے بڑھے۔

سلطان نے کئی مقامات پر رک کر ان کا مقابلہ کیا اور انہیں پیچھے دھکیل کر آگے بڑھتے گئے۔ ان کا رخ دریا کے ساتھ ساتھ اپنی خیمہ گاہ کی طرف تھا۔ جہاں ”سنگئی ندی“ دریائے سندھ سے آ ملتی ہے۔ یہاں ندی اور دریا کے سنگم پر وہ تین اطراف سے محفوظ ہو کر زیادہ دیر تک دشمن سے دو دو ہاتھ کر سکتے تھے۔ آخر کار سلطان میدان جنگ سے پیچھے ہٹتے ہٹتے سنگئی ندی کے پاس پہنچ گئے۔

آخری مرحلہ:

دریائے سندھ کے کنارے یہ وسیع و عریض میدان جنگ خالی ہو چکا تھا۔ اب جنگ کا آخری مرحلہ اس کے ایک گوشے میں پوری شدت سے لڑا جا رہا تھا۔ میدان جنگ کے جس حصے میں میں کھڑا تصور کی نگاہ سے تاریخ کی اس رزم گاہ کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس آخری مرحلے کی حقیقت کشائی سے قاصر تھا۔ آخری مرحلے کا ماحول اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے وہاں جانا ضروری تھا اور یہ بات ہمیں معلوم تھی کہ وہ جگہ یہاں سے کم از کم بارہ کلومیٹر دور ہے۔

دو صورتیں ہو سکتی تھیں، ایک تو یہ کہ ہم اس کنارے پر رہتے ہوئے اس مقام تک پہنچیں، اس صورت میں آخری جھڑپ کا میدان تو کیمرے کی آنکھ میں سما سکتا تھا۔ مگر ان چٹانوں کی بلندی جن سے سلطان جلال الدین نے دریا میں جست لگائی تھی محفوظ کرنا ممکن نہ

تھا۔ اس کے لیے دریا کے پار جانا ضروری تھا۔

گھوڑا ترپ، گھوڑا ترپ!

یہاں اس مقام کو لوگ گھوڑا ٹپ سے زیادہ گھوڑا مار یا گھوڑا ترپ کے نام سے جانتے ہیں۔ ترپ ہندکو زبان میں "چھلانگ" کو کہتے ہیں تو گھوڑا ترپ کا معنی ہوا۔ "گھوڑے کی چھلانگ لگانے کی جگہ" مگر اس سے پہلے کہ ہم اپنی کار کا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھتے وہ ہو گیا جس کی توقع نہ تھی۔ بابر نے اس نوجوان سے پشتو میں کچھ پوچھا۔

اس نے جواباً ایک طرف اشارہ کر دیا۔ بابر کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آئے۔ پھر انہوں نے یکا یک آواز لگائی۔

چلیے! گھوڑا ترپ کی طرف۔ ہم آدھے گھنٹے میں وہاں تک پہنچ جائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ اپنی لاٹھی سنبھالتے ہوئے اس نوجوان کے ساتھ تیزی سے ایک طرف چل دیئے۔ ہم ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ قبرستان کے پیچھے گندم کے کھیتوں سے ہم نیچے ڈھلوان پر اتر گئے۔ آگے کوئی صاف راستہ نہ تھا۔ بس پہاڑی راستے کی پگڈنڈیاں تھیں۔ جگہ جگہ سطح مرتفع قسم کے قطعات پر کھیتوں کے سلسلے تھے۔ ان راہوں پر ہمارا رہبر نوجوان اور ہم آگے پیچھے لپکتے جا رہے تھے۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد ایک بار پھر پہاڑی ڈھلوان ہمارے سامنے آ گئی۔ اس سے نیچے اترتے ہوئے گھنے درختوں اور جھاڑیوں سے گزر کر اچانک ہمیں دریائے سندھ نظر آ گیا۔ پہاڑیوں کے بیچوں بیچ مشرق سے جنوب کی طرف مڑتے ہوئے یہ عظیم دریا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔ پہلی نظر میں یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے پانی کی ایک تکون پہاڑیوں کے دامن میں متلاطم ہے۔ ڈھلتے سورج کی مدھم روشنی میں دریا کی لہریں سونے کے تاروں سے بنا ہوا قالین معلوم ہو رہی تھیں۔

دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے:

دریا کے پار پہاڑوں کے درمیان ایک بلند و بالا چمنی دھواں اگلتی دکھائی دے رہی تھی۔ رہنما نے بتایا کہ یہ ایک سیمنٹ فیکٹری کی چمنی ہے جو دریا پار کے گاؤں سکئی میں واقع ہے۔ ہمارا رہنما اس بلندی سے ہمیں بائیں جانب ڈھلوان پر لے چلا۔ دریا کا نظارہ ایک بار پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر ہمیں اندازہ تھا کہ ہم جنوب کی سمت دریا کے موڑ کی طرف جا رہے ہیں۔

نماز عصر کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ پہاڑی ڈھلوان کچھ آگے جا کر ایک ہموار جگہ پر ختم ہو گئی۔ یہاں بڑے بڑے گول اور چکنے پتھروں کی ایک سطح نے ہمارا استقبال کیا۔ ان پر قدم جما کر چلنا بڑا مشکل تھا۔ ہمارے لیے رہنما کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا دوبھر ہو گیا تھا۔ لگتا تھا سلطان کی روح ہماری اس حالت زار پر مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

انہی پتھروں پر چل کر اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

ہماری حالت پر رحم کھا کر آخر کار رہنما نے رفتار آہستہ کر دی۔ کچھ آگے جا کر پتھروں کا یہ سلسلہ ایک پہاڑی چٹان کی طرف بڑھنے لگا۔ تقریباً پانچ چھ منٹ کی چڑھائی کے بعد یہ بلند چٹان سر ہوئی۔

"یہی جگہ گھوڑا ترپ ہے" رہنما نے میری رعایت کرتے ہوئے پشتو نما اردو میں اعلان کیا۔ رہنما کے ساتھ سب سے پہلے اس چٹان تک میں پہنچا تھا۔ باقی ساتھی جو باوضو تھے نماز عصر ادا کرنے کے لیے پیچھے رک گئے تھے۔ چٹان پر ایک قدرتی گڑھے میں بارش کا پانی جمع تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس ٹھنڈے میٹھے پانی سے وضو کیا اور نماز عصر ادا کی اتنے میں اعجاز، احسان الٰہی، خلیل احمد اور بابر بھی آ پہنچے۔

موت کا دہانہ:

ہم کھلی آنکھوں سے اس یادگار مقام کا نظارہ کر رہے تھے۔ جس کے ذرے ذرے پر شہر خوارزم کی ناقابل فراموش جرات و بسالت کی داستان رقم ہے۔ جس چٹان پر ہم کھڑے تھے اس کے بالکل سامنے دریا کی دوسری جانب ایک ہولناک چٹان سینہ تانے کھڑی تھی۔ یہی وہ جگہ تھی جس سے سلطان جلال الدین نے دریائے سندھ میں جست لگا کر مومنانہ عزم و استقلال کا لازوال کارنامہ سر انجام دیا تھا۔ دریا بڑے طوفانی انداز میں بہہ رہا تھا۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر اس کا موڑ تھا۔ مشرق سے مغرب کی طرف بہتے دریا کے سامنے یہاں یکا یک ایک پہاڑی دیوار آ گئی تھی۔ جسے چیرنے میں ناکامی کے بعد دریائی دھارا تیزی سے جنوب کی طرف کروٹ بدل رہا تھا۔

دریا کا رخ بدلنے والی انہی چٹانوں کو سلطان نے اپنی یادگار جست کے لیے پسند کیا تھا۔ دریا بے پناہ تموج کے ساتھ ان سنگلاخ پہاڑی چٹانوں سے سر ٹکراتے ہوئے ایک تنگ درے میں داخل ہو رہا تھا اور پھر تقریباً آدھا کلومیٹر آگے جا کر بل کھاتا ہوا کوہستانی پیچ و خم میں غائب ہو رہا تھا۔ یہ مقام سچ مچ موت کا دہانہ تھا۔

دریا کی چوڑائی یہاں صرف ایک سو میٹر رہ گئی تھی۔ مگر اس کی گہرائی (اٹک کے ایک ماہر تاریخ کے مطابق) 180 فٹ تھی اور بہاؤ اتنا تیز کہ کشتی بھی جواب دے جائے۔ یہ چٹانیں جن سے سلطان جلال الدین نے دریا میں چھلانگ لگائی تھی اپنی انتہا پر کسی بھی طرح سو فٹ سے کم بلند نہ تھیں۔ اگرچہ اکثر تاریخی کتب میں اس چٹان کی بلندی 40 فٹ بتائی گئی ہے مگر آنکھوں دیکھی حقیقت یہ ہے کہ یہ جگہ اس سے کہیں زیادہ اونچی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں دریا کی سطح زیادہ بلند رہی ہو اور اب پانی کی سطح گرنے سے چٹان کا زیادہ حصہ باہر دکھائی دیتا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے سلطان نے اس چٹان کی چوٹی کی بجائے اس کی ڈھلوان پر دریا کے ساتھ ساتھ ذرا آگے جا کر پھر جست لگائی ہو۔

وہاں چٹان کی بلندی کم ہوتے ہوتے ساٹھ اور پھر تقریباً چالیس فٹ ہی رہ جاتی ہے۔ بہر صورت یہ مقام انتہائی خطرناک ہے جسے دیکھ کر ہی سر چکرانے لگتا ہے، اسے عبور کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ خوارزم کے مجاہد اعظم کا اتنی بلندی سے اس خطرناک پانی میں گھوڑے سمیت کود جانا اور چشم زدن میں دریا عبور کر لینا ایک ایسا حیرت انگیز انسانی کارنامہ ہے جس پر اس زمانے سے لے کر موجودہ ترقی یافتہ دور تک انسان انگشت بدنداں رہے ہیں۔

آتش و آب:

دائیں ہاتھ پر دریا کے پار دھواں اگلتی چمنی کے نیچے وہ میدان نظر آ رہا تھا جہاں حق و باطل کے اس تاریخ ساز معرکے کا آخری مرحلہ برپا ہوا تھا۔ اس دن یہاں آتش نمرود بھڑک رہی تھی۔ جنگ کی بھٹی گرم تھی اور موت کی چمنی ہلاکت خیز شعلے اگل رہی تھی۔ سلطان جلال الدین اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ یہاں دشمن سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ سلطان کو تین اطراف سے لاتعداد تاتاریوں نے گھیرا تھا۔ سلطان اپنی تلوار لہراتے ہوئے جب ان کے جتھے میں گھستے تو تاتاریوں کی صفیں درہم برہم ہو جاتیں اور وہ درجنوں لاشیں چھوڑ کر منتشر ہو جاتے مگر چنگیز خان کے پاس سپاہیوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ تازہ دم وحشیوں کو آگے بڑھاتا جو سلطان کو پھر گھیر لیتے۔ سورج ڈھلنے تک یہ معرکہ پوری شدت سے جاری رہا۔ اس دوران سلطان جلال الدین کا سات سالہ معصوم بیٹا تاتاریوں

کی گرفت میں آ گیا۔ اسے چنگیز خان کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اس درندے نے بلا تامل اس کی بوٹیاں نچوا دیں۔ سلطان کی والدہ اور بیویوں کو بھی اپنی گرفتاری یقینی دکھائی دے رہی تھی۔

مادر سلطان نے چلا کر کہا۔

"جلال! تجھے اللہ قسم دیتی ہوں ہمیں کافروں کے ہاتھوں گرفتاری کی رسوائی سے بچالے۔"

سلطان جلال الدین یہ درد ناک صدا سن کر اپنی والدہ کی طرف لپکے اور خدا معلوم کس دل و جگر سے انہیں اور اپنی بیویوں کو یکے بعد دیگرے دریائے سندھ کی موجوں کے حوالے کر دیا۔ ماں کے حکم کی تعمیل سے فارغ ہوتے ہی وہ پھر معرکہ کارزار میں آ کودے اور دشمنوں کو موت کا جام پلانے لگے۔

چنگیز خان نے اس مرد مجاہد کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر اپنے سپاہیوں کو سلطان کی زندہ گرفتاری کا حکم دیا۔ سلطان جلال الدین نے بھی صحرائے گوبی کے خونی بھیڑیئے کا ناپاک ارادہ بھانپ لیا۔ اس سے پہلے وہ ہار جیت کے خیال سے بے نیاز ہو کر صرف تاج شہادت پانے کے لیے اپنا خون بہا رہے تھے مگر اب چنگیز خان کی ناپاک خواہش کو پورا نہ ہونے دینا ان کے لیے ایک نیا چیلنج بن گیا تھا۔ انہوں نے اس چیلنج کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ وہ ایک تازہ دم گھوڑے پر سوار ہوئے۔ بھاری زرہ اتار پھینکی، ہلکا اسلحہ زیب تن کیا اور اس بلند کنارے سے دریائے سندھ کے بھیانک تموج میں کود پڑے۔

بقول شاعر

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

چنگیز خان اور اس کے سالار یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ سلطان جلال الدین کے معاصر عطاء ملک جوینی کا کہنا ہے:

چنگیز خان نے حیرت کی زیادتی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور اپنے بیٹوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"باپ کا بیٹا ہو تو ایسا ہو، یہ شخص آتش اور آب دونوں کی ہلاکتوں سے کیسے بچ نکلا؟ اگر یہ زندہ رہا تو ہمارے لیے آئندہ بھی بے شمار مشکلات کا باعث بنا رہے گا۔"

چنگیز خان کے بیٹوں نے سلطان کو پکڑنے کے لیے دریا میں کودنے کی اجازت مانگی تو اس جہاندیدہ کا جواب تھا۔

"تم اس پائے کے مرد نہیں ہو۔"

بلند آہنگ قہقہہ:

سلطان جلال الدین دریا کی لہروں سے لڑتے بھڑتے بخیر و عافیت دریا کے دوسرے کنارے پر جا پہنچے۔ اپنے گھوڑے سمیت اس چٹان پر آئے جو چنگیز خان کے مقابل واقع تھی۔ وہ اپنا شاہی چتر تان کر اس کے نیچے بیٹھ گئے۔ چنگیز خان کے چہرے پر چھائی ہوئی ناکامی کی خفت دیکھ کر انہوں نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ جس کے جواب میں چنگیز خان تلملانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اس لیے کہ اس کے اور سلطان کے بیچ میں موت کی خلیج حائل تھی۔ چٹانوں سے ٹکرانے والی لہروں کے شور میں مجھے آج بھی سلطان جلال الدین کے قہقہے کا آہنگ سنائی دے رہا تھا۔

ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ گرد و پیش سے آنے والی ہر آہٹ پر سلطان کے گھوڑے کی ٹاپ کا گمان ہو رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ وہی میدان جنگ، وہی دریا، وہی وادی، وہیں چٹانیں اور وہی سبزہ زار، پہاڑوں کی چوٹیاں اسی طرح سر بلند ہیں۔ سورج اسی دن کی طرح مغرب کی جانب جھک رہا ہے۔ سائے اسی طرح تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ زمین کی گود اسی طرح ہری بھری ہے۔ نیلا آسمان اسی انداز میں

یہاں سایہ فگن ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آٹھ سو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ اگرچہ کچھ بھی نہیں بدلا۔

مگر انسان بدل گئے ہیں۔ کل اس چٹان پر اس انسان کے پاؤں تھے جو خود ایک فولادی چٹان تھا۔ جس کا وزن پہاڑوں سے زیادہ تھا۔ جس کا سینہ دھرتی کی مانند کشادہ تھا اور آج یہاں وہ شخص کھڑا ہے جو خزاں رسیدہ پتے کی طرح حالات کی آندھیوں کے دوش پر اڑتا پھرتا ہے۔

چٹان سے کوئی تین سو گز دائیں طرف ایک ندی چٹانوں کے بیچوں بیچ راستہ بناتی ہوئی دریائے سندھ میں گر رہی تھی۔

یہ سگئی ندی ہے سگئی گاؤں سے گزرتی ہوئی ادھر آتی ہے۔

رہنما نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ کیا دریا کے پار بھی سڑک ہے؟ اس جگہ آنے کا کوئی راستہ ہے۔ اعجاز نے سوال کیا۔

"جی ہاں! خیر آباد سے نظام پور روڈ پر سفر کرتے ہوئے پہلے نظام پور بستی آتی ہے، اس کے بعد سگئی گاؤں ہے۔ سگئی گاؤں سے گھوڑا ترپ تک کچا راستہ ہے، پیدل آنے کے لیے۔"

اچھا! یہ تو بتایئے اس جگہ کو لوگ گھوڑا ترپ کیوں کہتے ہیں۔ میں نے اسے کریدا۔

صحیح بات تو ہمیں بھی معلوم نہیں ہے۔ بس ادھر ایک چٹان ہے۔ اس نے پشت کی طرف پھیلی ہوئی وادی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس چٹان پر کسی گھوڑے کے قدموں کے نشان تھے اب وہ نشان مٹ گئے ہیں۔ میں نے بھی بہت پہلے وہ نشان دیکھے تھے۔ شاید اس نشان کی وجہ سے لوگ اس جگہ کو گھوڑا ترپ کہتے ہیں۔

یہ کس کے گھوڑے کے نشان تھے۔ کچھ معلوم ہے؟ پتہ نہیں شاید کسی بادشاہ یا پیغمبر کا گھوڑا تھا۔ میں نے ایسے ہی سنا ہے۔ رہنما نے تذبذب کے عالم میں بتایا:

الوداع گھوڑا ترپ:

چاہنے کے باوجود ہم یہاں زیادہ دیر تک نہیں رک سکتے تھے۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے ہمیں واپس اپنی گاڑی میں پہنچنا تھا۔ شیر خوارزم کی یادگار کو الوداع کہتے ہوئے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ کچھ آگے چل کر رہنما نے ہمیں وہ چٹان دکھائی جس پر اس کے بقول کسی گھوڑے کے پاؤں کے نشان تھے۔

خلیل احمد اور میں نے رہنما کی اس روایت پر باہمی بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قریبی زمانے میں اس چٹان پر کسی نامعلوم شخص کے گھوڑے کے نعل ثبت ہو گئے ہوں گے۔ یا گھوڑا ترپ کی زیارت کے لیے آنے والے کسی ہنر مند سیاح نے سلطان کی یاد میں وہاں گھوڑے کے نعل کے نقوش کندہ کر دیئے ہوں گے۔ مقامی باشندوں نے پنجہ صاحب حسن ابدال کی کہانی کی طرح یہاں بھی بات کا بتنگڑ بنا کر اسے کسی بادشاہ یا پیغمبر کے گھوڑے کی طرف منسوب کر دیا ہو گا۔

بہر صورت یہ کسی طور پر بھی ممکن نظر نہیں آتا کہ یہ سلطان جلال الدین کے گھوڑے کے نقش پا ہوں۔ اس لیے کہ ایسی سخت چٹان پر گھوڑے کے نعلوں کا نشان ثبت ہو جانا اور پھر آٹھ صدیوں تک اس کا ایسی غیر محفوظ جگہ پر برقرار رہنا عقل سے بعید ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

انہی پر پیچ راستوں سے گزر کر جب ہم اپنی گاڑی تک پہنچے تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور اندھیرا تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم نے اپنے رہنما کا شکر ادا کیا اور

اس سے رخصت ہوئے۔ گاڑی تیزی سے کچے راستے پر روانہ ہوگئی۔

پکی سڑک تک پہنچتے پہنچتے ہر سو گھپ اندھیرے کا راج ہو چکا تھا۔ لٹیروں کے خوف سے ہم نے حفاظتی انتظامات بھی کر لیے تھے مگر خدا کا شکر ہے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

خلیل احمد خطرناک پہاڑی سڑک پر حد درجے سبک رفتاری اور مہارت سے گاڑی چلا رہے تھے۔ موقع ملتے ہی میں نے ان سے سوال کر ڈالا جو بڑی دیر سے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

خلیل! آپ نے پہلے تو یکدم واپسی کا اعلان کر کے ہمیں بالکل مایوس کر دیا اور پھر اچانک ہی آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا؟ اس کی وجہ اب تک سمجھ میں نہیں آئی۔

خلیل نے مسکراتے ہوئے کہا: میں نے شروع میں رہبر سے صرف فاصلہ پوچھا تھا۔ اس نے جو فاصلہ بتایا تھا وہ اگرچہ زیادہ نہ تھا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اس پہاڑی راستے میں ہم اسے ایک گھنٹے سے کم میں طے نہیں کر سکیں گے کیونکہ میرا خیال تھا گھوڑا ترپ اس گاؤں کے پاس نظر آنے والے پہاڑ کے پار ہے۔ ظاہر ہے چڑھائی چڑھنے اور اترنے میں خاصا وقت لگتا ہے مگر واپسی کا فیصلہ کرنے کے بعد میں نے اتفاقاً اس گھوڑا ترپ کی سمت پوچھ لی۔ اس نے جو سمت بتائی اس طرف سارا راستہ ڈھلوان تھا۔ درمیان میں کوئی پہاڑ بھی نہ تھا۔ میں پہاڑی راستوں کے درست اندازے لگانے کا ماہر ہوں۔ فوراً سمجھ گیا کہ ہم آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے فیصلہ فوراً تبدیل کر لیا۔

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے خلیل احمد کی عین وقت پر صحیح رہنمائی کی ورنہ اس بار بھی ہم حسب سابق ناکامی سے دو چار ہوتے۔ گھوڑا ترپ اب بہت پیچھے رہ چکا تھا۔ ہم اٹک پنڈی گھیپ شاہراہ پر اٹک کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔

جولائی 2009ء میں اس مقام پر دوبارہ آنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ اس علاقے میں دریا کے ساتھ دو جگہیں گھوڑا ترپ کے نام سے مشہور ہیں۔ جس جگہ ہم گئے تھے۔ وہ سرجھنڈا گاؤں سے پہلے آتی ہے اور یہ بھی اس گاؤں سے قریب تر۔ اس میں پیدل راستہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ کلومیٹر ہوگا۔ مقامی بزرگ اس کو سلطان جلال الدین اور چنگیز خان کے حوالے سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری جگہ سرجھنڈا گاؤں سے آگے جا کر آتی ہے اور نسبتاً دور ہے۔ اس میں پیدل راستہ بھی زیادہ ہے۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ وہاں ایک چٹان پر گھوڑے کے نعل کے نشان کندہ ہیں۔ چٹان دریا سے ذرا ہٹ کے ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ادھر کا کوئی شہزادہ یا سپہ سالار جو دریا عبور کرنا چاہتا تھا۔ اپنا گھوڑا اس چٹان پر لے آیا۔ پھر جو جست لگائی تو سیدھا دریا کے پار جا پہنچا۔ لوگوں کی اس گفتگو سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ گزشتہ بار جو صاحب ہمیں گھوڑا ترپ دکھانے لے گئے تھے۔ ان کا واپسی پر ہمیں ایک چٹان دکھانا اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہاں پہلے گھوڑے کے نعل کا نشان تھا جو کہ اب مٹ گیا ہے۔ سراسر مغالطہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گھوڑے کے نعل والی چٹان اس طرف ہے ہی نہیں۔ وہ دریا کے بہاؤ پر کوئی ایک میل آگے جا کر کہیں ہوگی اور اس پر گھوڑے کے نعل کے نشان اب بھی موجود ہیں۔ دوسرے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اس نعل والی چٹان کا سلطان جلال الدین کے واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے اصل گھوڑا ترپ وہی ہے جو سرجھنڈا سے پہلے اور قریب تر ہے۔

☆☆☆

زندگی ڈھونڈوں کہاں

ثنا ناز

عظمتیں سب تیری خدائی کی
حیثیت کیا میری اکائی کی

"امی خدا کے لیے مجھے مجبور مت کریں میں نے ساری زندگی آپ کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا۔ سکول، کالج اور یونیورسٹی سے لے کر سبجیکٹ تک آپ کی مرضی سے منتخب کیے ہیں۔ مگر اب نہیں پلیز امی اس معاملے میں میں پوری طرح بے بس ہوں۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا بہت کوشش کی کہ آپ کو ناامید نہ کروں مگر یہ میری زندگی ہے زیادہ نہیں تو تھوڑا سا اپنی مرضی کرنے کا اختیار مجھے بخش دیں۔ بس پہلی اور آخری بار......" وہ کچے صحن کے آنگن میں سر جھکائے بیٹھی اپنا اکلوتا مطالبہ منوانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔

بسمہ بیگم پریشانی کے عالم میں ہنوز ساکن بیٹھی تھیں...... ان کی روشن پیشانی پر تفکر کے اثرات واضح تھے۔ بیٹی کا مطالبہ سن کر ان کے رہے سہے حواس بھی گم ہو رہے تھے۔ وہ چپ سادھے آنگن میں دانہ چگتی چڑیوں کی اچھل کود تکتی رہیں۔ بالکل بے خبر، بالکل انجان، جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

"بابا" بسمہ بیگم کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے خالد علی کو قائل کرنا چاہا۔

"جی بابا کی جان۔" وہ بھری ہوئی آواز میں بولے تھے۔

"آپ ہی سمجھائیے نا امی کو میری بات تو یہ غلط نہیں ہے۔" وہ ماں کے پاس سے اٹھ کر ان کے پاس آن بیٹھی۔

"بیٹا تم ہی مان لو اپنی ماں کی بات۔ تمہارا ہی تو بھلا چاہ رہے ہیں ہم۔" دو شفاف موتی ان کی بوڑھی آنکھوں سے ٹوٹ کر بکھرے تھے۔

"بابا مجھے ایسا بھلا نہیں چاہیے۔ جس کی قیمت آپ لوگوں کو چکانا پڑے۔ میں کوئی غلط مطالبہ نہیں کر

رہی۔ بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔"
آخر آپ مجھے میری زندگی کے اختیارات سونپ کیوں نہیں دیتے۔ اس کا لہجہ اپنے آپ تلخ ہوا تھا۔ وہ کئی دنوں سے ان کی منتیں کر رہی تھی۔ مگر کوئی بھی اس کی بات سننے کو راضی نہ تھا۔

"بیٹا ہم بہت مجبور ہیں۔" بیٹی کی ایسی حالت ان سے بھی دیکھی نہیں جاتی تھی۔

"غلط بابا آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ آپ مجبور نہیں ہیں، کوئی بھی انسان مجبور نہیں ہوتا۔ آپ چیٹر ہیں۔ چیٹنگ کر رہے ہیں میرے ساتھ...... یاد ہے نہ ہر سال میری برتھ ڈے والے دن آپ میری ایک وش ضرور پوری کرتے ہیں تو اس سال کیوں اگنور کر رہے ہیں۔ کیوں حقیقت کو تسلیم نہیں کر لیتے۔" آنسوؤں کا طوفان چھلکنے کو بے قرار ہوا تھا مگر وہ ضبط کے گھونٹ پی کر چٹان بنی بیٹھی رہی۔

"عدن بیٹی تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ ہماری بات مان لو...... جانتی ہو تم ہمارے جینے کی آخری امید ہو بیٹی ہماری جان بھلے لے لو پر ہم سے یہ امید مت چھینو۔" اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بسمہ بیگم سراپا احتجاج بنی تھیں۔

"امی......" وہ تڑپ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔ مجھے میری نگاہوں میں مت گرائیں امی۔ وہ بسمہ بیگم کے ہاتھ چومتے ہوئے نم لہجے میں بولی تھی۔

"ایک بار کر کے دیکھ لی نہ آپ کی مرضی۔ بیچ دیا نہ ڈیفنس والا گھر اور بابا آپ نے بھی اپنا پورا بزنس داؤ پر لگا دیا۔ آپ کی خوشی کی خاطر سہہ لی نہ میں نے اذیتیں، بدلے میں کیا ملا یہ 5 مرلے کا پلاٹ چند ٹوٹی پھوٹی سانسیں اور بس۔" وہ سانس لینے کی غرض سے چند پل رکی تھی۔ اگر آپ کو لگتا ہے یہ مکان مجھے نئی زندگی دے سکتا ہے تو ٹھیک ہے بیچ ڈالیں اسے بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پر آپ لوگ میری ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ آسائشوں کے محلات سے نکال کر مفلسی کی اس دلدل میں تو پھنسا ہی دیا ہے میں نے آپ کو مگر اس عمر میں آپ لوگوں کو گھر سے بے گھر کرنے کے عوض میں اگر مجھے کچھ سانسیں مزید مل بھی جاتی ہیں تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔

آپ کو در بدر کرنے کا احساس میرے اندر کو مار دے گا اور جانتے ہیں بابا اندر کی موت ظاہری موت سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مجھے فورس مت کریں جتنے دن کی مہلت دی ہے اس ذات نے اتنے دن تو ہنسی خوشی گزار لینے دیں۔ جذبات کے ہاتھوں پھسل کر وہ کیا کہہ رہی تھی وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

"نہ بیٹی نہ ایسا مت کہو میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے...... مجھے معاف کر دینا بیٹی میں بے بس ہوں...... تمہارے لیے کچھ نہیں کر پایا......" "آپ اب بھی نہیں سمجھے بات بے بسی کی نہیں ہے بابا۔ وہ ماتمی سا مسکرائی۔ بات تسلیم کرنے کی ہے۔ حقیقت کو ماننے کی ہے۔ اس ذات کے فیصلوں کے آگے سر خم کرنے کی ہے۔ بات سوال کرنے کی نہیں ہے۔ بات اس کی رضا میں راضی ہونے کی ہے۔ اس کے امتحان میں سرخرو ہونے کی ہے۔ اس کے شفاف چہرے پر سکون پھر سے ابھرا تھا۔

"آپ کو خود کو الزام دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ دنیا کے سب سے اچھے ماں باپ ہیں محبتیں نچھاور کرنے والے مجھے آپ کی بیٹی ہونے پر فخر ہے، آپ لوگوں نے جو کچھ میرے لیے کیا وہ ہر کوئی نہیں کرتا...... ون پرسنٹ ...... بابا اگر ون پرسنٹ بھی چانسز ہوتے نہ تو آپ کی خوشی کی خاطر میں میجر سرجری بھی کروا لیتی۔ مگر اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں نے منسٹری آف ڈیفنس میں اپلائے کیا ہے کل میرا انٹرویو ہے۔ دعا کیجیے گا سلیکشن بھی ہو جائے...... تاریخ میں زندہ رہنا ہے نہ۔ وہ مسکراہٹ دبا کر فخر سے بولی۔

"ساری زندگی تو کچھ نہیں کیا کوشش کروں گی ان

آخری لمحات میں آپ کے لیے کچھ کر پاؤں۔" وہ کسی گہری سوچ کے سمندر میں ڈوبی تھی۔

"ہمیں تم پر فخر ہے بیٹی جس ہمت اور حوصلے سے تم یہ سب فیس کر رہی ہو ویسا بھی ہر کوئی نہیں کر سکتا۔" خالد علی اسے سینے سے لگاتے ہوئے شفقت سے بولے تھے۔

کہیں دور سے عصر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ اور وہ اللہ کے حضور پیش ہونے کا سامان تیار کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آخر کسی بھی لمحے اس کا بلاوا آ سکتا تھا۔

"اپنے آپ کو آخرت سے جوڑے رکھنے کے لیے انسان کو ہمیشہ ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے...... یہ دنیا منزل نہیں ہے، اک عارضی راہ گزر ہے جس میں کچھ بھول بھلیاں ہیں اور ان بھول بھلیوں کے اختتام پر ایک نئی دنیا آباد ہے۔ وہی دائمی مقام ہے وہی اصل منزل ہے۔ اور ہمیں اس دنیا سے زیادہ اس دنیا کے سامان کی فکر کرنی چاہیے......" یہ بات عدن نے اچھی طرح ذہن نشین کر لی تھی جبھی وہ اس کٹھور مرحلے پر بھی ہر پریشانی سے آزاد تھی۔

☆☆☆

دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کڑی دھوپ میں بمشکل چلی آ رہی تھی۔ آج اسے ڈیفنس منسٹری جوائن کیے تیسرا دن تھا۔ اچانک اسے اپنے سارے حواس منجمد ہوتے محسوس ہوئے۔ سر میں درد کی ایک شدید ٹیس اٹھی تھی۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے اس نے ایک بار پھر سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر اب ہمت جواب دے چکی تھی۔

اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں کام کرنا چھوڑ رہی تھیں۔ اگلے ہی پل وہ ساری ہمتوں، سبھی احتجاجوں کو مات دیتے ہوئے زمین پر ڈھے سی گئی۔

"باجی کیا ہوا تم کو......؟" ساتھ موجود میڈیکل سٹور میں سے ایک لڑکا نکل کر اس کی جانب لپکا۔

"میرا سر......!" اس نے خالی خالی نظریں لڑکے پر جماتے ہوئے بولنے کی کوشش کی۔

"دماغ کی ہلچل گزرتے پل کے ساتھ مزید بڑھ رہی تھی۔ اس کے برعکس دل کے دھڑکنے کے رفتار لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔

"تم گھبراؤ نہیں باجی تمہارا بھائی زندہ ہے ابھی ہم ابھی ایمبولینس کو فون کیا ہے وہ تھوڑا دیر میں آتا ہو گا۔ تب تک تم ادھر آ کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

وہ سترہ سالہ کشمیری لڑکا اسے سہارا دے کر اپنی دکان میں لے آیا۔

☆☆☆

"کیا کیا مسز خالد کی جوان بیٹی مر گئی۔" ولیمے کی تقریب میں ایک خاتون کی آواز ابھری تھی۔

"ہاں باجی ابھی اعلان ہوا ہے۔" آسیہ نے اس خاتون کی بات پر تصدیق کی مہر لگائی تھی۔

"وہی مسز خالد ناں جو ابھی چند روز پہلے کالونی میں شفٹ ہوئی ہیں؟" مٹن کڑاہی سے انصاف کرتی ہوئی مسز قاسم یکدم چونکی تھیں۔

"ارے ایسے کیسے مر گئی ابھی کل تو دیکھا تھا اسے اچھی بھلی اپنے گھر داخل ہو رہی تھی۔" مس کلثوم پیچھے رہنے والوں میں سے بھلا کہاں تھیں۔

"باجی چار بجے جنازہ ہے چلو چل کر مرحومہ کا آخری دیدار ہی کر آئیں۔" آسیہ نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے سب کو متوجہ کیا۔

"آئے ہائے اتنی جلدی جنازہ رکھ دیا۔ کوئی مانے نہ مانے مگر میرا دل کہہ رہا ہے دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ چلو چل کر پتا لگاتے ہیں۔" بلقیس آپا جو سارے محلے میں جیو چینل کے نام سے مشہور تھی نے زردے کی

پلیٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پورے وثوق سے کہا۔

"نہ باجی آج میرے بیٹے کا ولیمہ ہے آج نہیں سوئم والے دن چلیں گے۔" مسز قاسم نے سب کو ایک نئے مشورے سے نوازا......

تیسرے دن محلے کی تمام عورتیں جھرمٹ بنائے مسز خالد کے سونے سوگوار آنگن میں جمع تھیں۔

"مسٹر اینڈ مسز خالد نظر نہیں آ رہے؟" آسیہ ادھر ادھر نگاہیں مٹکاتے ہوئے دست سوال ہوئی۔

"بس کیا بتاؤں باجی منحوس ماری خود تو دنیا سے چلی گئی پر ماں باپ کو کسی کا سامنا کرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ مسز خالد تو صدمے سے اس قدر نڈھال تھی کہ ان سے اٹھا تک نہیں جا رہا تھا۔ ابھی خالد بھائی انہیں ہسپتال لے کر گئے ہیں۔" کلثوم بیگم قیاس آرائی کے انداز میں بولی تھیں۔

"توبہ توبہ ایسی بدکار اولاد کا تو مر جانا ہی بہتر ہے......بہن ویسے اصل بات کیا تھی۔" بانو آپا کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہو سکتی ہے، ہو گا کوئی عشق و محبت کا چکر، سنا ہے گلی کے نکڑ پر جو میڈیکل سٹور ہے نہ اس کے لڑکے کے ساتھ ملتی تھی اکثر۔" گویا الزام لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جا رہی تھی۔

"ہائے بہن...... سچ کہو......" بلقیس آپا دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہکا بکا ہونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

"لو بھلا مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی خدا جھوٹ نہ بلوائے کل میں نے خود دونوں کو بانہوں میں بانہیں ڈال کر رنگ رلیاں مناتے دیکھا تھا۔ محلے بھر کی اکلوتی آنسہ خالہ نے ایک اور بریکنگ نیوز دی تھی۔"

"ہائے میں مر جاؤں۔ ایسی بے حیائی نہ کبھی پہلے سنی نہ دیکھی۔" بلقیس آپا اتنی اہم خبر مس کر دینے کے غم سے نڈھال ہوئی۔

"اچھا ہوا ایسی گندی مچھلی سے چھٹکارا ملا زندہ رہتی تو ہماری نیک صالح بچیوں کو بھی برباد کرتی۔ عشرت تیسری دفعہ طلاق لینے کے بعد کہیں آ بسی تھی مگر خوف خدا اب بھی اس کے دل میں کہیں نہ تھا۔

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے باجی ایسی اولاد کا تو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دینا چاہیے۔" آنسہ خالہ اپنی بزرگی کا لحاظ کیے بنا دوسروں کو بزرگ بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔

"میری عادت تو نہیں ادھر کی بات ادھر کرنے کی پر اب باتوں سے بات نکلی ہے تو کہے دیتی ہوں چند روز پہلے میں نے اپنی چھت سے مسز خالد کو بیٹی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے دیکھا تھا کہہ رہی تھیں۔

"بیٹی تجھے خدا کا واسطہ ہے ہماری بات مان لے تو ہمارے جینے کی آخری امید ہے بیٹی ہماری جان بھلے لے لے پر یہ امید مت چھین۔" مسز قاسم نے ایک نئی خبر دی تھی۔

"اللہ اللہ کیسی ظالم اولاد تھی۔ شکل سے تو ایسی معصوم فطرت اور باتوں سے ایسی نیک پروین دکھتی تھی کہ کیا بتاؤں۔ تف ہے ایسی اولاد پر جو ماں باپ کی عزت کھا گئی۔ جانے یہ آج کل کی لڑکیاں کیسے ایسی بے حیائی کر گزرتی ہیں۔ ہائے بہن سچ کہوں مجھے تو سن کر ہی اتنی شرم آتی ہے کہ جی چاہتا ہے ابھی زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔" وہ کہتے ہیں نہ قبولیت کا لمحہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے جب بولو ہمیشہ اچھا ہی بولو۔ ثریا خاتون کے لیے شاید یہی لمحہ قبولیت کا تھا۔ ان کی سرگوشی اس گھر کے در و دیوار کو پار کر کے ذرا بلند ہوئی اور ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوئی سیدھا آسمان تک جا پہنچی۔

اس قدر آتش فشانی باتیں سن کر زمین کے اندر کا غضب جوش میں آیا۔ ایک کے بعد ایک زور دار جھٹکا اور اگلے ہی پل قدرت کے عذاب کو دعوت دیتا پورا گھر زمین بوس ہو چکا تھا...... بے شک اللہ اپنے نیک بندوں کے کردار پر کوئی حرف نہیں آنے دیتا۔

☆☆☆

افسانہ

گردش دوراں

ممتاز احمد

اچھا اور برا وقت زندگی کا حصہ ہے
ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمت اور صبر سے
کام لیا جائے، کیونکہ جو لوگ حالات کا ڈٹ کر
مقابلہ کرتے ہیں کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

ایک کامیاب شخص کی سرگزشت جس نے ہار نہیں مانی تھی

سکول میں ہمارا چار لڑکوں کا گروپ تھا۔ ناصر، شہزاد، عرفان اور میں یعنی افتخار ہم چاروں کلاس روم میں اکٹھے بیٹھتے ہر جگہ اکٹھے جاتے اور اکٹھے ہی دیکھے جاتے۔ پڑھائی کے معاملے میں ہم چاروں ہی ایک جیسے تھے۔ نالائق بس گزارے لائق پاسنگ مارکس لے لیتے۔

ان دنوں ہفتہ وار سرکاری چھٹی جمعہ کو ہوا کرتی تھی اور اس زمانے میں سب سے بڑی تفریح سینما گھر تھے۔ سال بعد موسم بہار میں میلہ منڈی لگتی تھی جس میں رنگ رنگ پروگرام مثلاً موت کا کنواں، چڑیا گھر، سرکس، میجک شو اور مختلف سٹال جس میں اشیاء کی نمائش وغیرہ سال میں ایک دو بار تھیٹر بھی آ جاتا۔

اتوار کو سینما گھروں میں دن بارہ بجے سپیشل شو ہوا کرتا تھا اور یہ شو ہم چاروں دوستوں نے کبھی مس نہیں کیا تھا۔ اسی طرح میلہ منڈی پورے دس دن جاری رہتی تھی تو ہمارے یہ دس دن وہیں گزرتے۔

جب تھیٹر آتا تو اس میں بھی ہماری موجودگی لازمی اور ہر صورت ہوتی۔ اس کے علاوہ شہر میں وقتاً فوقتاً نیزہ بازی، وغیرہ بھی ہوتی رہتی۔ سٹیڈیم میں ہاکی، کرکٹ اور فٹ بال کے مقابلے بھی ہوتے رہتے ان سب میں ہماری شرکت لازم و ملزوم ہوتی تو ان تمام سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے ہمارا پڑھائی میں پیچھے رہ جانا اور نالائق ہونا یقینی امر تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ پڑھائی میں ہمارا بالکل بھی دل

نہیں لگتا تھا۔ پڑھائی بوجھ لگتی اور پڑھنے سے ہماری جان جاتی تھی۔ ہم چاروں دوستوں کا تعلق لوئر مڈل کلاس گھرانوں سے تھا جہاں خوشحالی تو ہرگز نہ تھی مگر غربت تھی بس گزارہ چل رہا تھا۔ گھر والوں کے ڈر سے سکول جاتے اور روزانہ مختلف حیلوں بہانوں سے گھر والوں سے پیسے اینٹھتے۔

سکول جانا ہماری مجبوری تھی ورنہ ایک پل بھی وہاں ہمارا دل نہیں لگتا تھا۔ گھر والے ہمیں اس لیے پڑھا رہے تھے اور ہمارے اخراجات برداشت کر رہے تھے کہ ہم چار جماعتیں پڑھ کر کہیں نوکری پر لگ جائیں۔

ہمارے ساتھ ایک دیہاتی لڑکا بھی پڑھتا تھا نام تو اس کا اعجاز تھا مگر ہم نے اس کا نام بگاڑ کر جاجو چوہا رکھا ہوا تھا۔ اس کا گہرا سانولا رنگ تھا شکل و صورت واجبی سی تھی مگر وہ بہت محنتی اور ذہین لڑکا تھا۔ جب کہ اس کے مقابلے میں ہم چاروں دوست خوبصورت تھے اور ہمارے رنگ بھی گورے تھے۔ ہم ہر وقت اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

جاجو چوہا اوئے کہتے آوازیں کستے اور بلیک بورڈ پر چوہے کی تصویر بنا دیتے۔ اکثر کاغذ کا چوہا بنا کر اس کی طرف پھینک دیتے۔ مگر اس نے نہ تو کبھی ہماری کسی بات کا جواب دیا اور نہ ہی ٹیچر سے کبھی ہماری شکایت کی وہ ہماری ہر بات، ہر مذاق برداشت کر جاتا۔

اعجاز کی رہائش ایک قریبی گاؤں میں تھی اور نہایت غریب گھرانے سے اس کا تعلق تھا۔ اس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا وہ بہت محنتی اور لائق تھا۔ وہ ہر امتحان میں اول آتا۔ اس کو ہم کتابی کیڑا بھی کہتے تھے۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا اور گرتے پڑتے ہم دسویں جماعت میں پہنچ گئے۔ اعجاز کے والد مستری (راج گیر) بلڈنگیں بنانے کا کام کرتے تھے۔ اعجاز اپنے والدین کا ایک ہی بیٹا تھا اس کی چار بہنیں تھیں جو اس سے چھوٹی تھیں۔ سب سے بڑا وہی تھا۔

ایک دن اعجاز کے والد ایک بلڈنگ کی تعمیر کے سلسلہ میں اینٹوں کی چنائی کر رہے تھے تو بہت اونچائی سے نیچے گرے اور فوت ہو گئے۔ ہم سب ان کے جنازے میں گئے اور اعجاز سے تعزیت کی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد اعجاز نے سکول آنا چھوڑ دیا۔ چند دن تو ہم نے اس کی غیر حاضری کو محسوس کیا مگر جلد ہی بھول گئے اور اپنی اپنی زندگی میں مگن ہو گئے۔ پلٹ کر اس کی خبر بھی نہ لی۔

اب یہ اتفاق تھا کہ ہم چاروں دوستوں نے میٹرک کر لیا اور ایک سرکاری کالج میں داخلہ لے لیا۔ سکول کی نسبت کالج میں آزادی تھی۔ اب ہم کالجیٹ تھے اب یہاں آوارہ گردی اور سینما بینی کا زیادہ موقع مل جاتا۔ کالج میں خوب ہلہ گلہ کرتے خوب شرارتیں کرتے اور یہاں ہم چاروں نے سگریٹ پینا بھی شروع کر دیے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انٹر کا سالانہ بورڈ کا امتحان سر پر آ گیا تو ہمیں فکر لاحق ہوئی کیونکہ ہماری تیاری تو تھی نہیں اب اگر فیل ہو جاتے تو گھر والوں سے مار بھی پڑتی اور بے عزتی الگ ہوتی اس لیے ہم بہت فکر مند تھے۔

ناصر جو کہ ہمارا گروپ لیڈر بھی تھا اور بہت تیز طرار بھی تھا تو اس نے امتحانی سنٹر کے امتحانی عملہ سے ساز باز کی اور ہم چاروں نے مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے اپنے گھروں سے پیسے لیے اور امتحانی عملہ کو دیے جس کے بدلے میں ہمیں ہر پیپر کے لیے نقل کے لیے مواد مہیا کیا جاتا رہا اس طرح ہم نے نقل لگا کر امتحان دیا اور حیرت انگیز طور پر پاس ہو گئے۔ ہم چاروں کے مارکس برابر تھے کیونکہ ایک ہی مواد سے نقل لگائی تھی۔

اب ہم نے اپنے اپنے گھر والوں کے کہنے پر بی اے میں داخلہ تو لے لیا مگر اپنی اصلیت سے ہم خوب واقف تھے اور ہمیں پورا یقین تھا کہ نقل کے بغیر ہم بی اے کا ایک بھی پیپر پاس نہیں کر سکتے۔ کالج میں پیریڈ تو ہم سارے ہی اٹینڈ کرتے مگر لیکچر پر توجہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ پلے نہ پڑتا تھا۔ زیادہ وقت کالج کی کینٹین میں گزرتا۔ ہم لائبریری بھی جاتے مگر صرف اخبار پڑھنے کے لیے اور اخبار میں فلمی اشتہارات دیکھتے کہ کون کون سی فلم ریلیز ہو رہی ہے اور کس سینما میں کون کون سی فلم لگی ہے۔

ایک دن ناصر کی نظر اخبار میں شائع شدہ ایک اشتہار پر پڑی وہ اشتہار کسی پرائیویٹ ادارے کی طرف سے تھا جس کے مطابق انہیں اپنے پراجیکٹ کی تکمیل کے لیے پڑھے لکھے نوجوان اور کچھ ٹیکنیکل امور میں مہارت رکھنے والوں کی ضرورت تھی۔ ادارے کو میٹرک سے ایم اے تک پاس ڈگری ہولڈروں کی ضرورت تھی۔ تو ناصر نے کہا کہ بی اے کرنے کے بعد بھی تو نوکری کرنی ہے تو بی اے کرنا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ ہم قیامت تک بی اے نہیں کر سکتے تو کیوں نہ ہم یہاں اپلائی کر دیں اور قسمت آزمائی کریں۔ اگر ہمیں یہاں جاب مل جاتی ہے تو ہمارے گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

دوسرا سب سے اہم بات کہ ہماری پڑھائی کے جھنجٹ سے جان چھوٹ جائے گی چنانچہ اگلے روز ہم چاروں نے اپنی اپنی درخواستیں تصاویر، ڈومیسائل اور میٹرک ایف اے کی اسناد کی فوٹو کاپیاں منسلک کر کے ادارے کے دیے گئے ایڈریس پر ارسال کر دیں۔ کوئی ایک ماہ کے بعد ہمیں انٹرویو کالز موصول ہو گئیں۔

چنانچہ مقررہ تاریخ کو ہم انٹرویو دینے لاہور پہنچ گئے اور حیرت انگیز طور پر ہم چاروں کی سلیکشن بھی ہو گئی۔ چند دنوں کے بعد ہمیں تقرری کے اپائنمنٹ لیٹر موصول ہو گئے اور ڈیوٹی جائن کرنے کے لیے لاہور آفس میں رپورٹ کرنے کا کہا گیا۔ ہم چاروں نے اپنے اپنے گھر والوں کو لیٹرز دکھائے اور بتایا کہ بہت شاندار نوکری ہے۔ بہترین تنخواہ ہے۔ بہت ساری مراعات بھی ہیں اور سب سے بڑی بات رہائش بھی ادارہ دے گا۔ جس پر ہمارے گھر والوں نے ہمیں بخوشی نوکری کی اجازت دے دی جس کے بعد ہم نے کالج کو خیر آباد کہا اور اگلے ہی دن اپنے ساز و سامان کے ساتھ لاہور پہنچ گئے اور ڈیوٹی جوائن کر لی۔

ادارے نے ہمیں آفس کی بالائی منزل پر بنے کمروں میں رہائش دے دی۔ مزے کی بات تین ٹائم کا کھانا ادارے کی کینٹین سے بہت سستے داموں مل جاتا تھا تو اس طرح رہائش اور کھانے کا مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو گیا۔ ہماری ڈیوٹی ایک ہی سیکشن میں لگ گئی۔ دفتری لکھنے پڑھنے کا کام تھا جو کہ زیادہ مشکل نہیں تھا بہت آسان کام تھا۔

اب تو ہماری ہر لحاظ سے موجیں تھیں کوئی روک ٹوک نہ فکر فاقہ۔ تنخواہ کی مد میں معقول پیسے مل جاتے کچھ اوور ٹائم بھی مل جاتا تھا۔ لاہور بڑا شہر تھا یہاں خوب آوارہ گردی کرتے۔ سینما میں آخری شو دیکھتے رات کا، مہینے بعد گھر جاتے اور گھر والوں کو پیسے دیتے تو اس طرح گھر والے بھی خوش اور مطمئن تھے۔ سال بعد ہماری تنخواہ بھی بڑھا دی جاتی اور ادارہ ہمیں سالانہ بونس بھی دیتا تو اسی طرح پانچ سال کا عرصہ گزر گیا۔ ہم مستقبل کی فکروں سے آزاد اپنی دھن میں بے فکری کی زندگی گزار رہے تھے۔ مجال ہے جو کسی کتاب کو ہاتھ لگایا ہو۔

بس دفتر کا کام کھانا پینا، گھومنا پھرنا، سیر سپاٹا اور روزانہ رات آخری شو دیکھنا فلم کا اور سونا۔ یہ تھے ہمارے مشاغل جن میں ہم مگن تھے۔

ہر ماہ گھر والوں کو معقول پیسے دے رہے تھے تو ہمارے گھر والوں کو ہماری شادیوں کی فکر ہوئی اور ایک سال کے اندر ہم چاروں کی یکے بعد دیگرے شادیاں ہو گئیں۔ اب جس طرح کی ہماری رہائش تھی تو وہاں ہم اپنی اپنی بیویاں نہیں رکھ سکتے تھے تو وہ ہمارے والدین کے پاس آبائی گھروں میں رہتیں پہلے ہم مہینے بعد گھر جاتے تھے اب ہر ہفتے بعد جمعرات کی شام گھر پہنچ جاتے اور جمعہ کی چھٹی گزار کر ہفتہ کو لاہور ڈیوٹی پر پہنچ جاتے۔

اسی روٹین میں چار سال کا عرصہ بیت گیا۔ اسی دوران کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ میرے والدین وفات پا گئے۔ سب بہن بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں اللہ پاک نے اولاد کی نعمت سے بھی نوازا پھر ایک المیہ یہ ہوا کہ گھر میں دیورانیوں اور جیٹھانیوں کی آپس میں چپقلش اور آئے روز لڑائیاں ہونے لگیں اور بعض اوقات یہ لڑائیاں شدت بھی

اختیار کر جاتیں جس کی وجہ سے آپس میں بول چال بھی کئی کئی دن بند رہتی۔ صلح صفائی بھی کروائی جاتی مگر چند دنوں کے بعد پھر وہی حال چنانچہ روز کی بک بک اور چخ چخ کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ والدین کا یہ آبائی گھر فروخت کر دیا جائے اور جس کا جو حصہ بنتا ہے اسے دیا جائے اور سب الگ الگ اپنی مرضی کی زندگی جییں۔

اس فیصلے پر بہت جلد عملدرآمد بھی ہو گیا سب بہن بھائیوں میں حصہ تقسیم کر دیا گیا اس طرح میرے حصے میں ایک لاکھ روپیہ آیا۔ میں نے لاہور میں ہی ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا۔ پندرہ ہزار روپیہ ایڈوانس کرائے کے طور پر دیا۔ پانچ ہزار سکیورٹی کے نام پر مالک مکان نے لیا اس طرح تین ہزار ماہوار کرائے پر مکان مل گیا۔ سامان کی شفٹنگ اور کچھ چیزیں نئی لینے اور گھر سیٹ کرنے پر مزید پندرہ ہزار روپے خرچ ہو گئے۔ تو اس طرح بیوی بچوں کو لاہور لے آیا پچاس ہزار روپے بچ گئے۔

میری کل تنخواہ آٹھ ہزار روپے تھی۔ تین ہزار روپے مکان کا کرایہ، ایک ہزار بجلی گیس کا بل آ جاتا تو اس طرح چار ہزار بچ جاتے جن سے پورا مہینہ گزارتے بچے ابھی چھوٹے تھے۔ اس لیے سکول میں داخل نہیں کروائے تھے تو اس لیے فی الحال ان کی سکول فیسوں سے جان بچی ہوئی تھی۔ مہمانداری نہ ہونے کے برابر تھی۔ جب سے بیوی بچوں کو لاہور لے کر آیا تھا سینما بینی بہت کم ہو گئی تھی بس کبھی کبھار مہینے میں کوئی ایک آدھ فلم دیکھ لی اسی معمول میں مزید ایک سال بیت گیا۔

ایک دن آفس گیا تو دوپہر کے دو بجے نائب قاصد نے تمام ملازمین کو پیغام دیا کہ آفس کے انچارج آفیسر نے تمام ملازمین کو اڑھائی بجے کانفرنس روم میں بلایا ہے ایک اہم میٹنگ کے سلسلہ میں تو تمام ملازمین بروقت کانفرنس ہال میں جمع ہو جائیں چنانچہ ہم سب ملازمین پہنچ گئے، مینجنگ ڈائریکٹر صاحب ٹھیک اڑھائی بجے آئے اور تلاوت کلام پاک کے بعد انہوں نے مختصر سا خطاب کیا اور سب ملازمین کو خبر سنائی کہ ادارے کے جو پراجیکٹس چل رہے تھے وہ تمام پایہ تکمیل کو پہنچ گئے ہیں اور مکمل ہو چکے ہیں۔ کمپنی مزید کسی پروجیکٹ پر کام نہیں کرے گی تو آج سے یہ ادارہ ختم کیا جا رہا ہے۔

ہمارا اور آپ کا ساتھ یہیں تک تھا آپ سب نے ہمارے ساتھ مل کر خوش اسلوبی سے کام کیا آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب آپ کمپنی کے ملازم نہیں رہے ہیں۔ آپ سب کو اس ماہ اور اگلے ماہ کی اضافی تنخواہ دی جا رہی ہے۔ تو آپ سب آج شام تک آفس سے اپنا اپنا ذاتی سامان اٹھا کر آفس خالی کر دیں۔ کیونکہ کل یکم تاریخ ہے اور یہ بلڈنگ کرایہ پر حاصل کی گئی تھی تو آج رات تک ہم نے ہر صورت میں عمارت خالی کرنی ہے۔ کل سے نئے کرائے دار اس بلڈنگ میں آ جائیں گے۔ انہوں نے اکاؤنٹنٹ کو حکم دیا کہ سب کو تنخواہ والے لفافے ابھی دے دیئے جائیں۔

جب وہ جانے لگے تو کچھ لوگوں نے احتجاج کیا کہ یہ سراسر زیادتی ہے آپ ہمیں بغیر نوٹس کے بلاوجہ اچانک بے روزگار کر رہے ہیں تو اس پر مینجنگ ڈائریکٹر نے کہا کہ کوئی زیادتی نہیں کر رہے ہیں کیونکہ ہمارا اور آپ کا معاہدہ دس سال کا تھا آپ کو جو تقرری کے لیٹر جاری کیے گئے تھے اس میں پوری تفصیل درج تھی اور تمام پروجیکٹس کی تکمیل دس سال میں مکمل کرنا تھی اور پروجیکٹس مکمل ہونے تک آپ سب کی ملازمت کی بھی معیاد تھی۔ تمام شرائط اور معلومات کو تسلیم کرنے پر آپ سب کے دستخط اور نشان انگوٹھے موجود ہیں۔ لہٰذا آپ کے اور ہمارے معاہدے کا آج آخری دن تھا۔

یہ خبر ہم سب پر بجلی بن کر گری۔ پریشانی اور بوجھل دل کے ساتھ تنخواہ والا لفافہ جیب میں ڈالا اور گھر آ کر ڈھے گیا۔ مجھے پریشان دیکھ کر میری بیوی بھی گھبرا گئی اور پوچھا کہ خیر تو ہے ناں......؟ کیا ہوا......؟ جس پر میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

میں نے اپنے سامان سے ملازمت کا لیٹر نکال کر دیکھا

اس میں تمام قواعد و ضوابط اور شرائط درج تھیں اور ملازمت کی مدت دس سال تھی جو کہ آج پوری ہو چکی تھی۔ اس وقت ہم چاروں دوستوں نے پوری تفصیل پڑھے بغیر پڑھائی سے جان چھڑانے کی خوشی میں یہ پرائیویٹ نوکری تو کر لی تھی مگر مدت ملازمت اور دیگر شرائط پر غور نہیں کیا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ پوری رات اور اگلا سارا دن سخت پریشانی میں گزرا سوچوں نے گھیر لیا کہ اب کیا ہوگا۔

میری بیوی مجھے تسلیاں دیتی مگر تسلیوں سے کچھ نہیں ہونے والا تھا۔ اور رات گئے تک مختلف دفتروں اداروں میں نوکری کے لیے چکر لگاتا رہتا مگر ہر جگہ سے جواب ملتا اسی طرح ناصر، شہزاد اور عرفان بھی سارا سارا دن چکر لگاتے ہر جگہ خاک چھانتے مگر نوکری کا کہیں بھی بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔

انہی چکروں میں سارے پیسے ختم ہو گئے اور پھوٹی کوڑی تک نہ رہی۔ اب تو ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ فکروں نے گھیرا ڈال لیا کہ وقت کیسے گزرے گا۔ کھانا، پینا، مکان کا کرایہ اور دیگر اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ جب مشکل سر پر آن پڑی تو ہمیں اللہ یاد آیا اب ہم نے پنج وقت کی نماز شروع کر دی۔ میری بیوی تو شروع سے ہی نماز پڑھتی تھی۔ وہ دن رات میرے روزگار کی خشوع و خضوع سے دعائیں مانگتی۔

ایک دن شام کو ناصر، شہزاد اور عرفان میرے گھر آئے اور بتایا کہ ایک جگہ نوکری کا چانس ہے تو صبح آٹھ بجے فلاں جگہ پر پہنچ جانا چنانچہ میں اگلے دن تیار ہو کر مقررہ ٹائم پر وہاں پہنچ گیا۔ وہ ایک پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسی تھی اور سکیورٹی گارڈز بھرتی کرتے تھے۔ ہمارے کاغذات شناختی کارڈز وغیرہ چیک کیے گئے۔ ہماری جسمانی صحت بھی اچھی تھی ہم چاروں کے قد کاٹھ مضبوط تھے تو اللہ نے کرم فرمایا اور ہم چاروں کو سکیورٹی گارڈ بھرتی کر لیا گیا۔ پھر ہمیں ایک ماہ کی زبردستی ٹریننگ دی گئی۔ اسلحہ چلانا سکھایا گیا اور اس طرح دیگر امور اور فرائض اچھی طرح سے سمجھا دیئے گئے۔

پھر مختلف محکموں اور اداروں کی ڈیمانڈ کے مطابق انہیں سکیورٹی گارڈز فراہم کر دیئے گئے۔ میری ڈیوٹی گلبرگ میں واقع ایک بینک میں لگا دی گئی۔ سکیورٹی ایجنسی نے ہمیں ایک ایک گن اور گولیاں بھی فراہم کر دیں اور ہمیں چوکس رہ کر ڈیوٹی کرنے کی ہدایات دی گئیں۔

سکیورٹی ایجنسی سکیورٹی گارڈز کی سروسز کے بدلے میں متعلقہ اداروں سے کیا معاوضہ لیتی تھی اس کا ہمیں علم نہ تھا ہمیں ہر ماہ کی یکم تاریخ کو آٹھ آٹھ ہزار روپے تنخواہ ادا کر دی جاتی۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ فاقوں سے اور دربدر ہونے سے بچ گئے تھے۔ میرے تینوں دوستوں کی ڈیوٹیاں بھی مختلف جگہوں پر لگ گئیں۔ اب ہم پوری تندہی سے ڈیوٹی کرنے لگے۔

میری ڈیوٹی صبح آٹھ بجے سے شام چھ بجے تک تھی۔ میرے ساتھ ایک اور سکیورٹی گارڈ بھی تھا ہم بینک کے مین گیٹ پر کھڑے ہو جاتے اور ہر آنے والے کی تلاشی لیتے اور پھر اسے اندر جانے کی اجازت دیتے ہمیں ہر آنے والے کو سلام کرنے اور عزت و احترام سے پیش آنے کی ہدایات تھیں۔

اسی طرح ڈیوٹی کرتے تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن میں بینک کے گیٹ پر اپنی ڈیوٹی پر کھڑا تھا تو ایک نئے ماڈل کی بڑی اور چمچاتی کار آ کر رکی۔ باوردی ڈرائیور نے فوراً نیچے اتر کر بائیں جانب والا کار کا پچھلا دروازہ کھولا تو ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص جس نے انتہائی قیمتی سوٹ کے ساتھ مہنگی عینک اور گھڑی پہنی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا جب وہ شخص بینک میں داخل ہونے کے لیے گیٹ پر آیا تو میں نے اسے سلیوٹ کیا وہ چند لمحے بڑے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا مجھے بھی اس کا چہرہ شناسا لگ رہا تھا۔ اس کی شاندار پرسنلٹی کو دیکھتے ہوئے اس کی تلاشی لینے کی جرات نہ پڑی۔

بینک میں داخل ہونے کے بعد اس نے پھر مجھے مڑ کر دیکھا اور سیدھا بینک منیجر کے کیبن میں چلا گیا۔ بینک منیجر

نے بڑے ادب کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کون ہے۔ اس کا چہرہ تو شناسا سا لگ رہا تھا۔ مگر یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کون ہے کوئی دس منٹ گزرے تو نائب قاصد نے مجھے کہا کہ آپ کو منیجر صاحب اپنے کیبن میں بلا رہے ہیں۔ میں فوراً ان کے پاس گیا تو وہ سوٹڈ بوٹڈ شخص مجھے اٹھ کر ملا اور بڑی گرم جوشی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہنے لگا افتخار مجھے پہچانا......؟ تو میں نے نفی میں جواب دیا کہ نہیں سر تو اس پر وہ بولا یار میں اعجاز ہوں 9th کلاس تک آپ کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں۔ تو مجھے ایک دم یاد آگیا اور کہا جی ہاں یاد آگیا آپ اعجاز صاحب ہیں تو اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور ہنس کر کہنے لگا کہ ہاں میں وہی اعجاز ہوں جسے آپ لوگ جاجو چوہا کہہ کر بلایا کرتے تھے۔

مجھے بہت شرم آئی تو میں نے شرمندگی سے کہا نہیں سر ایسا تو نہ کہیں۔ پھر اعجاز نے بینک منیجر سے میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ ہم کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ پھر اس نے مختصراً ناصر، شہزاد اور عرفان کا پوچھا تو میں نے ان کا بھی بتایا۔ اعجاز نے مجھ سے گھر کا ایڈریس پوچھا تو میں نے اسے ایک کاغذ پر لکھ دیا۔

اعجاز نے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دیا اور کہنے لگا کہ کل رات کو تم چاروں دوستوں کا کھانا میرے ہاں ہے۔ آپ چاروں نے اپنی بیگمات اور بچوں کے ساتھ آنا ہے بلکہ ان تینوں سے کہنا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شام سات بجے تمہارے گھر آجائیں میرا ڈرائیور بڑی گاڑی پر آپ چاروں کو لینے آجائے گا۔ آج میں رات گئے تک بہت مصروف ہوں تو کل مل کر کھانا بھی کھائیں گے اور خوب باتیں بھی کریں گے۔ پھر اعجاز نے اجازت چاہی اور وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

میں اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔ شام کو گھر جا کر اپنی بیوی کو ساری بات بتائی پھر باری باری ناصر، شہزاد اور عرفان کے گھر گیا اور ان کو تاکید کی کہ آپ کل سات بجے تک ہر صورت میرے گھر آجائیں ایک بہت بڑا سرپرائز ہے۔ آپ سب کے لیے انہوں نے بہت پوچھا مگر میں نے ان کو تجسس میں رکھا۔ اگلے دن سات بجے تک وہ تینوں فیملو ہمارے گھر آگئیں وہ سخت حیران تھے کہ کیا ماجرا ہے کیا سسپنس اور سرپرائز ہے تو پھر میں نے ان کو اعجاز سے ملاقات کا بتایا کہ کل کس طرح اس سے ملاقات ہوئی اور آج رات کے کھانے کی دعوت اعجاز نے ہمیں دی ہے۔ یہ سن کر ان کا تجسس ختم ہوا اور سب خوش ہوئے۔

پھر ہم نے مشترکہ طور پر پھل، مٹھائی اور کیک وغیرہ لیے۔ ساڑھے سات بجے اعجاز کا ڈرائیور ایک ویگن لے کر آگیا اور اس طرح پونے گھنٹے کے بعد ڈیفنس میں اعجاز کی عالی شان کوٹھی میں پہنچ گئے۔

اعجاز اور اس کی بیوی نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ اعجاز ہم چاروں سے بڑی گرم جوشی سے ملا اور ہم ایک آراستہ بہت بڑے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ پہلے تو مشروبات سے ہماری تواضع کی گئی۔ پھر پرتکلف کھانا ڈائننگ ٹیبل پر لگ گیا۔ کھانے کے بعد باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خواتین اور بچے اندرونی وی لاؤنج میں چلے گئے جبکہ ہم پانچوں کوٹھی کے خوبصورت لان میں آکر بیٹھ گئے۔ ہم ابھی تک سخت حیران تھے کہ انتہائی غریب انسان پندرہ سالوں میں اتنا امیر کیسے ہو گیا یہ عالی شان کوٹھی شان و شوکت، تو اعجاز نے اپنی گزری زندگی کے حالات کچھ یوں بتائے جو اس کی زبانی یہ ہیں۔

والد صاحب کی ناگہانی موت کے بعد ہم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے وہ واحد ہمارے کفیل تھے انہی کی محنت مزدوری سے گھر کا نظام چل رہا تھا ان کی وفات کے بعد ہماری آمدنی کا ذریعہ بند ہو گیا۔ ان کے بعد گھر میں سب سے بڑا میں تھا تو تمام ذمے داریوں کا بوجھ میرے کندھوں پر آگیا۔

گاؤں میں ہمارا بڑا سا گھر تھا والد صاحب نے دو بھینسیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اب گھر کے حالات ایسے ہو گئے کہ میرا اسکول جانا ناممکن ہو گیا۔ گو کہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور میرے والد کا بھی یہ دیرینہ خواب تھا کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنوں۔ گھر کا نظام چلانے کے لیے میں نے سکول کو خیر آباد کہا اور محنت مزدوری کی تلاش شروع کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد گاؤں میں گندم کی کٹائی شروع ہو گئی مجھے گندم کاٹنے کی مزدوری مل گئی تو دو مہینے گندم کی کٹائی اور ویٹ تھریشر پر گندم گاہنے کا کام کرتا رہا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک تو سال بھر کے لیے گھر میں گندم آگئی دوسرا کچھ رقم بھی مل گئی۔

میں نے ایک اور کام کیا وہ یہ کہ شہر کے ایک دو گوالوں سے رابطہ کیا ان کو صبح و شام دودھ دیا گیا وہ دودھ فروخت کر دیتے باقی ضرورت کا دودھ گھر میں رکھ لیتے۔ کچھ مرغیاں پہلے بھی گھر میں تھیں تو اٹھارہ مرغیاں اور لے لیں اس طرح دو درجن دیسی انڈے بھی فروخت ہو جاتے اب میں بھینسوں کے لیے چارہ کاٹ کر لاتا ان کی دیکھ بھال کرتا۔ اس کے علاوہ جو ٹائم بچ جاتا پڑھائی کر لیتا۔

ہمارے گاؤں میں ایک ٹیچر رہتے تھے جن کو ماسٹر منظور کہا جاتا وہ ہمارے حالات اور میری تعلیمی پوزیشن سے خوب واقف تھے تو انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ اعجاز بیٹا پڑھائی ہرگز نہ چھوڑنا ان ہی کے کہنے پر میں شام کو ان کے گھر چلا جاتا وہ دو گھنٹے مجھے مفت پڑھاتے۔ انہوں نے ہی میرا میٹرک کا داخلہ بورڈ میں بھیجا تو اس طرح میٹرک کا امتحان دیا اور اللہ رب العزت نے اپنے فضل و کرم سے نوازا میں نے ہائی فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔

اس کے بعد ماسٹر منظور صاحب کے مشورے پر کامرس کالج میں داخلہ لے لیا۔ میں صبح سویرے بھینسوں کا چارہ کاٹ کر لاتا دودھ دھوتا اور ناشتے کے بعد کالج چلا جاتا۔ میری غیر موجودگی میں والدہ صاحبہ بھینسوں کی دیکھ بھال کر لیتیں۔ دودھ کے عوض جو پیسے ملتے ان کو جمع کر کے کچھ چھوٹے بکری کے بچے خرید لیے وہ بھی بھینسوں کے ساتھ پلنے لگے۔ ہمارے زیادہ اخراجات نہیں تھے۔ گندم گھر میں موجود تھی دودھ گھر کا تھا اور گھی بھی دیسی گھر میں بن جاتا اور اس طرح ہماری گزر بسر ہوتی رہی۔

سال بعد پالے ہوئے بکرے بھی خوب پل گئے اور عیدالاضحی کے موقع پر وہ بک گئے جن سے معقول رقم مل گئی۔ جس سے ایک بھینس اور خرید لی اسی طرح دس کے قریب بکری کے بچے اور خرید لیے اور اللہ نے برکت دی اس طرح ہر سال ایک بھینس مزید خرید لیتے اور بکری کے بچے بھی۔ پھر ایک وقت آیا اب ہمارے پاس آٹھ بھینسیں ہو گئیں اور پچیس کے قریب بکرے تو میں نے ان کا الگ باڑہ بنا لیا اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازم بھی رکھ لیا۔ اللہ کا شکر ہے ہمیں بہت اچھی آمدنی ہونے لگی۔

ہر قدم پر ماسٹر منظور صاحب نے میرا پورا ساتھ دیا اور وقت گزرتا رہا میں نے ایم کام کر لیا اب میرا اگلا مرحلہ یہ تھا میں نے آئی سی ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ میری دن رات کی محنت اور لگن کام آئی اور اللہ کی مہربانی سے آئی سی ایم اے کر لیا۔ اس کے بعد مجھے گورنمنٹ کی طرف سے بھی ملازمت کے مواقع ملے مگر میں نے پرائیویٹ سیکٹر کو ترجیح دی۔ اس طرح کچھ فرمز میں کام کیا۔ میری توقع اور سوچ سے بڑھ کر مجھے پیسے ملنے لگے۔ پھر اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی۔ دو بہنوں کی شادیاں بھی کر دیں۔

امی جان کو اب میری شادی کی فکر تھی تو انہوں نے اپنی یتیم بھانجی جو کہ بہت غربت میں پلی بڑھی تھی کا انتخاب کیا اور وہ میری شریک حیات بن کر آگئی۔ شادی کے ایک سال بعد اللہ نے بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ امی جان اب بہت بوڑھی ہو گئی تھیں ان کا سارا دن عبادت میں اور دعائیں مانگنے میں سوہنے رب کا شکر ادا کرنے میں گزرتا۔

مجھے ایک بہت بڑی انٹرنیشنل فرم کی جانب سے انتہائی پرکشش جاب کی آفر ہوئی اور فرم کے فنانس ڈائریکٹر کے عہدے کی پیشکش ہوئی۔ لاکھوں روپے تنخواہ، ڈیفنس میں کوٹھی اور نئی کار بمعہ ڈرائیور کے سہولیات کے ساتھ چنانچہ

میں نے یہ آفر قبول کرلی۔ ایک دن والدہ صاحبہ معمولی سی بیماری کے بعد وفات پا گئیں۔ ان کی موت کے بعد ہم گاؤں سے مکمل طور پر لاہور شفٹ ہو گئے۔ تمام بھینسیں فروخت کر دیں مگر گھر ابھی تک موجود ہے۔ میں ہر مہینے گاؤں کا چکر لگاتا ہوں اور پورا ایک دن اپنے آبائی گھر میں گزارتا ہوں جہاں مجھے اپنے ماں باپ کی خوشبو آتی ہے۔

چھوٹی دونوں بہنوں کی بھی بہت اچھے اور خوشحال گھرانوں میں شادیاں کردیں۔ الحمدللہ پاک پروردگار نے مجھ ناچیز پر بہت لطف و کرم فرمایا ہے۔ ہر قدم پر مجھے نوازا۔ میرے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جو کہ اعلیٰ سکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ میری بیوی عابدہ بہت اچھی شریک حیات ثابت ہوئی ہے۔ کہتے ہیں جس کا کوئی نہ ہو اس کا حامی و ناصر اللہ ہوتا ہے۔ والد صاحب کی موت کے بعد ایک بار تو ہم بے یارو مددگار ہو گئے تھے مگر رب کریم نے اپنی رحمت اور فضل و کرم سے سنبھلنے کا موقع عطا فرمایا اس پاک ذات نے مدد فرمائی اور یہ اسی کا کرم ہے کہ میں آج آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ میں فرم کا فنانس ڈائریکٹر ہوں بہت ساری سہولیات حاصل ہیں۔ میری ذاتی کوٹھی بھی ڈیفنس میں تیار ہو رہی ہے۔ یہ کوٹھی، کار، ڈرائیور، نوکر چاکر کمپنی کی طرف سے ملے ہیں۔ مجھے فرم کے معاملات میں مکمل اختیارات حاصل ہیں۔ زندگی بڑے امن اور سکون سے گزر رہی ہے۔

ہم چاروں دم بخود اعجاز کی باتیں سن رہے تھے۔ جب اعجاز کی باتیں مکمل ہو گئیں تو ہم نے اعجاز سے کہا کہ یار تم بہت عظیم انسان ہو۔ ہم نے سکول میں ہمیشہ تمہارا مذاق اڑایا تمہارا نام بگاڑ کر تمہیں چوہا کہتے تھے۔ تمہارے والد صاحب کی موت کے بعد پلٹ کر تمہاری خبر نہ لی۔ یار ہم بہت شرمندہ ہیں تم سے اور یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی اور ایک عظیم انسان ہونے کی نشانی ہے کہ کل تم نے افتخار کو پہچان لیا حالانکہ افتخار نے تمہیں نہیں پہچانا تھا اور آج ہمیں اتنی عزت بخشی کہ اپنے گھر کھانے پر بلایا ہے۔

اتنے بڑے آدمی بن گئے ہو مگر تم میں ذرا بھی غرور اور تکبر نہیں ہے۔ یار اعجاز پلیز ہمیں معاف کر دو ہم تمہارے ساتھ بہت زیادتی کرتے رہے ہیں۔

اس پر اعجاز نے کہا کہ نہیں یار میں بڑا آدمی نہیں ہوں۔ بس سب سے بڑی ذات اللہ کی ہے اور اللہ کے بعد اس کے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ کی ہے۔ پھر اعجاز ہنسنے لگا اور کہنے لگا یار کوئی بات نہیں وہ عمر ہی ایسی تھی اور اس عمر میں بچے ایسی شرارتیں کرتے ہی رہتے ہیں خیر ہے یار۔

پھر رات بارہ بجے تک خوب محفل جمی۔ اعجاز نے ہم سے ہمارے حالات پوچھے تو ہم نے شروع سے آخر تک اسے سب کچھ بتا دیا۔ اعجاز سب کچھ سن کر کچھ دیر سوچنے لگا پھر کہنے لگا دوستو ایسا ہے آپ سب ہماری فرم میں آ جاؤ میں خود مختار ہوں تو آپ چاروں کو اپنی فرم میں ملازمت کی پیشکش کرتا ہوں کیونکہ مجھے دکھ ہوا ہے آپ لوگ بہت تنگی کی زندگی گزار رہے ہو۔

اعجاز کا ڈرائیور ہمیں رات ایک بجے ہمارے گھروں میں چھوڑ گیا۔ مہینہ مکمل ہونے کے بعد ہم چاروں نے سکیورٹی گارڈز کی نوکریاں چھوڑ دیں اعجاز نے ہمیں کلیریکل شاف میں بھرتی کر لیا اب ہمیں معقول تنخواہ ملتی ہے۔

جس کی وجہ سے ہم بھی خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اعجاز ہمارا باس ہے ہم اس کے ماتحت ہیں اور اس کے احسانوں تلے دبے ہوئے ہیں۔ اعجاز کی بہت زیادہ عزت ہے وقار ہے، معاشرے میں ایک مقام ہے۔ آخر میں تمام پڑھنے والوں کو پیغام دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ علم بہت بڑی دولت ہے اور حدیث پاک بھی ہے کہ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے۔ آج علم اور محنت کی بدولت اعجاز کو عزت مقام مرتبہ، سکھ اور خوشحالی حاصل ہے دوسرا یہ کہ کبھی کسی کا مذاق نہ اڑائیں اور نہ ہی کبھی کسی کا نام بگاڑیں کیونکہ شریعت میں کسی کا نام بگاڑنے کی سختی سے ممانعت ہے۔ کبھی کسی کو حقیر یا کمتر نہ سمجھیں۔

☆☆☆

افسانہ

راشد لطیف

یہ زندگی ایک امتحان ہے، ایسا کڑا امتحان
جس سے امیر غریب سب کو گزرنا ہے تو
پھر کیوں ہم اپنے فرائض سے نظریں چرا کر
اردگرد گونجتی بے آواز سسکیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک مجبور شخص کا فسانہ..... معاشرے کی ایک تلخ حقیقت

راشد اٹھو صبح ہو گئی ہے۔ آج کام پہ نہیں جانا کیا؟ راشد کی بیوی نے راشد کو پیار سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

اوہو! سکون سے نیند بھی نہیں کرنے دیتی..... یارب میرے نصیب میں سکون لکھ دیتا تو تیرا کیا جاتا۔ راشد بڑبڑاتا ہوا بستر سے اٹھ بیٹھا۔

راشد کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ کچی دیواریں، ایک کمرہ، ساتھ چار دیواری بنا کر کچن کا نام دیا گیا تھا۔ کمرے کی چھت بانس اور چپل ڈال کر بنائی گئی تھی۔ درو دیوار سے غریبی کی بو آتی تھی۔ راشد کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا، بیوی اور تین بچے اس کی کل کائنات تھے۔

اپنے چھوٹے سے خاندان کو پالنا مشکل ہو گیا تھا۔ کبھی کام ملتا، کبھی نہیں، بیچارہ پڑھا لکھا تو تھا نہیں، محنت مزدوری ہی کر سکتا ہے وہ بھی کبھی دیہاڑی لگ جاتی، کبھی مایوسی ہوتی۔ آج بھی راشد کی بیوی اسے کام پہ جانے کے لیے اٹھا رہی تھی۔ رات بھر سوچتے جانے کس پہر آنکھ لگی تھی۔

راشد بڑبڑاتا ہوا، منہ پر پانی کے چند چھینٹے مارتے بان کی چارپائی پر آن بیٹھا۔

او! پیاری بیگم جلدی سے کھانا دو، ورنہ لیٹ ہو گیا تو کام نہیں ملے گا۔ کیا خبر آج بھی دیہاڑی لگتی ہے یا پھر کل کی طرح دھوپ میں واپس نہ آنا پڑے، راشد کے اندر کوئی بیٹھا

کچھ کے لگا رہا تھا۔

بیگم! مزدور چوک پہ مزدوروں کی لمبی قطاریں ہوتی ہیں، جانے کس کس کی قسمت جاگے گی...... کام دینے والے تھوڑے ہوتے ہیں اور مزدور بہت زیادہ...... جس کو کام مل گیا وہ تو بہت خوش ہوتا ہے، رب رحمان کا شکر بجالاتا ہے۔ جس کو کام نہیں ملتا، مایوس، اداس گھر کو لوٹتا ہے۔

واہ! میرے مولا! تیری مرضی، جسے چاہے امیر بنادے، جسے چاہے غریب بنادے۔ تجھ سے کون پوچھتا ہے؟ تو غریبی نہ دیتا تو تیرا کیا جاتا تھا۔ تیری شان میں کون سی کمی آنی تھی۔

کاش! میرے نصیب میں بھی امیری لکھی ہوتی۔ میرے پاس ہر چیز ہوتی، دردر کی ٹھوکریں نہ ہوتیں، دووقت کی روٹی کے لیے خاک نہ چھانتا پھرتا۔ تیرے خزانے میں کمی تو نہیں آنی تھی۔ مجھ غریب پہ تیرا کرم کب ہوگا؟ کب میری تنگدستی دور ہوگی۔ کب میرے نصیب بدلیں گے۔ آخر کب......؟

راشد خیالوں کی دنیا میں اپنے پیدا کرنے والے رب سے شکوے شکایات کی پٹاری کھولے بیٹھا تھا کہ اس کی بیوی نے آواز دی، کھانا چارپائی پہ پڑا ٹھنڈا ہوگیا تھا، چنگیر میں ایک روٹی اور کٹوری میں تھوڑا سا سالن تھا، جو راشد کی بیوی صبح سویرے ہمسائیوں سے مانگ لائی تھی، انہوں نے رات کا بچا ہوا باسی سالن اٹھا دیا تھا۔

راشد دو چار نوالے زہر مار کرتا بھی تو اتنے میں بیگم نے آواز دی۔ ابھی تک آپ کام پر نہیں گئے...... جلدی...... جلدی تو بہت لگا رکھی تھی۔ ایک تو روزی نہیں ملتی تھی، اوپر سے بیوی کی زہریلی باتیں کلیجہ چیرتی تھیں۔ راشد نے کھانا وہیں چھوڑا اور چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا، اٹھتے اٹھتے جواب دیا۔

اوہو...... جا رہا ہوں...... میرے سکون کی دشمن، گھر میں دو پل سکون سے بیٹھنے بھی نہیں دیتی ہو۔ دروازہ بند کر لینا، میں جا رہا ہوں، راشد نے لکڑی کے گیٹ کو کراس کرتے ہوئے بیوی کو کہا، جو کچن میں شاید بچوں کے لیے کچھ بنانے میں مصروف تھی۔ کرلوں گی...... اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا اور راشد باہر نکل گیا۔

راشد جوں ہی مزدور چوک پہ پہنچا، اس کے اوسان خطا ہوگئے، سبھی مزدور غمگین چہرے لیے پریشان بیٹھے تھے۔

کیا ہوا میرے بھائیو! راشد نے سانس کو بحال کرتے ہوئے کہا۔ آج سبھی پریشان لگ رہے ہو۔

راشد بھائی! آج پھر ہڑتال ہے۔ جانے اس دیس میں ہڑتالیں اور بے روزگاری کب ختم ہوگی، کسی امیرزادے کا کتا بیچ سڑک مرجائے تو ہڑتالیں شروع ہوجاتی ہیں اور کسی غریب کا بچہ بھوک سے ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مرجائے، کوئی پروا نہیں۔ اس ملک کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ کب ہمارے وطن کے حالات ٹھیک ہوں گے اور کب ہم غریبوں کو سکون سے روٹی ملے گی، راشد خیالوں کے جنگل آباد کرنے لگا تھا۔

آج گھر میں آٹا بھی نہیں تھا۔ میرے بچوں کا کیا بنے گا، بچے صبح نئے کپڑوں کی فرمائش بھی کر رہے تھے۔ عید بھی سر پہ ہے۔ میرے مولا، میرے گھر کا کیا بنے گا؟ راشد سوچوں میں گم تھا، دن چڑھ آیا تھا مگر آج دوسرے دن بھی کام نہیں ملا تھا۔ آخر بوجھل قدموں سے واپس گھر کو لوٹ گیا۔ دروازے پر ہی بیگم نے لٹکا ہوا منہ دیکھا تو سب سمجھ گئی۔ بیگم صاحبہ! آج پھر ہڑتال ہے، ہڑتال کی وجہ سے کوئی کام نہیں ملا......

او...... اسد کے پاپا، ان بچوں کا کیا بنے گا۔ جو دن بھر سے بھوکے ہیں۔ گھر میں پکانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

راشد کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے، ایک بیٹی۔ بیٹی جس کا نام سمرین تھا۔ بڑے بیٹے کا نام اسد اور چھوٹے کا ماجد تھا۔ راشد دروازہ پر ہی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ زمین گھومتی محسوس ہوئی۔ بیگم دوڑ کر پانی کا گلاس لائی۔ راشد نے پانی حلق سے نیچے اتارا تو سانس بحال ہوئیں، وہ بھی تو دن بھر سے بھوکا تھا۔ صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔

بیگم تسلی رکھو، میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں، تم پریشان نہ ہو اور مجھے بھی پریشان نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔

راشد بیوی کو تسلی دیتا باہر نکل گیا۔ اس کے قدم دوست کی جانب اٹھ رہے تھے۔ دوست نے لٹکا منہ دیکھا تو وجہ جانی۔ راشد نے تمام روداد کہہ سنائی تو دوست نے کچھ رقم ادھار دے دی۔ راشد گھر آتے ہوئے آٹا اور سبزی وغیرہ لے آیا۔ اس طرح اس دن کی روٹی پکی۔ شام ہوئی تو بیگم راشد کے پاس آ بیٹھی۔ پیار سے کہنے لگی۔

اسد کے ابا، تمہیں پتہ ہے کہ بچوں کے کپڑے نہیں ہیں۔

جی جی مجھے معلوم ہے، بیگم تھوڑا صبر تو کرو، اللہ کرم کرے گا۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو......

ایک تو میرے پاک وطن کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ آئے روز حالات خراب سے خراب تر ہو رہے ہیں۔ پھر یہ لوڈشیڈنگ، اف اللہ! لوڈشیڈنگ کی وجہ سے کام بھی نہیں ملتا۔ بے روزگاری بڑھتی جاتی ہے۔ غریب جائیں تو جائیں کہاں؟ غریب ہونا اس دور میں گالی ہی تو ہے۔ غریب کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے امیر لوگ، ناک پہ رومال رکھنا نہیں بھولتے۔ ہاتھ کون ملائے گا؟ بیگم، غریب کو مرجانا چاہیے۔ گھٹ گھٹ کے جینے سے بہتر ہے سکون سے مرجائے۔ میرا دل کرتا ہے گلے میں رسی ڈال کر خودکشی کرلوں۔ خودکشی اسلام میں حرام نہ ہوتی تو میں کب کا مرچکا ہوتا......

آج کے دور میں مرنا بھی مہنگا ہوگیا ہے۔ کوئی دو نوالوں کے لیے ترس رہا ہے اور کسی کے جنازے میں ہزاروں، لاکھوں اڑائے جارہے ہیں۔ امیری، غریبی کا تضاد نہ ہوتا تو دنیا بدمزہ نہ ہوتی......

نیلے آسمان والا، غریبوں کا تماشا دیکھ رہا ہے...... اور امیروں کو زیادہ دے کر بھول سا گیا ہے۔ کیا میرا رب نہیں جانتا ہے کہ اس کے بچے بھوکے سوتے ہیں اور امیروں کے کتنے ہرن کھا کر ڈکار بھی نہیں لیتے...... مجھے مرہی جانا چاہیے۔

اسد کے ابا! کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ کیسے کفرانہ باتیں کر رہے ہیں، توبہ کیجئے...... اللہ تعالیٰ سے ڈریں...... کہیں کوئی عذاب ہی نازل نہ ہوجائے۔ وہ رحمان ہے سبھی کے حالات سے واقف ہے، نہ وہ سوتا ہے، نہ غافل ہوتا ہے...... ہاں آزماتا ضرور ہے...... اپنے بندوں کو آزمائش میں مبتلا کر کے امتحان ضرور لیتا ہے۔ آپ کو ایک دن کام نہیں ملا تو شکوے شکایات کے انبار لگادیئے۔ آپ دل چھوٹا کیوں کر رہے ہیں۔ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ وہی سبھی کا پالنے والا ہے۔ وہی رازق ہے۔ وہی دے گا...... سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا...... ہاں سب ٹھیک ہوجائے گا۔

کب ٹھیک ہوگا...... جب سانسوں کی ڈور ٹوٹ جائے گی؟

اف، اسد کے ابا...... اب بس بھی کرو۔

اچھا چھوڑو سب باتیں، کھانا کھالو...... راشد کی بیوی نے چنگیر میں روٹیاں اور کٹوری میں سالن لاکر چارپائی پر رکھ دیا تھا...... اور بچوں کو آواز دی...... اسد اور ماجد ان کی باتوں سے بے فکر ہو کر اپنی دنیا سجائے بیٹھے تھے۔ امی کی آواز پر دوڑے چلے آئے۔

شام کے سائے ڈھلے، سبھی نے کھانا کھایا اور سونے کے لیے چارپائیوں پر لیٹ گئے...... اسد اور ماجد ایک ہی چارپائی پر پڑے اوندھے سو رہے تھے اور تھوڑی دور ٹوٹی ہوئی موٹے بان کی چارپائی پر پڑا راشد، چاند ستاروں کو گھورتے ہوئے سوچوں کے نگر آباد کیے ہوئے تھا......

راشد کی بیوی بھی دن بھر کے کام کی تھکن سے جلدی سو گئی تھی۔ واحد وہی تھا جو اپنی قسمت کا ماتم کر رہا تھا۔ اگر کل بھی کام نہ ملا تو...... اسی سوچ پر وہ کانپ اٹھتا...... پھر رات کے پچھلے پہر نیند نے رحم کیا اور اسے اپنی گود میں لے کر لوریاں سنانے لگی۔ راشد کی آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح راشد جلدی مزدور چوک جا پہنچا، مگر آج بھی کام نہ ملا۔ راشد دھکے کھا کھا کر اداس، مایوس، چڑھتے سورج کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھے ہی تھے کہ بیوی نے منحوس خبر سنا دیا۔ راشد زمین میں دھنستا چلا گیا...... اسد

کے ابا...... سمرین کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اسے جلدی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں...... اسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ راشد جلدی گھر آیا تھا، شاید آج بھی کام نہیں ملا...... مگر اسے تو سمرین کی فکر تھی۔ راشد کی آنکھوں میں آنسو نکلنے لگے۔
بیگم! آج بھی خالی دامن لوٹا ہوں...... جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ دوائی کہاں سے لوں؟ میں کدھر جاؤں...... کہاں سر پیٹوں...... رب رحمان کو بھی رحم نہیں آتا......

راشد کی بیوی بھی رو رہی تھی۔ سمرین کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ راشد کی بیوی بار بار اسے کہیں لے جانے کا کہہ رہی تھی۔

اسد کے ابا! کچھ تو کرو، ورنہ یہ مر جائے گی...... میری بچی...... بیگم! سمرین کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں اور اس سے فریاد کرتے ہیں کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس ایک روپیہ بھی نہیں ہے۔ اللہ! کے نام پہ ہماری بچی کا علاج کر دیں۔ جیسے ہی ہمارے پاس پیسے آئے، ہم دے جائیں گے...... راشد کی بیگم نے راشد کی ہاں میں ہاں ملائی اور پھر دونوں سمرین کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔

ڈاکٹر کو سب کچھ بتا دیا، جو وہ گھر میں سوچ کر گئے تھے۔ ڈاکٹر کی منت سماجت کی، اس سے التجائیں کیں۔ خیر ڈاکٹر مان گیا...... لیکن ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی، مگر سمرین کا وقت آ چکا تھا، وہ اپنی زندگی کی سانسیں پوری کر چکی تھی۔

سمرین اپنے اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی، اپنے پیدا کرنے والے رب کے ہاں ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔

راشد اور اس کی بیگم کا رو رو کر برا حال تھا۔ راشد غم سے نڈھال تھا تو اس کی بیوی کو دورے پڑ رہے تھے۔ کوئی ان کو تسلی دینے والا نہیں تھا، کوئی چپ کرانے والا نہیں تھا۔ کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا۔ کس کے کندھے لگ کر غم ہلکا کرتے۔ کوئی بھی تو نہیں تھا، جب اپنے ہی نہ رہے تھے تو غیروں نے کہاں تک ساتھ نبھانا تھا۔ ان کو صرف اور صرف رب رحمان کا آسرا تھا۔ ان کے گھر کی رحمت روٹھ گئی تھی۔

غم کی گھڑیاں جیسے تیسے گزر گئیں۔ ایک شام راشد کی بیوی نے راشد سے کہا!

دیکھو! اسد کے ابا! مہنگائی کے اس دور میں ایک کمانے والے سے کچھ نہیں بنتا۔ آپ کہو تو میں بھی کسی کے گھر کام کر کے گھر کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے میں مدد کروں...... اس طرح گھر کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ راشد نے کہا، جیسے آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جیسے آپ کو اچھا لگے۔

اگلے دن راشد کی بیوی بھی کام پہ جانے لگی۔ دونوں کو اپنے رب پہ بھروسہ تھا۔

یقین کامل ہو تو منزل مل جایا کرتی ہے۔ کبھی نہ کبھی گھر کے حالات بدلیں گے۔ اور اچھے دن ضرور آئیں گے۔ دونوں کے جذبے جوان تھے۔

راشد! ایک روز جب شام کو کام سے گھر آیا تو بہت خوش تھا۔ بیگم نے راشد کے چہرے پہ دیکھا تو لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، خیر تو ہے آج کافی عرصہ بعد اس چہرے پہ خوشی کے آثار دیکھے ہیں۔

ہاں بیگم! آج میں بہت خوش ہوں...... کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ آخر ہوا کیا......

بیگم! جہاں میں کام پہ جاتا تھا۔ اس مالک کو میرا کام بہت پسند آیا۔ مالک مکان بہت اچھے انسان ہیں۔ اس نے مجھے اپنے ہاں مستقل رکھ لیا ہے۔ تنخواہ بھی اچھی ہے۔

راشد کی بیوی بہت خوش ہوئی۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ اب ہمارے دن پھر جائیں گے، اس گھر میں بہار آئے گی۔ غریبی بوریا بستر لے کر کہیں دور بہت دور چلے جائے گی۔ اچھا ہوا آپ کو ایک جگہ کام مل گیا۔

دونوں میاں بیوی کام پہ جانے لگے۔ گھر میں رونق سی آ گئی غربت کے سائے چھٹنے لگے۔ حالات بہتر ہونے لگے، دونوں بچے سکول جانے لگے تھے۔ دونوں میاں بیوی شکرانے کے نفل ادا کرتے۔ اداسی محرومی کے بادل اپنا منحوس

سایہ کہیں اور لے گئے تھے۔ دونوں بہت خوش تھے، مگر ان کو خبر ہی نہیں تھی کہ خوشیوں کے پل چند لمحوں کے مہمان بن کر آئے ہیں۔ لمحوں کی خوشی کے لیے زندگی بھر غم کی سوغات ملتی ہے۔ راشد کے گھرانے پر بھی غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ درودیوار، کاٹنے کو آتے۔ ہر چیز ماتم کناں تھی۔ راشد کا گھر خاموشی، مفلسی کا نمونہ بن چکا تھا۔ اس کی شریک حیات بیمار پڑ گئی۔ غریب کو کوئی بیماری لگ جائے تو زندگی لے ہی جاتی ہے۔ راشد کے پاس رقم نہیں تھی، بیوی کے علاج پہ بہت رقم خرچ ہوتی تھی۔ اس نے اپنا کشکول اپنے مالک کے آگے کر دیا۔ مالک نے رقم ادھار دے تو دی۔ مگر کڑی شرائط کے ساتھ۔ راشد بیوی کو اچھے ہسپتال میں لے گیا۔ علاج شروع ہو گیا۔ کبھی یہ انجکشن، کبھی یہ دوائی، لے آؤ...... ڈاکٹر...... پرچی تھماتے ہوئے کہتے۔

جب تک راشد کی جیب میں رقم تھی دوائی لیتا رہا۔ کافی دن گزر گئے، مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف بیوی کی بیماری، دوسری طرف بچوں کی دیکھ بھال، ان کے کھانے کا بندوبست کرنا، نہلانا، کپڑے دھونے کا معاملہ...... راشد کے پاس حوصلے کہاں سے آ گئے تھے۔ بیوی کی طرف سے کسی رشتے دار، بہن بھائی نے خبر نہیں لی تھی۔ سچ ہی کہتے ہیں غریبی میں تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ راشد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ راشد کی بیوی کو بستر مرگ پر پورا ایک سال گزر گیا تھا۔

راشد کے ساتھ ساتھ بچے بھی پریشان تھے۔ راشد نے بچوں کو سنبھالا ہوا تھا، ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا ہوا تھا۔ روٹی سے لے کر نہلانے تک خیال رکھتا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے اور راتوں کو دیر تک جاگنے سے راشد کی صحت بھی گرنے لگی۔ وہ بھی بیمار رہتا لگا۔ جہاں وہ کام کرتا تھا وہاں سے کافی رقم ادھار لے چکا تھا، اب انہوں نے بھی اور رقم دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اتنی آپ کی تنخواہ نہیں ہے جتنی رقم ادھار لے چکے ہو۔ راشد کے حالات بد سے بدترین ہوتے گئے۔ گھر کے برتن تک فروخت ہو گئے تھے۔ راشد نفسیاتی مریض بن گیا۔ گھنٹوں گم صم بیٹھا زمین کے فرش پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا۔ لب خاموش اور آنکھیں برستی تھیں۔

ادھر جہاں کام کرتا تھا، انہوں نے یہ کہہ کر چھٹی کروا دی تھی کہ اب تم کام کرنے کے لائق نہیں رہے۔ کام کم کرتے ہو اور نقصان زیادہ کرتے ہو، ہم مزید نقصان برداشت نہیں کر سکتے، لہٰذا کل سے کام پہ نہیں آنا۔ ان کی باتیں راشد کے دل پر نشتر چلا رہی تھیں۔ لفظ زہریلے تیر بن گئے تھے۔ مرتا کیا کرتا، غریب کی سنتا ہی کون ہے۔ یہاں تو مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والے بستے ہیں۔ منہ کا نوالہ چھیننے والے تو بہت ہیں، نوالہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔

راشد آنسو بہاتا، روتا، کرلاتا واپس اپنے اجڑے گھر لوٹ آیا۔ راشد کی بیوی بستر مرگ پر پڑی مورتی بنی ہوئی تھی۔ کبھی بیوی کو دیکھتا تو کبھی اپنے بچوں کو، کبھی اپنے گھر کے بارے میں سوچ کر چپکے چپکے آنسو بہاتا تھا۔

وہ معمول کی شام تھی، جب راشد کے گھر ماتم ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی بان کی چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی۔ کوئی رونے والا نہیں تھا۔ راشد بیوی کی چارپائی کو پکڑ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اسد اور ماجد مما مما کہہ کر چیخ و پکار کر رہے تھے۔ رونے کی آواز سن کر ہمسائے آئے، انہوں نے بے چاری کی آخری رسومات ادا کیں اور منوں تلے دفن کر دیا...... راشد بیوی کے جنازے کو کندھا دے کر جنازہ گاہ تک تو گیا تھا، مگر جنازہ کب پڑھا، اسے ہوش نہیں رہا...... جنازے کی پہلی صف میں کھڑا تھا کہ چکرا کر گر پڑا...... گرتے ہی بے سدھ ہو گیا...... دماغ کی شریان پھٹ گئی تھیں اور وہ بھی اس دنیا سے کوچ کر گیا تھا...... بیوی کی جدائی برداشت نہیں کر سکا تھا...... ادھر صف ماتم بچھی تھی اور محلے کے دوسرے کونے میں جاگیردار کے بیٹے کی شادی کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ ناچنے والے اپنا تماشا دکھا رہے تھے اور عیاش لوگ، منچلے نوجوان ہرے نوٹوں کی برسات کر رہے تھے۔ عریانی لباس میں رقاصائیں رقص پیش کر رہی تھیں، شباب اور

کباب کے مزے اڑائے جارہے تھے۔

ان کو آج ہی مرنا تھا، کم بختوں نے، شادی کا جشن خراب کردیا...... جاگیردار اپنے ایک دوست کو کہہ رہا تھا اور میں پاس کھڑا سن رہا تھا۔ کتنا زہریلا جملہ تھا، میری روح تک کانپ اٹھی۔ قرآن مجید میں ہمسائیوں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں، جو خود کے لیے پسند کرو، وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو...... لیکن ہمارا معاشرہ بے حس ہو گیا ہے، ہمسائے کے بچے بھوکے سوتے ہیں تو کیا ہوا، ہمارے کتے کو گوشت ملنا چاہیے۔

اہل دین نے خود کو کن راہوں پر لگالیا ہے۔ حقوق العباد یاد نہیں اور شباب و کباب جاری ہیں۔ چند خدا ترس لوگوں نے راشد کو بھی کفن مانگ تانگ کر بیوی کے پہلو میں منوں مٹی تلے دفن کردیا...... مولوی صاحب، کہہ رہے تھے! کہہ دو، دونوں نیک تھے...... میری روح تڑپ اٹھی...... ہم جینے والوں کی قدر کیوں نہیں کرتے...... یہی الفاظ ان کے سامنے کہے جاتے، ان کی مدد کی جاتی، تو شاید کچھ پل اور جی جاتے...... موت کا وقت مقرر ہوتا ہے، اگر ان کا وقت آ گیا تھا تو کم از کم خوشی سے تو مرتے...... زندہ تھے تو کسی نے خبر تک نہیں لی تھی۔ راشد کس کرب سے گزر رہا ہے، اس کے بچے بھوکے سوتے ہیں یا ان کو کچھ چاہیے۔

دو غریب جسم فنا ہو گئے تھے، ان کو مر جانا ہی چاہیے تھا، جدید دور میں غریبوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ دنیا دولت مندوں کی ہے بھلا غریبوں کا یہاں کیا کام۔ غریب اس دنیا میں داغ ہی تو ہیں، داغ جتنی جلدی دھل جائیں تو بہتر ہے...... امیروں کا کیا ہے جب بھی موت کے جام پئیں گے، اپنی زندگی عیاش سے گزار چکے ہوں گے۔ ان کو کیا غم ہوگا...... آگے کی منزلیں کیسی ہوں گی ان کو فکر نہیں...... اگلی دنیا غریبوں کی ہوگی، میرے غریب دوستوں جشن کی تیاری کرو، جنت ہماری منتظر ہے، بس وہی اپنی دنیا ہے۔ راشد اور اس کی بیوی کو لوگ کب کے آخری آرام گاہ کی طرف لے گئے تھے اور میں جنازہ گاہ میں کھڑا سوچ رہا تھا کیا اس دور میں غریبوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے؟ کیا امیر زادوں سے ان کے بارے سوال نہیں ہوں گے۔ غریب بھی انسان ہوتے ہیں، غریب نہ ہوں تو تمہارے کام کون کرے گا۔ پھر ان مزدوروں کا حق کیوں دبایا جاتا ہے، غریب مزدور کو اس کا معاوضہ کیوں نہیں دیا جاتا...... یتیموں کا حق کیوں کھا جاتے ہیں...... جس طرح تم جیتے ہو، غریبوں کو بھی جینے کا پورا پورا حق ہے۔ ان کی مدد کرنی چاہیے، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا کریں، کل روز قیامت ان کے بارے میں سوال و جواب ہوں گے تو تم کیا جواب دو گے۔ آپ کی بے حسی کی وجہ سے مرنے پر مجبور ہیں۔ روز اخباروں میں پڑھتے ہوں گے کہ آج فلاں شہر میں غریب نے حالات سے تنگ آ کر خودکشی کرلی، فلاں شہر میں غریب شخص نے حالات سے تنگ آ کر بیوی بچوں کو قتل کردیا اور خود کو بھی ختم کرلیا۔ آج غریب اپنے گردے اپنے بچے فروخت کرنے پر مجبور ہیں، ایسا کیوں ہورہا ہے۔ ہمارے مردہ ضمیر کب جاگیں گے۔ محبت بھائی چارہ کا نظام کب نافذ ہوگا...... کب تک غریب مرتے رہیں گے اور امیر جشن مناتے رہیں گے، سدا دولت پاس نہیں رہتی اور وقت بدلتا رہتا ہے۔ وقت بدلنے سے پہلے ہی سنبھل جائیں ورنہ...... قیامت نے تو آنا ہی ہے...... پھر غریبوں کے ہاتھ تمہارے گریبانوں میں ہوں گے...... اور تم اف تک نہ کر سکو گے...... میں جنازہ گاہ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ مجھے دو ننھے ننھے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا، خیالوں کی دنیا سے واپس آیا تو دیکھا کہ اسد اور ماجد میرے پاس کھڑے آنسو بہا رہے ہیں۔

انکل...... ہمارے مما پاپا کہاں گئے ہیں۔ ہمیں بھوک لگی ہے...... بھوک...... میری آنکھیں نمکین پانی سے تر ہوتی گئیں اور میں اسد اور ماجد کو اپنے ساتھ، اپنے گھر لے آیا...... اب وہ میرے بیٹے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کرنا میرا فرض ہے...... آپ بھی اپنے اردگرد دیکھیں کوئی یتیم بچہ آپ کا منتظر تو نہیں ہے......

☆☆☆

اردو ادب سے انتخاب

خانہ داماد

پریم چند

جیٹھ کا دوپہر تھا۔ ہری دھن ایک کھیت میں پانی دے آیا اور باہر بیٹھا رہا۔ گھر میں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آرہا تھا اور ساتھ ہی کھن کھن کی آواز بھی آرہی تھی۔ اس کے دونوں سالے اس کے بعد آئے اور گھر میں چلے گئے ان دونوں کے لڑکے بھی آئے اور اسی طرح گھر میں داخل ہو گئے۔ مگر ہری دھن اندر نہ جا سکا ادھر ایک مہینہ سے اس کے ساتھ جو برتاؤ ہورہا تھا اور خصوصاً کل اسے جیسی ڈانٹ سننی پڑی تھی، وہ اس کے پیروں میں بیڑیاں سی ڈالے ہوئے تھی۔ کل اس کی ساس ہی نے تو کہا تھا کہ میرا جی تم سے گھبرا گیا۔ میں کوئی تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ لئے بیٹھی ہوں؟ سب سے بڑھ کر اس کی بیوی کے بے دردانہ سلوک نے اس کے دل کو پاش پاش کردیا تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی اس ساری ڈانٹ پھٹکار کو سنتی رہی مگر اس کے منہ سے ایک مرتبہ کو بھی تو نہ نکلا کہ اماں؟ تم کیوں ان کی بے عزتی کر رہی ہو؟ چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی۔ شاید میری درگت پر وہ خوش ہو رہی تھی۔ اس گھر میں وہ کیسے جائے کیا پھر وہی گالیاں کھانے، وہی دل آزار باتیں سننے کے لئے اور آج اس گھر میں زندگی کے دس سال گزر جانے پر یہ حال ہورہا ہے۔ کیا میں کسی سے کم

کام کرتا ہوں؟ دونوں سالے میٹھی نیند سوتے رہتے ہیں، اور میں بیلوں کو چارہ پانی دیتا ہوں۔ چھانٹی کاٹتا ہوں۔ وہاں سب لوگ پل پل پر چلم پیتے ہیں۔ میں آنکھیں بند کئے اپنے کام میں لگا رہتا ہوں۔ شام کو گھر والے گانے بجانے چلے جاتے ہیں۔ میں بڑی رات تک گائیں، بھینس دوہتا رہتا ہوں۔ ان سب کاموں کے لئے یہ انعام مل رہا ہے کہ کوئی مجھے کھانے کو نہیں پوچھتا۔ الٹی اور گالیاں سننے کو ملتی ہیں۔

اس کی عورت گھر سے ڈول لے کر نکلی اور بولی" ذرا اسے کنویں سے کھینچ تو لو، گھر میں ایک بوند پانی نہیں ہے۔"

ہری دھن ڈول لے کر کنویں پر گیا، اور پانی بھر لایا۔

اسے زور سے بھوک لگ رہی تھی، سمجھا اب کھانے کو بلانے آوے گی۔ مگر عورت ڈول لے کر اندر گئی تو وہیں کی ہو رہی۔ ہری دھن تھکا ماندہ بھوک سے بے قرار پڑا سو گیا۔

دفعتاً اس کی بیوی نے آ کر جگایا۔

ہری دھن نے پڑے پڑے کہا۔ کیا۔ کیا ہے۔ کیا پڑا بھی رہنے دے گی کیا اور پانی چاہئے؟

گمانی سخت لہجہ میں بولی "اتر آتے کیوں ہو؟ کھانے کو بلانے آئی ہوں۔"

ہری دھن نے دیکھا اس کے دونوں سالے اور بڑے سالے کے دونوں لڑکے کھانا کھائے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے بدن میں آگ لگ گئی۔ میری اب یہ نوبت پہنچ گئی کہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ یہ لوگ مالک ہیں، میں ان کی جھوٹی پتیلی چاٹنے والا ہوں۔ میں ان کا کتا ہوں، جسے کھانے کے بعد روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ ہی گھر ہے جہاں آج سے دس برس پہلے اس کی کتنی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ سالے غلام بنے رہتے تھے۔ ساس منہ چومتی رہتی تھی۔ بیوی پوجا کرتی تھی۔ تب اس کے پاس روپیہ تھا۔ جائیداد تھی۔ اب وہ مفلس ہے، اس کی ساری جائیداد کو ان ہی لوگوں نے برباد کر دیا۔ اب اسے روٹیوں کے بھی لالے پڑے ہیں۔ اس کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا کہ اسی وقت اندر جا کر ساس اور سالوں کی خوب لعنت ملامت کرے مگر ضبط کر کے رہ گیا۔ پڑے پڑے بولا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ آج نہیں کھاؤں گا۔"

گمانی نے کہا" نہ کھاؤ گے میری بلا سے! ہاں نہیں تو! کھاؤ گے تو تمہارے ہی پیٹ میں جائے گا کچھ میرے پیٹ میں تھوڑا چلا جائے گا۔

ہری دھن کا غصہ آنسو بن گیا۔ یہ میری بیوی ہے جس کے لئے میں نے اپنا سب کچھ سواہا کر دیا۔ مجھے الو بنا کر اب یہ سب لوگ نکال دینا چاہتے ہیں۔ وہ اب کہاں جائے کیا کرے؟

اس کی ساس آ کر بولی۔ "چل کر کھا کیوں نہیں لیتے جی۔ روٹھے کس سے ہو؟ یہاں تمہارے نخرے اٹھانے کا کسی میں بل بوتہ نہیں ہے۔ جو دیتے ہو وہ نہ دینا، اور کیا کرو گے تم کو بیٹی بیاہی ہے، کچھ تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔

ہری دھن نے پیچ و تاب کھا کر کہا۔ "ہاں اماں غلطی تھی۔ میں ویسا ہی سمجھ رہا تھا۔ ارے میرے پاس دھرا ہی کیا ہے کہ تم میری زندگی کا ٹھیکہ لو گی۔ جب میرے پاس روپیہ تھا۔ میں سب کچھ تھا۔ اب غریب ہوں تو تم کیوں بات پوچھو گی۔"

بوڑھی ساس منہ پھلائے ہوئے چلی گئی۔

بچوں کے لئے باپ ایک فالتو سی چیز، ایک تکلف ہے۔ جیسے گائے کے لئے کھلی یا بابوؤں کے لئے چٹنی۔ ماں دال روٹی ہے۔ چٹنی عمر بھر نہ ملے تو ہرج ہی کیا ہے؟ مگر روٹی دال ایک دن بھی نہ ملے تو پھر دیکھئے کیا حال ہوتا ہے۔ باپ کا درشن کبھی کبھی، شام ہی

جاتا ہے۔ وہ بچہ کو اچھالتا ہے، پیار کرتا ہے اور کبھی اسے گود میں لے کر انگلی پکڑ کر سیر کرانے لے جاتا ہے یہ بھی اس کے فرائض کی حد ہے، وہ پردیس چلا جائے بچہ کو پروا نہیں ہوتی۔ مگر ماں تو بچے کے لئے سبھی کچھ ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ باپ کہیں ہو اسے پروا نہیں اسے تو صرف ایک اچھالنے کدانے والا آدمی چاہئے۔ مگر ماں تو اس کی اپنی ہی ہونی چاہئے۔ سولہ آنے اپنی، وہی روپ رنگ، وہی پیار، وہی سب کچھ ہے مگر وہ نہیں ہے تو گویا بچہ کی زندگی کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ پھر تو وہ شیوجی کا ناریل ہے۔ جس پر پھول چڑھانا لازمی نہیں محض اختیاری ہے۔

ہری دھن کی اماں کا آج دس سال ہوئے انتقال ہو گیا تھا، اس وقت وہ بیاہا جا چکا تھا۔ وہ سولہ سال کا تھا مگر ماں کے مرتے ہی اسے معلوم ہوا کہ میں کتنا بے کس ہوں، جیسے گھر پر اس کا حق ہی نہ رہا ہو۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بھائی کوئی نہ تھا بے چارہ تنہا گھر میں جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اماں کے لئے روتا تھا، مگر ماں کے سایہ سے خوف کھاتا تھا۔ جس کوٹھڑی میں اس کی جان نکلی تھی ادھر وہ نظر تک نہ اٹھاتا تھا۔ گھر میں بوا تھی، جو ہری دھن کو بہت چاہتی تھی۔ اسے اب دودھ زیادہ ملتا تھا۔ کام کم کرنا پڑتا تھا۔ بوا بار بار پوچھتی بیٹا کیا کھاؤ گے؟ باپ بھی اسے کچھ پیسے دیتا کہ جس طرح چاہے خرچ کرے مگر یہ سارے مرہم اس زخم کو مندمل نہ کر سکتے تھے۔ جس نے دل کو مجروح کر دیا تھا۔ لاڈ پیار بار بار اس کی ماں کی یاد دلاتا۔ ماں کی جھڑکیوں میں جو مزہ تھا وہ کیا اس پیار میں تھا؟ پہلے وہ تندرست تھا، مانگ مانگ کر کھاتا تھا۔ لڑ لڑ کر کھاتا تھا۔ اب وہ بیمار تھا۔ اچھی سے اچھی چیزیں دی جاتی تھیں، مگر اسے بھوک نہیں ہے۔

سال بھر تک وہ اسی حالت میں رہا، پھر تغیر واقع ہوا۔ ایک نئی عورت جسے لوگ اس کی ماں کہتے تھے، اس کے گھر میں آئی اور دیکھتے دیکھتے ایک کالی گھٹا کی طرح اس کی چھوٹی سی دنیا پر چھا گئی۔ ساری ہریالی،

خیریت

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد دو دوست تارا سنگھ اور بادل سنگھ ایک دوسرے سے ملحقہ گاؤں میں زندگی کے دن گزارنے لگے۔

ایک روز تارا سنگھ نے بادل سنگھ کو رات کے کھانے پر بلایا۔ بادل سنگھ نے رات کا خیال کرتے ہوئے لالٹین اپنے ہمراہ لے لی۔

دعوت رات گئے تک جاری رہی۔ جس کے بعد بادل سنگھ نشے کی حالت میں لالٹین وہیں بھول کر اپنے گھر چلے گئے۔

اگلی صبح ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ بادل سنگھ نے دیکھا تو تارا سنگھ کا ملازم کھڑا تھا۔

اس نے پوچھا۔

"سردار جی نے مجھے یہ پتہ کرنے بھیجا ہے کہ آپ اپنے گھر خیر خیریت سے پہنچ گئے تھے؟"

بادل سنگھ نے خوش ہو کر بتایا کہ وہ بڑے اچھے طریقے سے گھر پہنچ گئے تھے۔

"مگر آپ کی لالٹین تو ہمارے گھر ہی رہ گئی تھی، وہ میں واپس کرنے آیا ہوں۔" ملازم نے بتایا۔

"تو پھر میں رات کو لالٹین کی جگہ کیا اٹھا لایا تھا؟" بادل سنگھ نے حیرت زدہ ہو کر ملازم سے پوچھا۔

ملازم نے اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے کہا۔" ہمارے طوطے کا خالی پنجرہ۔"

(مومنہ عابد، لاہور)

سارے اجالے پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا۔ ہری دھن نے اس نقلی ماں سے بات تک نہ کی، اس کے پاس کبھی گیا تک نہیں۔ ایک روز گھر سے نکلا اور سسرال چلا گیا۔

باپ نے بار بار بلایا مگر اس کے جیتے جی وہ پھر گھر نہ گیا۔ جس دن باپ کے انتقال کی خبر اسے ملی ایک حسد آمیز مسرت ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

اس نئی دنیا میں آ کر ہری دھن کو پھر ایک مرتبہ ماں کی محبت کا سا سکھ ملا۔ اس کی ساس نے کسی وردان کی طرح اس کی بے لطف زندگی کو دلچسپیوں سے معمور کر دیا۔ اس میں ہریالی پیدا ہو گئی۔ سالیوں کی چھیڑ چھاڑ میں اس کی شفقت میں، سالوں کے مذاق میں اور بیوی کی محبت میں اس کے دل کی ساری مرادیں پوری ہو گئیں۔ ساس کہتی بیٹا تم اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو میری آنکھوں کے تارے ہو۔ وہ اس سے اپنے لڑکوں کی بیویوں کی شکایت کرتی۔ وہ دل میں سمجھتا تھا کہ ساس مجھے اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتی ہے باپ کے مرتے ہی وہ گھر گیا اور اپنے حصہ کی جائیداد فروخت کر کے روپیہ کی تھیلی لئے ہوئے پھر واپس آ گیا۔ اس کی دوگنی قدر و منزلت ہونے لگی۔ اس نے اپنی ساری پونجی ساس کے چرنوں پر رکھ کر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھا۔ اب تک اسے گھر کی یاد آ جاتی تھی۔ اب بھول کر بھی اس کی یاد نہ آتی تھی۔ گویا وہ گھر اس کی زندگی کا خوفناک واقعہ تھا جسے بھول جانا ہی بہتر تھا۔ وہ سب سے زیادہ کام کرتا۔ اس کی محنت و تندہی دیکھ کر گاؤں کے لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے تھے۔ اس کے خسر کی قسمت کو سراہتے جسے ایسا داماد ملا تھا۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے اس کی خاطر داری میں کمی واقع ہوتی گئی وہ پہلے دیوتا تھا، پھر گھر کا آدمی اور بالآخر گھر کا غلام ہو کر رہا۔ روٹیوں میں بھی خلل واقع ہوا۔ توہین ہونے لگی، اگر گھر کے لوگ بھوکے مرتے اور ان کے ساتھ ہی اسے بھی مرنا پڑتا تو اسے ذرا بھی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن جب وہ دیکھتا کہ لوگ تو مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں صرف میں ہی دودھ میں مکھی بنا دیا گیا ہوں تو اس کے دل سے آہ سرد نکل جاتی۔ ابھی وہ صرف پچیس ہی سال کا تو تھا، اتنی عمر اس گھر میں کیسے کٹے گی۔ اور تو اور اس کی بیوی نے بھی آنکھیں پھیر لیں، یہ اس کی مصیبت کا سب سے زیادہ دردناک پہلو تھا۔

ہری دھن ادھر تو بھوکا پیاسا فکر و تشویش کی آگ میں جل رہا تھا اور ادھر مکان کے اندر ساس اور بہوؤں، سالوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ گمانی ہاں میں ہاں ملاتی جاتی تھی۔ بڑے سالے نے کہا ''ہم لوگوں کی برابری کرتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی نے ان کی عمر بھر کا ٹھیکا تھوڑا ہی لیا ہے۔ دس سال ہو گئے ہیں۔ اتنے دنوں میں کیا دو تین ہزار نہ کھا گئے ہوں گے؟''

چھوٹا سالا بولا ''مجور (مزدور) ہو تو آدمی جھڑکے بھی، ڈانٹے بھی، اب انہیں کوئی کیا کہے نہ جانے ان سے کبھی پنڈ چھوٹے گا بھی یا نہیں۔ اپنے دل میں کہتے ہوں گے میں نے دو ہزار روپے انہیں دے رکھے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے دو ہزار روپے کب کے صاف ہو گئے۔

گمانی ماں کے سر سے جوئیں نکال رہی تھی،...... بولی نکھے آدمی کو کھانے کے سوا اور کام ہی کیا رہتا ہے۔''

بڑا سالہ۔ ''کھانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جسے جتنی بھوک ہو اتنا کھائے مگر کچھ پیدا بھی تو کرنا چاہئے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ مہمانی میں کس کے دن کٹے ہیں۔''

چھوٹا سالا۔ ''میں ایک دن کہہ دوں گا کہ آپ

اپنی راہ لیجئے۔ آپ کا قرض نہیں کھایا ہے۔''

گمانی اپنے گھر والوں کی ایسی ایسی باتیں سن کر اپنے شوہر سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اگر وہ باہر سے چار پیسے لاتا تو اس کی گھر میں کتنی آؤ بھگت ہوتی۔ وہ بھی رانی بن کر رہتی، نہ جانے کیوں نہیں باہر جا کر کماتے۔ ان کی نانی مر گئی ہے۔

گمانی کے خیالات و جذبات ابھی طفلانہ تھے۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ اسی گھر کے نفع و نقصان کا خیال اسے بھی نہ تھا۔ وہ بھی اسی مسئلہ کو انہیں الفاظ میں سمجھتی اور انہیں نگاہوں سے دیکھتی جیسا کہ اس کے گھر والے۔ ''سچ تو یہ ہے دو ہزار میں کیا کسی کو مول لیں گے۔ دس سال میں دو ہزار ہوتے ہی کیا ہیں۔ دو سو ہی تو سال بھر کے ہوئے۔ کیا دو آدمی سال بھر میں دو سو نہ کھائیں گے۔ پھر کپڑے تھے کبھی کچھ تو ہے۔ دس سال ہو گئے۔ ایک پیتل کا چھلا بھی نہیں بنا۔ گھر سے نکلتے تو جیسے ان کے پران جاتے ہیں۔ جیسے پہلے پوجا ہوتی تھی ویسے ہی ہوتی رہے گی۔ یہ نہیں سوچتے کہ پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے۔ بہو پہلے سسرال جاتی ہے، تو اس کا کتنا جائم ہوتا ہے۔ ڈولی سے اترتے ہی باجے بجتے ہیں۔ گاؤں محلہ کی عورتیں اس کا منہ دیکھنے آتی ہیں اور روپیہ بھی دیتی ہیں۔ مہینوں اسے گھر بھر سے اچھا کھانے کو ملتا ہے، اچھا پہننے کو کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ لیکن چھ مہینے کے بعد کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ وہ گھر کی لونڈی ہو جاتی ہے ان کے گھر میں میری بھی تو وہی درگت ہو گی، پھر رونا کاہے کا جو کہو کہ کام کرتا ہوں تو یہ تمہاری بھول ہے۔ مجبوری کی اور بات ہے آدمی ڈانٹتا بھی ہے، مارتا ہے، جب چاہتا ہے رکھتا ہے۔ جب چاہتا ہے نکال دیتا ہے، کس کر کام لیتا ہے، یہ نہیں کہ جب جی میں آیا پڑ کر سو رہے۔''

ہری ابھی پڑا ہوا اندر ہی اندر سلگ رہا ہو گا کہ اس کے دونوں سالے باہر آئے۔ بڑے سالے بولے ''بھیا اٹھو تیسرا پہل ڈھل گیا۔ کب تک سوتے رہو گے؟''

ہری دھن فوراً اٹھا اور تیز لہجہ میں کہا ''کیا تم دونوں نے مجھے الو سمجھ لیا ہے۔''

دونوں ششدر رہ گئے۔ جس آدمی نے کبھی زبان نہیں کھولی ہمیشہ نوکر کی طرح ہاتھ باندھے حاضر رہا اور آج یکا یک اتنا خود دار ہو جائے، یوں آستین چڑھا کر کھڑا ہو جائے۔ یہ انہیں ہوش میں لانے کے لئے کافی تھا، کچھ جواب نہ سوجھا۔

ہری دھن نے دیکھا ان دونوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں۔ بس وہ ایک دھکا دینے کی زبردست خواہش کو روک نہ سکا۔ اسی طرح بولا۔ میری بھی آنکھیں ہیں اندھا نہیں ہوں نہ بہرا ہوں۔ چھاتی پھاڑ کر کام کرتا ہوں۔ پھر بھی کتا سمجھا جاؤں ایسے گدھے کہیں اور ہوں گے۔''

اب بڑے سالے صاحب بھی گرم ہو پڑے۔ ''تمہیں کسی نے یہاں باندھ تو نہیں رکھا ہے۔''

ہری دھن لاجواب ہو گیا کوئی بات نہ سوجھی۔

بڑے نے پھر اسی لہجہ میں کہا۔ ''اگر تم یہ چاہو کہ جنم بھر مہمان بنے رہو اور تمہارا ویسا ہی ہوتا رہے تو یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے۔''

ہری دھن نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''کیا میں تم لوگوں سے کم کام کرتا ہوں؟''

بڑے۔ ''یہ کون کہتا ہے۔''

ہری۔ ''یہ تو تمہارے گھر کی ریت ہے کہ جو سب سے زیادہ کام کرے وہی بھوکوں مارا جائے۔''

بڑے۔ ''تم خود کھانے نہیں گئے۔ کیا کوئی تمہارے منہ میں ڈال دیتا۔''

ہری نے ہونٹ چبا کر کہا۔ ''میں خود کھانے نہیں گیا کہتے تمہیں لاج نہیں آتی؟''

بڑے نے کہا۔ "بہن تمہیں بلانے نہیں آئی۔"

ہری دھن کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دانت پیس کر رہ گیا۔

چھوٹے سالے نے کہا۔ "اماں بھی تو آئی تھیں، تم نے کہہ دیا بھوک نہیں ہے تو کیا کرتیں؟"

ساس بھی اندر سے لپکی آرہی تھی سن کر بولی "کتنا کہہ ہار گئی۔"

"تو نہ اٹھے تو میں کیا کروں؟"

ہری دھن نے خون اور آگ سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا:۔

"تو میں تمہارے لڑکوں کا جھوٹا کھانے کے لئے ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ تم لوگ کھا کر میرے سامنے روکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دو۔" بڑھیا نے اینٹھ کر کہا۔ "تو کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے؟"

ہری دھن شکست کھا گیا۔ بڑھیا نے ایک جملہ کے وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں آنکھوں کی آگ مدھم پڑ گئی، پھڑکتے ہوئے نتھنے ساکت ہو گئے، کسی چوٹ کھائے ہوئے آدمی کی طرح وہ زمین پر گر پڑا۔ کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے؟ یہ جملہ ایک لمبے بھالے کی طرح اس کے دل میں چبھا جا رہا تھا۔ نہ دل کی حد تھی نہ بھالے کی انتہا۔

کل گھر نے کھانا کھایا مگر ہری دھن نہ اٹھا۔ ساس نے منایا، سالیوں نے منایا، خسر نے منایا۔ دونوں سالے منا کر رہ گئے۔" مگر ہری دھن نہ اٹھا وہیں...... دروازے پر ایک ٹاٹ پڑا تھا" اسے اٹھا کر الگ کنوئیں پر لے گیا اور جگت پر بچھا کر پڑ رہا۔

رات زیادہ ہو چکی تھی آسمان کی فضائے بسیط میں لامحدود ستارے لڑکوں کی طرح کھیل رہے تھے کوئی ناچتا تھا کوئی کودتا تھا کوئی ہنستا تھا کوئی آنکھیں بند کر کے پھر کھول دیتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں کوئی بہادر لڑکا ایک لمحہ میں اس وسیع میدان کو پار کر جاتا اور نہ جانے کہاں جا کر چھپ جاتا۔ ہری کو اپنا بچپن یاد آیا جب وہ اسی طرح کھیلا کرتا تھا اس کی بچپن کی یاد روشن ستاروں کی طرح چمک اٹھی۔ وہ اس کا اپنا چھوٹا سا گھر، وہ آم کا باغ جہاں کیریاں چنا کرتا تھا وہ میدان جہاں وہ کبڈی کھیلا کرتا تھا سب اسے یاد آنے لگے۔ پھر ماتا بھری ماں کی موہنی صورت اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان کی آنکھوں میں کتنا درد تھا۔ کتنا رحم تھا۔ اسے معلوم ہوا گویا ماں آنکھوں میں آنسو بھرے اسے سینے سے لگا لینے کے لئے ہاتھ پھیلائے اس کی طرف چلی آرہی ہے۔ وہ اسی دلکش تصور میں محو ہو کر رہ گیا۔ گویا ماں نے اس کو سینہ سے لگا لیا اور وہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ وہ رونے لگا، زار و قطار رونے لگا۔ اسی خود فراموشی کی حالت میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے اماں تم نے مجھے بھلا دیا۔ دیکھو تمہارے پیارے لال کی کیا درگت بن رہی ہے۔ کوئی اسے پانی کو بھی نہیں پوچھتا۔ کیا جہاں تم ہو وہاں میرے لئے جگہ نہیں ہے۔" دفعتاً گمانی نے آ کر پکارا "سو گئے تم چل کر کھا کیوں نہیں لیتے۔ کب تک کوئی تمہارے لیے بیٹھا رہے؟"

ہری اٹھ بیٹھا اور تکوار سی نیام سے نکال کر بولا۔" بھلا تمہیں میری سدھ آئی تو۔ میں نے تو کہہ دیا تھا، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

گمانی۔ "تو کے (کتنے) دن نہ کھاؤ گے؟"

ہری۔ "اس گھر کا پانی نہ پیوں گا۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟"

ان مصمم ارادوں سے بھرے ہوئے الفاظ کو سن گمانی سہم اٹھی۔ بولی، کہاں جا رہے ہو؟" ہری نے گویا نشے میں کہا، تجھے اس سے کیا مطلب؟ میرے ساتھ چلے گی یا نہیں، پھر پیچھے سے نہ کہنا کہ مجھ سے

نہیں کہا۔"

گمانی معترض لہجہ میں بولی "تم بتاتے کیوں نہیں کہاں جا رہے ہو؟"

"تو میرے ساتھ چلے گی یا نہیں؟"

"جب تک تم نہ بتاؤ گے میں نہ جاؤں گی۔"

"تو یہ سمجھ معلوم ہو گیا تو نہیں جانا چاہتی مجھے اتنا ہی پوچھنا تھا۔ نہیں تو میں اب تک آدھی دور نکل گیا ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا، گمانی "سنو تو" پکارتی رہی مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

تین میل کی مسافت ہری دھن نے پانچ گھنٹہ میں طے کی۔ جب وہ اپنے گاؤں کے آم والے باغوں کے قریب پہنچا تو اس کی ماں کی یاد سے بھرا ہوا تخیل افق کی سنہری گود میں کھیل رہا تھا۔ ان درختوں کو دیکھ کر اس کا دل بے قرار ناچنے لگا۔ مندر کا سنہرا کلس دیکھ کر وہ اس طرح دوڑا گیا کہ ایک جست میں وہ اوپر جا پہنچا۔ وہ تیزی سے دوڑا جا رہا تھا گویا اس کی ماں آغوش کھولے بلا رہی ہو۔ جب وہ آموں کے باغوں میں پہنچا، جہاں ڈالیوں پر بیٹھنے سے اسے ہاتھی کی سواری کا مزہ ملتا تھا۔ جہاں کچے بیر اور لسوڑوں میں ایک روحانی لذت تھی تو وہ بے اختیار بیٹھ گیا اور زمین پر سر جھکا کر رونے لگا۔ گویا ماں کو اپنی مصیبت کی داستان سنا رہا تھا۔ وہاں کی ہوا میں وہاں کی روشنی میں گویا اس کی ماں کی ایک بہت بڑی سی مورت بس رہی تھی۔ وہاں کی چپہ چپہ زمین ماں کے قدموں کے نشانات سے مقدس بنی ہوئی تھی۔ ماں کی محبت بھرے الفاظ گویا اب تک اس فضاء میں گونج رہے تھے۔ وہاں کی آب و ہوا میں نہ جانے کون سا امرت تھا جس نے اس کے افسردہ دل کو ایک مرتبہ پھر امنگوں سے بھر دیا۔ وہ ایک درخت پر چڑھ گیا اور آم توڑ توڑ کھانے لگا۔ ساس کی وہ سخت کلامی بیوی کی وہ بے اعتنائی اور ساری ذلت یہ سب باتیں وہ بھول گیا۔ اس کے پاؤں پھول رہے تھے، تلوے جل رہے تھے، مگر اس مسرت کی محویت میں اسے کسی بات کا خیال نہ تھا۔

اس نے گالیاں بھی دیں۔ مگر ان گالیوں میں اس وقت ہری دھن کو بڑا لطف آ رہا تھا۔ وہ ڈالیوں میں چھپ گیا۔ اس نے کئی آم کاٹ کر گرائے اور زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ایسی خوشی سے بھری ہوئی ہنسی اس نے بہت دنوں سے نہ ہنسی تھی۔

رکھوالے کو وہ ہنسی پہچانی ہوئی سی معلوم ہوئی مگر ہری دھن یہاں کہاں وہ تو سسرال کی روٹیاں توڑ رہا ہے کیسا ہنسوڑ تھا، کتنا چلبلا، نہ جانے بچارے کا کیا حال ہو؟ پیڑ کی ڈال سے تالاب میں کود پڑتا تھا۔ اب گاؤں میں ایسا کون ہے؟"

ڈانٹ کر بولا۔ "ہاں بیٹھے بیٹھے ہنسو گے تو ساری ہنسی نکال دوں گا نہیں تو سیدھے اتر آؤ۔"

وہ گالیاں دینے ہی والا تھا کہ ایک گٹھلی آ کر اس کے سر پر لگی۔ وہ سر سہلاتا ہوا بولا یہ کون شیطان ہے۔ نہیں مانتا ٹھہرو میں آ کر خبر لیتا ہوں" اس نے اپنی لاٹھی نیچے رکھ دی اور بندروں کی طرح جھٹ اوپر چڑھ گیا۔ دیکھا تو ہری دھن بیٹھا مسکرا رہا ہے۔ متحیر ہو کر بولا، "ارے ہری دھن تم یہاں کب آئے؟ اس پیڑ پر کب سے بیٹھے ہو؟"

دونوں بچپن کے ساتھی وہیں گلے ملے۔

"یہاں کب آئے؟ چلو گھر چلو، بھلے آدمی! کیا وہاں آم بھی میسر نہ ہوتے تھے۔"

ہری دھن نے مسکرا کر کہا۔ "منگرو ان آموں میں جو سواد اور لذت ہے اور کہیں کے آموں میں نہیں ہے۔ گاؤں کا کیا رنگ ڈھنگ ہے۔"

منگرو۔ "سب چین ہے بھیا تم نے تو جیسے ناتا
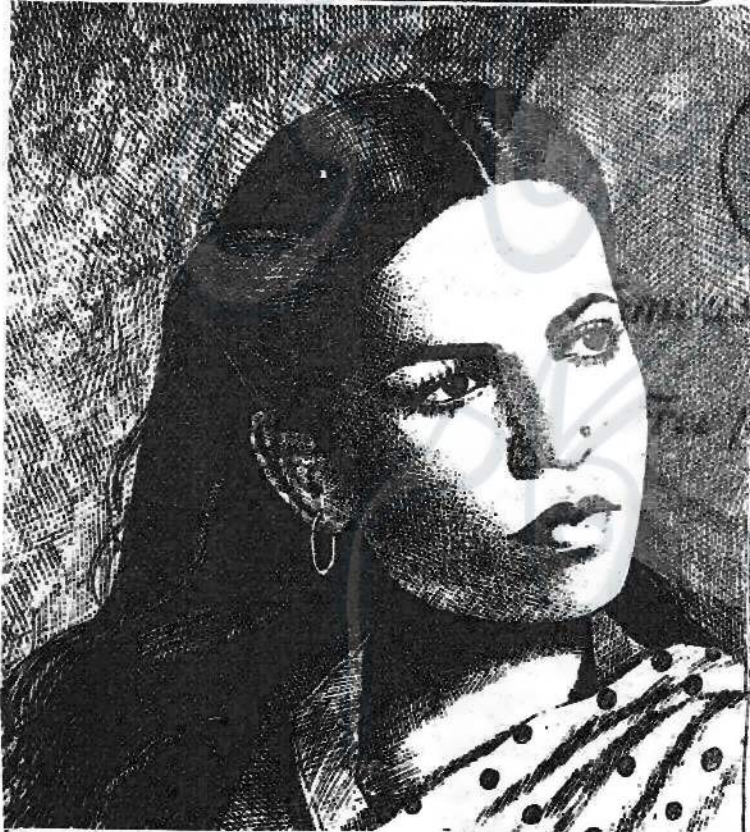
ہی توڑ دیا۔ اس طرح کوئی اپنا گاؤں گھر چھوڑ دیتا ہے۔ جب سے تمہارے دادا مرے ساری گرہستی چوٹ ہوگئی اور چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں ان کے کیا ہوتا ہے۔"

ہری دھن۔ "مجھے اب اس گرہستی سے کیا واسطہ ہے؟ بھائی میں تو اپنا لے دے چکا۔ مجوری تو ملے گی نا۔ تمہاری گیا (گائیں) میں ہی چرایا کروں گا مجھے کھانے کو دے دینا۔"

منگرو نے شک کے لہجہ میں کہا، "ارے بھیا کیسی باتیں کرتے ہو؟ تمہارے لئے جان تک حاضر ہے۔ کیا سسرال میں نہ رہو گے؟ کوئی چنتا نہیں، پہلے تو تمہارا ہی گھر ہے اسے سنبھالو۔ چھوٹے بچے ہیں۔ ان کو پالو۔ تم نئی اماں سے نا یک (ناحق) ڈرتے تھے بڑی سیدھی ہیں بچاری، بس اپنی ماں ہی سمجھو، تمہیں پا کر تو نہال ہو جائیں گی، اچھا گھر والی کو بھی تو لاؤ گے؟"

ہری دھن۔ "اس کا منہ اب نہ دیکھوں گا میرے لیے وہ مرگئی۔"

منگرو۔ "تو دوسری سگائی ہو جائے گی۔ اب کے ایسی عورت لا دوں گا کہ اس کے پیر دھو کر پیو گے۔ پر کہیں پہلی آ گئی تو؟"

ہری دھن۔ "وہ نہ آئے گی۔"

ہری دھن اپنے گھر پہنچا تو دونوں بھائی بھائی کہتے ہوئے اندر دوڑے گئے اور ماں کو خبر دی۔ اس گھر میں قدم رکھتے ہی ہری دھن کو ایسے دلی سکون کا احساس ہوا گویا وہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ اتنے دن ٹھوکریں کھانے سے اس کا دل نرم ہو گیا تھا۔ جہاں پہلے گھمنڈ تھا، ضد تھی، شیخی تھی، وہاں اب مایوسی تھی شکست تھی اور طلب تھی۔ مرض کا زور گھٹ چلا تھا۔ اب اس پر معمولی دوا بھی اثر کر سکتی تھی۔ قلعہ کی دیواروں میں سوراخ ہو گئے تھے، اب اس میں داخل ہو جانا مشکل نہ تھا۔ وہی گھر جس سے وہ ایک دن برداشتہ خاطر ہو چکا تھا۔ اب آغوش کھولے ہوئے اسے پناہ دینے کے لئے تیار تھا۔ بے یارو مددگار ہری دھن اس سہارے کو پا کر بالکل مطمئن ہو گیا۔

شام کو اس کی سوتیلی ماں نے کہا۔ "بیٹا تم گھر آ گئے۔ ہمارا دھینہ بھاگ، اب ان بچوں کو پالو، ماں کا ناتا نہ سہی، باپ کا ناتا تو ہے۔ مجھے ایک روٹی دے دینا کھا کر ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔ تمہاری اماں سے بہن کا ناتا ہے۔ اس ناتے بھی تم میرے لڑکے ہی ہوتے ہو۔"

ماں کے لئے ترسنے والے ہری دھن کو سوتیلی ماں کے روپ میں اپنی ہی ماں کا درشن ہوا۔ گھر کے ایک ایک گوشے میں ماں کی یاد کا جلوہ چاندنی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہی سوتیلی ماں کے چہرے پر نظر آ رہا تھا۔

دوسرے روز ہری دھن پھر کندھے پر ہل رکھے ہوئے کھیت کو چلا، اس کے چہرے پر خوشی تھی اور آنکھوں میں غرور تھا۔ اب وہ کسی کا سہارا لینے والا نہیں بلکہ سہارا دینے والا تھا کسی کے در کا بھکاری نہیں بلکہ اپنے گھر کا نگہبان تھا۔

ایک روز اس نے سنا کہ گمانی نے دوسرا شوہر کر لیا۔ وہ ماں سے بولا "تم نے سنا کاکی گمانی نے دوسرا گھر بسا لیا۔"

کاکی نے کہا۔ "گھر کیا کرے گی ٹھٹھا ہے۔ برادری میں ایسا اندھیر، پنچایت نہیں عدالت تو ہے۔"

ہری نے کہا۔ "نہیں کاکی بہت اچھا ہوا، لاؤ مہابیر سوامی کو لڈو چڑھاؤں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ میرے گلے نہ آ پڑے۔ بھگوان نے میری سن لی، میں وہاں سے اپنے من میں ٹھان کر چلا تھا کہ اب کبھی اس کا منہ نہ دیکھوں گا۔"

☆☆☆☆

یار میرا ہنسدا روے

عالیہ حرا

وہ عجلت میں جسے روشنی سمجھا
وہ آگ بن کر اسے جلا گئی
زندگی کے آلاؤ میں دہکتے
عاقبت نااندیش کی کہانی

ان لوگوں کے لیے بہ طور خاص جو ہر چمکتی شے کو سونا سمجھتے ہیں

ہجر کی شام دھیان میں رکھنا
اک دیا بھی مکان میں رکھنا

"میں غزل کہکشاں بقائمی ہوش وحواس اپنے شوہر ندیم مرتضٰی کو دوسری شادی کی اجازت دے رہی ہوں۔"
سفید کاغذ پر مکمل تحریر پڑھ کر ندیم نے خالی بیڈروم پر نگاہ کی۔

انہہ......تم سے اجازت کس نے مانگی ہے......بیڈ پر گر گیا۔

تم نے مجھے دیا ہی کیا ہے نہ دولت نہ بچے، نہ کوئی اچھی نوکری۔ جانے کیا دیکھ کر کیا سوچ کر میں نے شادی کرلی تھی۔

ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا۔
یہ امی کی جذباتی بلیک میلنگ، خاندانی رشتے، خانہ جنگی تھی جس نے میری زندگی برباد کر دی۔ مجھے ہر حال میں اپنی پسند کی زندگی گزارنی ہے معیار زندگی بلند کرنا ہے۔ یہ میرا عہد ہے اپنے ساتھ۔
خوش آئند خواب اس کی آنکھوں میں تھے......جس کی چمک سے اس کا وجود تابناک ہو رہا تھا۔

O........O........O

تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ دریہ نے خشگی سے انداز میں غزل کو دیکھا......جو ادائے بے نیازی کی تصویر بنی آٹا گوندھ رہی تھی۔

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"اور اگر ندیم بھائی نے کرلی تو......"

"تو کرنے کے لیے ہی تو دی ہے اجازت ......دریہ۔ مجھے کوئی کام بھی چوری چھپے نہیں کرنا......اور نا ہی میری وجہ سے کسی کا کام رکنا چاہیے۔ یہ ازدواجی زندگی کے سودے زبردستی کے نہیں ہوتے ...... دریہ نے آٹا گوندھ کر پلاسٹک کے باؤل میں رکھ کر ڈھکن لگایا اور ہاتھ دھونے لگی۔

"اس کا انجام جانتی ہو؟"

"سوتن کا سامنا!" ...... مسکرائی ...... اور مسکراہٹ میں جو حزن تھا وہ صرف اہل درد ہی محسوس کرسکتے ہیں۔

نہیں! ہاتھ کٹانا......ہر چیز سے ...... ہاتھ دھونا ......غزل نے مڑ کر اسے دیکھا۔
اگر میں اجازت نہ دیتی تو معلوم ہے کیا ہوتا......
کچن پر طائرانہ نگاہ ڈال کر باہر آگئی۔
گھر سے بے دخلی کا نوٹس......اس نے تخت پر بیٹھ کر دریہ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
اور یہ گھر مجھے کتنا عزیز ہے اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں ہے۔ یہ میرے خوابوں کا گھروندہ ہے۔ میرے خواب، میرے ارمان ...... میری خواہش اس نے محبت سے صحن میں لگے املتاس کے درخت کو دیکھا۔ جامن کے پیڑ پر چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا صاف ستھرے صحن کے کنارے کنارے کیاریاں بنی تھیں ایک کیاری میں پھول دوسری میں موسم کے لحاظ سے سبزیاں لگی تھیں۔ دھنیا، پودینہ، ہری مرچ اور لیموں ...... ساتھ ہی تری کی بیل نے دیوار پر ہریالی پھیلا دی تھی۔ دوسرے کنارے پر انگور کی بیل پھیل رہی تھی۔ یہ شوق پھپھو اور اس کا مشترکہ تھا۔
املتاس کے درخت کے پاس دیوار میں آسٹریلین طوطوں کے لیے پنجرہ بنا ہوا تھا۔ صبح کے وقت چڑیوں کے جواب میں بولتے وہ بہت اچھے لگتے تھے۔
اور......غزل نے گہرا سانس لے کر دریہ کو دیکھا۔
اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے۔
"کوئی نہیں مرتا کسی کے لیے......انہہ......تمہیں اپنے قدموں کو مضبوط رکھنا چاہیے۔ اولاد اگر نہیں ہے تو اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ وہ اپنا ٹیسٹ بھی کرواتے۔ نوکری نہ ملنا اس کا مسئلہ ہے تمہارا نہیں۔ تم نوکری نہیں ڈھونڈ رہیں ...... تمہیں اپنے پر کاٹنے کے بجائے انہیں سمجھانا چاہیے۔
"جو سمجھانے کی حد پار کرچکا ہو اسے نہیں سمجھایا جا سکتا......" اس نے ہار مان لی تھی۔
تم نے کتنی آسانی سے اپنا حق چھوڑ دیا۔

نہیں آسانی سے نہیں دل پر پتھر رکھا ہے اور دریہ ......حق مجھے ملا ہی کب ہے جو میں چھوڑوں!!......قسمت نے اگر ہمیں زبردستی کے بندھن میں باندھ دیا ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔
"اپنا حق چھوڑا نہیں ہے میں نے محفوظ کرلیا ہے۔
وہ پاؤں اوپر کر کے ایزی ہوئی اور کشن گود میں رکھ لیا۔
تم قدیم زمانے کی روایات اختیار کیے ہوئے ہو جب شوہر کی خاطر جان بھی قربان کر دی جاتی تھی مگر اب وہ دور نہیں ہے غزل اب اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو چھکے چھڑا دیتی ندیم بھائی کے سیدھی عدالت میں جاتی اب تو حقوق نسواں کا بل بھی پاس ہو گیا ہے اچھی طرح سے انہیں پتہ لگ جاتا غزل اس کی جی داری پر مسکرا دی۔
واقعی وہ کرسکتی تھی ایسا مگر اس میں ہمت تھی نا حوصلہ اور پھر جن سے محبت کی جائے ان کے مقابل نہیں کھڑا ہوا جاتا۔
اس کی محبت کا نظریہ ہی الگ تھا۔
یہ بات ہر کوئی نہیں جان سکتا۔
"غزل میں تمہیں یہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ ہم ایک دوسرے کی کزن ہی نہیں بہترین دوست بھی ہیں مجھے حق دوستی ادا کرنا ہے۔
دریہ نے مضبوط لہجے میں کہا اور جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ غزل سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔
اور مجھے حیرت ہے ماموں ممانی خاموش کیوں ہیں۔ کوئی ایکشن کیوں نہیں لے رہے۔ تمہاری زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے۔ میں بتا دوں گی ندیم بھائی کو اس نے غصیلی نگاہ ڈالی۔
دریہ کا انداز محبت اس کی قدر و منزلت میں اضافہ کرتا رہا۔
کہاں گئے ہیں سب گھر والے؟

بڑے ابا کے گھر آج سب کی دعوت ہے نا......اور بھابی!!......
میکے......اس کی نگاہ املتاس کے درخت پر ٹھہر گئی۔
تم میکے نہیں جاسکتیں یا تمہارے پاؤں قید کیے ہوئے ہیں وہاں کوئی نہیں ہے کیا ایک چچی کے انتقال سے سب در بند ہو گئے ہیں۔ دریہ کو ایک بار پھر غزل پر غصہ آنے لگا۔
کچھ لوگوں کی قسمت ہوتی ہی مظلوم ہے اور کچھ لوگ خود ہی بنا لیتے ہیں۔
غزل یوں مسکرائی کہ اس کی پلکوں کو سطح بھیگ رہی تھی۔
مردتم!...... پاؤں پٹخ کر وہ روش کی جانب بڑھی اور تیز تیز چلتی بڑے گیٹ کے داخلی دروازے سے باہر نکل گئی۔
غزل گم سم بیٹھی رہی۔
دریہ ماؤں کے مرنے کے بعد گھر ہی نہیں دل بھی ویران ہو جاتے ہیں۔ ابھی بھابھیاں بہت اچھی ہیں مگر وہاں جا کر اگر ڈیرہ ڈال لوں تو وجہ قیام جان کر ان کے انداز بدل جائیں گے۔ اس نے سوچا۔
پھر دھیرے سے اٹھی اور لان میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی دکھ دھیرے دھیرے وجود میں ہلکورے لے رہا تھا۔

پتھر مثال لوگ ہیں، گنبد مثال شہر
مشکل ہے ضبط، بات کرنا محال ہے

O........O........O

ندیم بڑے مصروف سے انداز میں تیار ہو رہا تھا کہ اس کا انٹرویو کامیاب گیا تھا اور کل اسے آفس جوائن کرلینا تھا۔ آج بلکہ ابھی کچھ دیر کے بعد۔ ہونٹوں پر چلتے میوزک کا دھیما سا ردھم تھا۔ چہرے پر نکھار تھا۔ اک خوشی کی سی کیفیت تھی۔
کچھ دیر کے بعد اس کی راحمہ سے ملاقات تھی۔
راحمہ جس نے اس کی زندگی بدل دی۔ بنجر زندگی میں جیسے

بہار آ گئی تھی۔
غزل سے شادی...... یہ احساس ہی کڑواہٹ لیے ہوتا۔
"اونہہ غزل سے شادی نہیں غزل سے زبردستی...... کی شادی۔
انہہ...... سر جھٹکا۔
امی کو بھی پتہ چلنا چاہیے کہ اپنی شاعرہ بھتیجی کو لا کر کیا غلطی کی ہے۔
قدآور شیشے پر نگاہ ڈال کر باہر آ گیا۔
کدھر کی تیاری ہے۔ امی نے راستہ روک لیا۔
میرا آفس میں پہلا دن ہے۔ کچھ شاپنگ کرنے جا رہا ہوں۔ تو پھر نوکری کر رہے ہو۔
ہوں...... ریموٹ اٹھا کر چینل چیک کرنے لگا۔
غزل ٹرے میں اورنج جوس رکھے اندر آ گئی......
ندیم نے اسے درخور اعتنا نہیں جانا۔
باوجود میری ناپسندیدگی کے۔
امی! اس نے زچ ہو کر انہیں دیکھا۔
اتنے عرصے بعد مجھے گولڈن چانس ملا ہے میں انکار نہیں کر سکتا یہ ہی میری منزل ہے۔
نہیں یہ تمہاری منزل نہیں ہے۔ لالچ طمع جس میں شامل ہو وہاں منزلیں قیام نہیں کرتیں ندیم!
"دفع ہو جاؤ یہاں سے...... ماں کا غصہ ندیم نے غزل پر نکالا اور اپنی جانب بڑھاتی جوس کا گلاس جھٹک دیا۔
یہ کیا بے ہودگی ہے۔ آمنہ بیگم حیران رہ گئیں۔
"امی بیگم!...... یہ ہی میری منزل ہے۔ مجھے بہت آگے جانے دیں۔ رزق روٹی اگر بیوی کے نصیب سے ملتی ہے تو ایک بار میرا نصیب آپ نے آزما لیا ہے دوسرا مجھے آزما لینے دیں۔ اسلام میں چار جائز ہیں۔
اس کے بعد وہ رکا نہیں باہر نکل گیا۔
امی نے گہرا سانس لے کر غزل کو دیکھا اس کے چہرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ دل جمعی کے ساتھ وہ چینل چینج کر رہی تھی۔
"تو کچھ بولتی کیوں نہیں ہے کیوں نہیں اس پر پہرہ بٹھاتی۔"
پھپھو نے اس نے ہتھیلیوں پر نگاہ کی۔
"میں کچھ نہیں بولوں گی اور آپ بھی انہیں کچھ مت کہیے بس انہیں جانے دیجیے!
ان راہوں پر جو وہ اپنے لیے منتخب کر چکے ہیں گھر محبت سے بنتے ہیں جبر مسلسل سے نہیں۔
"تو بیوی ہے اس کی۔" پھوپو نے اسے یاد دلایا۔
"زبردستی کے سودے کو وہ نہیں جانتے۔" اس نے متانت سے جواب دیا۔
"تو...... تو جانتی ہے نا...... آمنہ غفار کو بھی غصہ آ رہا تھا۔ اس نے گہرا سانس بھرا۔
باسی اور برفیلی محبت اک پہر بننے لگی سب محبت کا ایک پہر ہے۔
پھپھو میں جانتی نہ تو رہتی کیسے مجھے بھیک میں ملی محبت نہیں چاہیے۔
"چلا جائے گا وہ۔" انہیں غصہ آ گیا۔
"جانے دیں میں زبردستی کی قائل نہیں۔"
میں نے اجازت دے دی ہے شادی کی لکھ کر۔
"ہا...... ہاہ......" آمنہ غفار کا سانس رکنے لگا۔
"اور میں اترن بھی نہیں پہنوں گی۔"
اس کے بعد وہ رکی نہیں کمرے سے باہر نکل گئی۔
گہرے رنج والم کے بادل اس کے اردگرد سایہ فگن تھے اور قسمت بھی عیار ساعتوں کی گرفت میں تھی۔
اسے مستجاب مناجات کی ضرورت تھی۔
اس کا دل گا رہا تھا۔
خدا نصیب کرے ان کو دائمی خوشیاں
عدم وہ لوگ جو ہم کو اداس رکھتے ہیں
دھیرے سے ٹی وی آف کیا۔ اپنی بوجھل پلکوں کو

دھیرے دھیرے پوروں سے دبایا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ پورے گھر میں ایک گہری خاموشی کا راج تھا۔ رات کا گہرا سناٹا۔ ہر سو پھیلا ہوا تھا۔
آج آنکھیں خوامخواہ بھیگ رہی تھیں۔
دریہ اور پھپھو مل کر اسے ہی موردالزام ٹھہرا رہی تھیں۔ یہ اس کی کمزوری ہے جو ندیم نے رسیاں تڑوا لی ہیں۔ کوئی یہ بات کیوں نہیں سمجھتا۔ کوئی بھی رشتہ زبردستی سے مشروط نہیں ہوتا۔ محبت نہ ہو تو حصول بیکار ہے۔ اسے آگے جانے دیں۔
"پھر تم خلع لے لو۔" یہ دریہ کا کہنا تھا۔
وہ دوٹوک ہی فیصلے کرتی تو ندیم بھائی کو یوں نہیں جانے دیتی۔ سزا دو انہیں جنہیں اتنی اچھی بیوی کی قدر نہیں ہے۔"
قدر تھی ہی کب جو وہ منزل بناتے۔ وہ تو بس اس دکھ میں مبتلا تھا کہ اس کے ساتھ زبردستی کی گئی ہے۔ غزل اسے پسند نہیں تھی۔ اس کے ستارے نہیں ملتے اور وہ کسی جوتشی سے مل کر آیا تھا اس نے کہا ہے کہ تمہاری بیوی تمہارے لیے بھاری ہے۔ دوسری شادی تمہارے لیے بہتر ہے۔"
اور وہ اب اپنے اس بلینک چیک کو کیش کرا رہا تھا۔
امیر کبیر راحمہ سے دوستی اسے راس آ گئی تھی۔ گویا اس کی قسمت بدل گئی تھی۔ دوستی۔ پھر محبت۔ اب اس کے پپا نے اپنے آفس میں پرکشش نوکری بھی دے دی تھی۔
اگلے ماہ وہ شادی رچانے جا رہا تھا۔ بڑے آرام سے اس نے ماں کو سمجھا دیا تھا۔ آپ اپنی پسند میں خوش اور میں اپنی پسند میں خوش۔ حساب برابر۔
ندیم کا غصہ، ضد، ہٹ دھرمی سے بتا بھی رہا تھا۔
پھر وہ کیسے بندھن باندھے؟ کس طرح روکے کہ اگلا جھٹکنا بھی جانتا ہے اور توڑ کر پھینکنا بھی۔
اور میرا ان کے درمیان محبت ہی نہیں تو ٹھہرنا کیسا اک پہر تھا محبت کا جو گزر گیا تھا۔
اور میرے لیے تو ندیم بس تم ہی تم ہو۔ میرے ندیم!
حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کر دیکھا تو سب خسارہ ہے
اور جب میرے دل سے محبت ختم ہو جائے گی تو رشتہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ ندیم کی لمحاتی محبت اس کے لیے ابدیت ہے۔
عورت زندگی میں محبت ایک ہی بار کرتی ہے اور سچے دل سے کرتی ہے۔ یہ وجہ تھی جو وہ ندیم کی راہ کی دھول نہیں بن رہی تھی۔
اور یہ بھی جانتی تھی کہ زبردستی کے سودے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے۔
سو...... اک گہرا سانس لے کر اس نے کشن پر سر رکھ لیا۔
اب ٹی وی لاؤنج میں اس کا بسیرا تھا۔ اس بات کا پتہ صرف ندیم کو تھا۔
پچھلے ہفتے سے وہ لاؤنج میں سو رہی تھی۔ یہ اک خاموش قدم تھا۔
ندیم نے روکا تھا نا پوچھا تھا۔
گویا منظر سے ہٹ گئی تھی اور دل سے دعا گو تھی۔
یار میرا وسدا روے!

O.......O.......O

ندیم کی جاب شروع ہو گئی تھی اور اک رونق سی اس کے چہرے پر تھی، تروتازہ، شاداب، فریش...... ہمہ وقت گنگناتا وہ اس کے وجود کو جیسے بھول چکا تھا۔
نادرہ بھابھی ذومعنی انداز سے یہ سب دیکھتی تھی۔
میرا میاں ایسا کرتا تو جیل میں بھجوا دیتی۔ آخر میری بھی کوئی عزت ہے گھر سے بھاگ کر نہیں آئی میں۔
اور وہ بس اک نگاہ دیکھ کر رہ جاتی۔
اس کی ذات کو کسی نے سمجھا ہی نہیں تھا۔ سب اسے ہی قصوروار سمجھتے تھے۔ وہ مرد تھا اس کی اکڑ پر تین بول سنا دیتا تو وہ کہاں جاتی۔ اس کی منزل کیا ہوتی!!!

جمال بھائی نے خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ ندیم اگرچہ گھر میں سب سے چھوٹا تھا مگر اکھڑ مزاج، ہٹ دھرم......اور خودسر تھا۔ یہ تو ان کے ستارے ملتے تھے یا پھر امی کی محبت اور احترام ندیم کے دل میں تھا جو یہ شادی ہوگئی۔

اور کیسے ہوئی......ندیم کو خود پر حیرت ہوا کرتی۔

وہ تو اسے ایک کزن کا درجہ دیتا تھا۔ بیوی کے عہدے پر کب فائز ہوگئی......اور پھر شانے اچکا کر سوچتا فائز ہی ہوئی ہے ناحقوق تو نہیں مانگ رہی۔ وہ اسے تیسرے درجے کا شہری سمجھنے لگا اور کچھ غزل بھی بڑھ کر مانگنا یا چھیننا نہیں جانتی تھی۔

O.......O.......O

تیزی سے نکلتا ندیم ایک دم سامنے سے آتی غزل سے ٹکرا گیا۔

کتنی دفعہ کہا ہے کہ میرے راستے میں مت آیا کرو......اندھی ہوگیا؟

آئی ایم ساری......وہ پہلو کترا کر گزر گئی۔

ندیم کیا بدتمیزی ہے یہ...... بادام کے درخت کے پاس کھڑی آمنہ بیگم کو یوں جھڑکنا بہت برا لگا۔

"بیوی ہے وہ تمہاری۔" انہوں نے اسے یاد دلایا۔

سمجھا کس نے ہے وہ صرف آپ کی بہو ہے۔ وہ بائیک باہر نکالنے لگا۔

انسان تو سمجھ سکتے ہو۔

تو میں نے کیا کہہ دیا ہے اسے بھی تو سمجھائیں آنکھیں کھول کر چلا کرے۔

بہت بدتمیز ہوگئے ہو تم ...... آمنہ بیگم کو اس کے رویے پر افسوس ہوا۔

جب والدین اولاد کو استعمال کریں، جذباتی بلیک میلنگ کریں تو اولاد کو حق ہے باغی، گستاخ اور بدتمیز ہونے کا۔ ہماری زندگی کا فیصلہ دوسرے کیسے کر سکتے ہیں۔

بائیک باہر نکالتے ہوئے غصے سے کہہ رہا تھا اور ندیم کی اکڑ پر آمنہ بیگم کو ملال ہو رہا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ماں باپ کی تمہاری نگاہ میں کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔

ندیم نے ایک نگاہ ماں کے پرملال چہرے پر ڈالی ہلکا سا افسوس ہوا۔ مگر خاموشی سے بائیک اسٹارٹ کر کے نکل گیا۔

بدظن باغی اور سرکش......ندیم کو کیا ہوگیا ہے۔ گیٹ بند کر کے وہ اندر آ گئیں۔ سبزی والا نکل گیا۔

غزل اتنی بری تو نہیں ہے اتنی پیاری، نیک اور اچھی عادتوں کی مالک ہے۔ سگھڑ سلیقہ مند، سادگی میں اتنی اچھی لگتی ہے نک سک سے تیار ہو جائے تو نگاہ ہی نہیں ہٹتی مگر یہ ندیم!!

جانے کیا سوچے بیٹھا ہے۔

ہر سوچ چہرہ تھے وہ تخت پر بیٹھ گئیں۔

صرف............شادی کیسے کر سکتا ہے وہ......ماں کو کیسے دکھ دے سکتا ہے۔ جانے انہیں کیسے یقین تھا ......مگر جانے کیوں دل کا ایک گوشہ لرز رہا تھا۔ اگر خودسر، اکڑ والے ندیم نے یہ قدم اٹھا لیا تو......ان کے اندر بے چینی سی تیرنے لگی۔ وہ آپا کو کیا منہ دکھائیں گے کس طرح سے غزل کا سامنا کریں گی؟

اس وقت کاریڈور دھوتی غزل نیچے آ رہی تھی، دوپٹہ سر پر باندھ کر آگے گرایا ہوا تھا۔ چہرے پر سادگی کی چمک، اوپر کو چڑھی شلوار......جس کے پائنچے بھیگے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں چھن چھن کرتی چوڑیاں، سیڑھیاں دھو کر اس نے پورا صحن دھو لیا۔ اسی پائپ سے کیاریوں میں پانی ڈالا۔ درختوں کے تنے بھی دھو ڈالے پائپ کی موٹی دھار سے گیٹ کو بھی دھو ڈالا۔

آدھا گھر اس نے سنبھالا ہوا تھا۔ بڑی بہو تو بچوں میں مصروف رہتی تھی۔ ساتھ انہیں بھی دیکھتی تھی۔

تبھی دروازہ کھول کر دریہ اندر آ گئی۔

آ......ہا......دھلائی ہو رہی ہے۔ غزل نے پائپ بند کر کے وائپر اٹھا لیا۔

ہاں......دھوپ ڈھلنے لگے تو دھلے ہوئے صحن اچھے لگتے ہیں۔

"تم گھر نہیں گئیں۔" اس کی صلح کن مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کا لٹھ مارا اور تخت پر مامی کے برابر بیٹھ گئی۔

"ہیں؟ گھر کون جا رہا ہے!" وہ حیران ہوئی۔

"تم......اور زبردستی جاؤ تاکہ ندیم بھائی کو تمہاری غیر موجودگی میں تمہارا احساس ہو۔"

ایک نگاہ پھپھو پر ڈال کر وہ اپنا کام کرنے لگی۔

پھپھو اسے زبردستی بھیجیں گھر فاران بھائی کہہ رہے ہیں ندیم ہر حال میں اپنی من مانی کر کے رہے گا۔ اب تو اس لڑکی کے ساتھ مسلسل دیکھے جا رہے ہیں۔ کل یہ دونوں سی ویو گئے ہوئے تھے۔ آمنہ غفار کا دل دہل گیا۔

غزل مصروف رہی مگر اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ تو اس کے خوف اندیشے واہمے سب سچ ہونے والے تھے!!!

"تم احتجاج کرو......حق لو...زبردستی کرو۔

غزل کا کام ختم ہوگیا تھا اب وہ دوپٹہ کھول کر چہرہ صاف کرتی اس کے مقابل آ گئی۔

چائے لوگی۔

"دفع ہو جاؤ تم یہاں سے چائے پی پی کر تو یہ حال کر لیا ہے۔

آپ......!اس نے پھوپھو سے پوچھا۔

انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

تم ادھر بیٹھو......غزل کا ہاتھ کھینچ کر اپنے مقابل بٹھا لیا تم گھر جاؤ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر تمہاری کشش انہیں تمہارا حق یاد دلائے گی اور اگر انہوں نے بوریا بستر ہی گول کر دیا تو۔

کیا کہا تم منہ بگاڑ کر رہتی ہو! خود کو سنوارا کرو۔

سنگھار شوہر کے دل پر راج کرتا ہے۔ نک سک سے تیار عورت سورج کی طرح چمکتی ہے شوہر کو اس کے سامنے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ممانی اسے عقل کیوں نہیں آتی دریہ نے آمنہ بیگم کی جانب دیکھا جواب میں اک گہرا سانس لے کر وہ تسبیح کے دانے گرانے لگی تھیں۔

غزل نے اسے کہنی ماری......پھوپو بیٹھی ہیں۔

ہاں......انہوں نے ہی کہا ہے کہ تمہیں سمجھاؤں......کہ ندیم اس حرکت سے باز آ جائے......مگر تمہیں عقل نہیں آتی۔ ارے ایسے کم عقل مردوں کو عقل سکھانی پڑتی ہے۔ تین سال شادی کو ہوئے ہیں تمہیں نہیں ہو جائے گی اولاد بھی ان کی کونسی جائیدادیں رل رہی ہیں وارث کے لیے......دریہ کو غصہ آ رہا تھا۔

غزل کی آنکھ نم ہوئی مگر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ آنسو کس کو دکھائے کس کے لیے بہائے......ستم گر تو دل پر ستم ڈھانے کے تمام اسباب کر رہا تھا اور جب دل میں ہے ہی نہیں نوجوانی دل پر کیا اثر ڈالے گی۔

آمنہ بیگم آنکھ کے آنسو چھپانے کے لیے اندر چلی گئیں۔

یہ گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے۔ بھابھی میکے گئیں ہیں کیا۔ ہوں!

ان کے میکے کے بہت چکر لگنے لگے ہیں۔

ہوں!

خیریت تو ہے نا۔

اب کے وہ خاموشی سے والدان پر کھیلتی چڑیوں کو دیکھتی رہی۔

تو گویا ان کا بھی طوطی بول رہا ہے۔

ہاں۔ وہ کہتی ہیں کہ اوپر والا پورشن مجھے دے دیں۔

پھوپھو پریشان ہیں۔ کیسے دے دیں۔ نیچے کون رہے گا۔

واجد بھائی نے زہرہ بھابھی کے لیے ویزہ بھیج دیا ہے۔

پھپھو کیا کہتی ہیں۔

وہ کیا کہہ سکتی ہیں۔ اولاد کی رضا میں خوش ہیں۔

تو گویا وہ نادرہ بھابھی کو اوپر بھیج رہی ہیں اور ندیم بھائی کو شادی کی اجازت دے رہی ہیں۔

ندیم ...... کسی سے اجازت تو نہیں مانگ رہے۔ شادی کی۔ وہ تو کررہے ہیں۔ مظلوم ہیں تمام ظلم کا حساب لے رہے ہیں۔

تو تمہارا کیا ہوگا۔ ماں کیسے اکیلی رہیں گی سب انہیں چھوڑ کر جارہے ہیں۔ انہیں بھی تو ساتھ چاہیے نا۔ زندگی پر ان کا بھی تو حق ہے نا...... تو اس کے لیے تم قربانی دو گی۔" دریہ نے اسے گھورا۔

قربانی کیسی...... اس کی کٹیلی نگاہوں سے نظر چرالی۔

یہ تو میرا فرض ہے ان کی بہو ہی نہیں بھتیجی بھی تو ہوں۔

اور ...... ان کے بعد ...... کیا کرو گی ...... سفاک لفظوں سے سنگلاخ حقیقت کا احساس دلایا۔

دریہ ...... زندگی قربانی کے سہارے گزرتی ہے نہ ایثار کے سہارے بعض اوقات یہ جذبے کسی گنتی میں شمار نہیں ہوتے اور مرد کے بغیر معاشرہ عورت کو ہضم کرلیتا ہے۔ کب تک لڑو گی تم......"

"دریہ ...... مجھے اتنا مت سمجھاؤ کہ میں مرجاؤں۔ میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرے امی ابو نہیں ہیں جو میری طلاق کا گرہن چھپالیں۔ ندیم سے مجھے محبت ہے میں کیسے انہیں چھوڑ دوں!!

اور کون مجھے قبول کرے گا طلاق یافتہ کو۔ زندگی برباد تو ہے نا تو دل برباد کے ساتھ ہی سہی۔

صحن کی دیوار پر شام اترنے لگی...... درختوں پر پرندوں نے شور مچا رکھا تھا دھلے دھلائے صحن میں پتے اترنے لگے تھے ...... طوطے بھی سبک ہوا میں گہرے سانس لیتے شور مچارہے تھے۔

پھر ٹھیک ہے جو تم کررہی ہو کرو...... جو میرے اختیار میں ہے وہ میں کروں گی۔

چائے تو پی لو...... اسے کنواہوتے دیکھ کر اٹھی۔

بھاڑ میں ڈالو چائے۔ میں اس کنڈیشن میں چائے نہیں پی سکتی۔

لیمن جوس، اورنج جوس، یا جو تم پسند کرو۔

غزل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "دونوں نہیں۔" اس نے کہا اور باہر نکل گئی تب غزل کچن کی جانب بڑھ گئی اور جائے نماز پر بیٹھی آمنہ غفار آنسو ہی سمیٹے گئیں۔

O.......O.......O

امی، راحمہ کے پاپا نے مجھ سے شادی کی بات کی ہے۔ اگلے ماہ ہماری شادی ہے بس سادگی سے نکاح ہی ہوگا پھر ولیمہ کا ریسپشن ہے۔ ندیم بڑے عام سے انداز میں بتارہا تھا۔ آمنہ بیگم ساکت ہوگئیں۔

بھائی جان کو بتادیجئے گا۔

"تمہیں میرے کہے کی کوئی پرواہ نہیں۔"

وہ! ان کے سامنے آکر بیٹھا۔

امی ہمیشہ میں نے آپ کی پرواہ کی ہے مگر اس وقت میرا شاندار مستقبل میرے سامنے ہے۔ کتنے سالوں سے بیروزگار ہوں۔ چھوٹی موٹی نوکریوں سے مستقبل نہیں سنورتے۔ میں اور راحمہ شادی کے بعد امریکہ چلے جائیں گے۔ ان کا وہاں بھی بزنس ہے۔

میں آپ کو بھی جلد بلوالوں گا...... انہیں دلاسہ دیا لمحہ بھر کو رک کر سر اٹھایا۔

میں غزل کو طلاق دے دوں گا۔ وہ بھی اپنی پسند سے زندگی گزارے اور باہر دیوار کے ساتھ لگی غزل کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

جس کی خاطر زندگی تیاگنے کی بات کرہی تھی وہ کیسے اسے اپنی زندگی سے نکال رہا تھا۔

ندیم میری زندگی میں یہ نہیں ہوسکتا۔ پھپھو کی آواز سردی لگی۔

کمرے میں گہری خاموشی تھی۔

امی میں فیصلہ کرچکا ہوں اب جذباتی طور پر میں بلیک میل ہوچکا ہوں اب اور نہیں ہوسکتا ندیم کا انداز دو

خود انحصاری اور افواجِ پاکستان
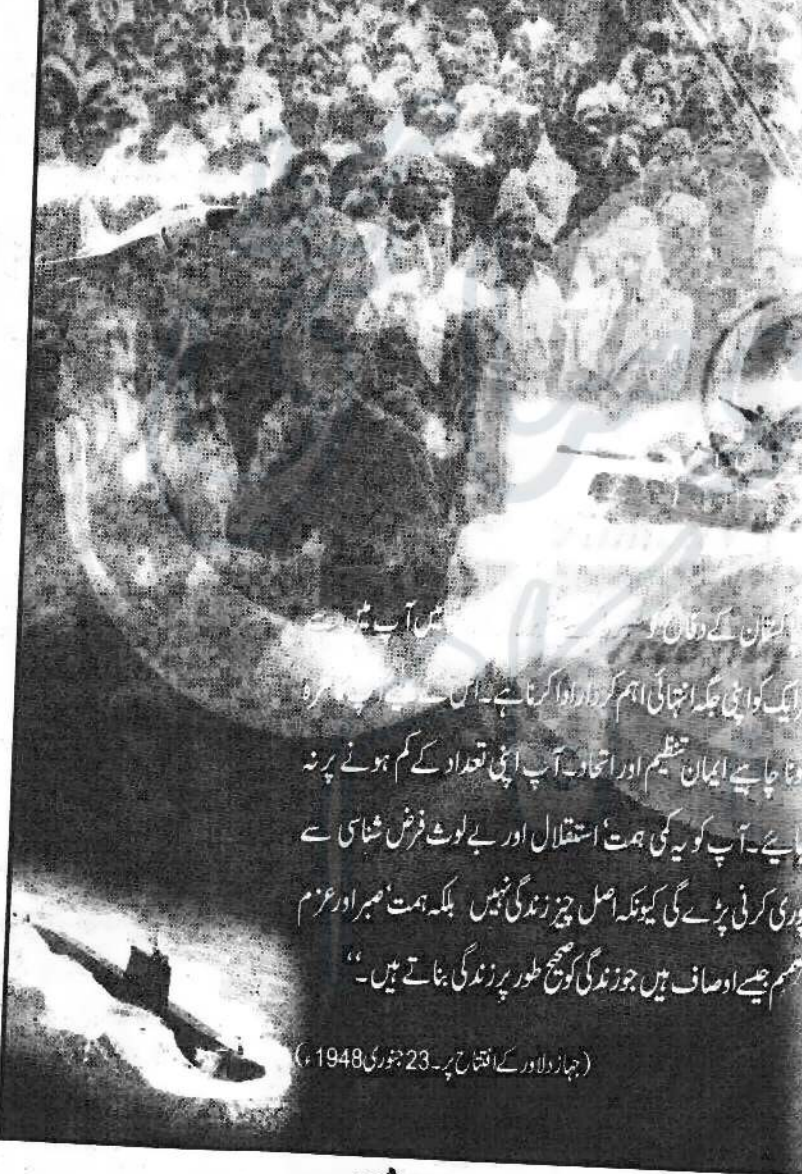
...کستان کے دفاع ... ہیں آپ ...

ہر ایک کو اپنی جگہ انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے۔ ... ہونا چاہیے ایمان تنظیم اور اتحاد۔ آپ اپنی تعداد کے کم ہونے پر نہ جائیے۔ آپ کو یہ کمی ہمت' استقلال اور بے لوث فرض شناسی سے پوری کرنی پڑے گی کیونکہ اصل چیز زندگی نہیں بلکہ ہمت' صبر اور عزم صمیم جیسے اوصاف ہیں جو زندگی کو صحیح طور پر زندگی بناتے ہیں۔"

(جہاز دلاور کے افتتاح پر۔ 23 جنوری 1948ء)

ٹوک تھا۔

ٹھیک ہے تم میری زندگی سے ہی نہیں اس گھر سے بھی نکل جاؤ۔

غزل سسک اٹھی۔

میں اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔

لہجے کی خودغرضانہ بو...... ادھر ادھر پھیلنے لگی۔

غزل وہاں سے ہٹ کر کچن میں آ گئی۔

اس کی قسمت کا فیصلہ دوسروں کی توجہ کا مرہون منت تھا اور وہ دوسروں کے لیے مری جارہی تھی۔ سنک کا نل کھول کر وہ سسک اٹھی۔ اس کی سسکیوں کا شور پانی کے شور میں دب گیا تھا۔

O........O........O

گھر کا ماحول غیرمعمولی حد تک خاموش ہوگیا۔ جمال بھائی نے اوپر کے پورشن میں کام شروع کروالیا تھا۔ بھابھی میکے میں تھیں۔

ندیم کو منزل مل گئی تھی وہ اس پر بسیرا کرنے کے لیے پرجوش انداز میں سرگرم تھا۔ اسے مطلق پروا نہیں تھی کہ ماں کا کیا ردعمل ہے۔ غزل کے دل پر کیا بیت رہی ہے اور اسکے اس اقدام سے گھر کی فضا کتنی سوگوار ہے۔

آمنہ بیگم کے سجدے طویل دعائیں لمبی اور تسبیحات مسلسل ہونے لگیں۔ اک دل شکن چپ ان کے باطن سے لپٹ گئی۔

ان کی اولاد کتنی خودسر اور باغی نکلی...... سب کو اپنے مستقبل کی فکر تھی ان کے مطابق کوئی نہیں سوچ رہا تھا کیا ان کی واپسی کا سفر شروع ہوگیا تھا!!!

غزل کا دل غم سے بوجھل تھا اس کی دعائیں رائیگاں گئی تھیں۔ اسی لیے بے سروسامانی کی سی کیفیت میں ادھر سے ادھر پھرتی رہتی تھی۔

ندیم کے آگے نہ بولنے کا عہد کرلیا تھا۔

دریہ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اپنا راستہ بدل لیا تھا۔ کتنے دن ہوگئے تھے اسے آئے ہوئے نہ جانے اس کی طبیعت کیسی تھی۔

میکے سے کوئی آس و امید نہیں تھی۔ ابدال بھائی ادھر تھے ان کے ڈیوٹی ٹائمنگ بہت سخت تھے۔ بڑے بھائی جرمنی میں تھے انہیں حالات کی کیا خبر!! طیبہ باجی نوشہرہ میں ہوتیں تھیں لیکن سسرال کے جھمیلوں میں الجھی...... بچوں میں پھنسی۔ حالات کی تنگی سے اشک بار...... چھوٹی بہن کی پروا کیا کرتیں دل مطمئن تھا کہ گھر بسا ہوا ہے۔ اس نے بھی کبھی ہوا ہی نہیں لگنے دی۔

اور اب...... اب اگر اس کی ذات کا اشتہار بنے گا تو کیا ہوگا۔ وہ کدھر جائے گی۔ زندگی کے رنگ کیا ہوں گے۔

O........O........O

موسم بدل رہا تھا۔ گرمی کی حدت میں کمی ہونے لگی تھی۔ وہ صحن دھونے کے بعد بھی صحن میں ہی ادھر ادھر چکراتی رہتی۔

ندیم نے کتنے دن ہوگئے شکل ہی نہیں دکھائی شاید وہ بیوی کی جانب سے جہیز میں ملنے والا فلیٹ سنوار رہا تھا۔

اکثر غزل کو ندیم کی سوچ پر تاسف ہوتا۔ کاش وہ اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتا تو خدا بھی اس کی مدد کرتا۔ امیرزادی سے شادی کرکے تمام خوابوں کی تکمیل بے شک ہوجاتی...... مگر...... ذات کی تکمیل...... دوسروں کی زمین پر اپنی عمارت کیسے کھڑی کرسکتا ہے۔ کوئی دسرے کی چیز دوسروں کی بھی ہوتی ہے جانے کب گھر بدری کا نوٹس مل جائے۔ ایسے میں کوئی کیا کرے گا۔

"اللہ نہ کرے......" یہ سوچ کر اس کا دل دہل جاتا۔ میرے خواب بھلے چھن جائیں۔ اس کے خواب سلامت رکھنا۔

منیر اسی کو محبت کہا ہے لوگوں نے
کہ خون بن کے رگوں میں اتر گیا کوئی

دریہ ناراض تھی اس کا کہنا تھا اسے بھول کر قدم اٹھاؤ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ایسی محبت، محبت نہیں ہوتی جس کی شروعات خودغرضی سے ہو اور اس کا دکھ کوئی نہیں سمجھتا تھا۔

اور غزل نے خود پر خود ہی بدنصیبی کا لیبل لگا لیا تھا۔ گھر کی خاموشی کہر آلود فضا اور خزاں آلودگی میں وہ بھی اپنی سوچوں میں گم رہتی اوپر جمال کے حصے سے ٹھک ٹھک کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

اسی گھر کے مرد گھر سے، ماں سے، گھر والوں سے غافل ہوگئے تھے اور غفلت کی چادر اس سے اوڑھی نہیں جاتی تھی۔ اس کی پرورش خیال کی فضا میں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ کسی سے غفلت تو برت ہی نہیں سکتی تھی چہ جائیکہ اتنے قریبی و لی تعلق رشتوں سے بھرا ہے کسی سے گلہ تھا نہ شکوہ...... اس کی اللہ لوک سی کیفیت ہوتی جارہی تھی سو توقعات عبث تھیں۔

آمنہ بیگم اسے دیکھتی تو آنکھ بھر آتی۔ انہیں ندیم پر بے حد غصہ آتا۔

وہ تو گھر سے گویا فرار ہوگیا تھا۔

.........، جامن اور بادام کے خشک پتوں سے اٹا صحن صاف کرتے ہوئے جانے کیوں دل بھرنے لگتا۔

یہ قید اور اس کی صعوبتیں اسے کتنی عزیز تھیں کوئی اس کے دل سے پوچھتا اب تو خود دل چاہنے لگا تھا ندیم سے بات کرنے اسے کہے کہ تم سب کچھ کرلو مگر مجھے طلاق مت دو...... میرا کوئی ٹھکانہ تھا اور تمہاری ماں کی کوئی منزل نہیں ہم دونوں بے آسرا بے سائبان عورتوں کو اک چھت تلے رہنے دو...... اپنی ماں کے صدقے میرا مان رکھ لو۔ اک آندھی وجود میں چلنے لگی۔ دوسری آندھی نے گرد بار کے گولے اڑانے شروع کردیے۔ ہر چیز گرد آلود ہو رہی تھی ہوا کھڑکیوں دروازوں کے پٹ بج رہی تھی الگنی پر پھیلے کپڑے اڑنے لگے صحن میں اپتے ہی پتے ہونے لگے تخت پتوں سے بھر گیا۔

وہ برآمدے میں کھڑی دیکھتی رہی۔ پھوپھو اندر نماز پڑھ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے بکھرے کپڑے اٹھائے۔

پھپھو کا سوٹ، اس کا دوپٹہ، تکیہ کے غلاف اور ندیم کی شرٹ اٹھائی۔ آج جانے کیوں اس کی دھلی ہوئی شرٹ کو دوبارہ دھو کر جانے کس جذبے کی تسکین کی تھی۔ شرٹ پر مٹی لگ گئی تھی۔ دھیرے دھیرے جھاڑنے لگی۔ دوبارہ دھونے کی ضرورت تھی۔

کپڑے تہہ کرکے الماری میں رکھے اور شرٹ لے کر واش روم میں چلی گئی...... خوامخواہ ہی کتنی دیر تک دھوتی رہی آنسو بہتے رہے آج جانے کیوں دل بھرایا تھا۔ جذبوں کے رائیگاں جانے کا دکھ تو شدت سے تھا ہی مگر ساتھ ہی کچھ ہونے کا احساس بھی دل کو لہو رنگ کررہا تھا۔

وہ کتنی دیر تک شرٹ دھوتی رہی۔ ہینگر پر لٹکا کر باہر نکلی۔

دوسرے لمحے چونکی اور بھاگ کر بالکونی میں آئی۔ بادل سے زور سے گرجے اور پھر برستے ہی چلے گئے۔

ابھی گرد آلو ہوائیں تھیں اب جل تھل سماں ہو رہا تھا۔

محبوب کی خوشی کے لیے اجازت تو دے دی تھی شادی کی مگر اس کا دل...... خود اب اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔

بادل گرج گرج کر برس رہے تھے...... یوں لگا کہ آسمان بھی اس کے ساتھ رو رہا ہے اس کے دکھ پر نوحہ کناں ہو۔

دریچے سے لگ کر سوگوار اداس دیکھتی رہی موسلادھار بارش اور اس کا شور تبھی باہر گیٹ پر تیز روشنی ہوئی۔

ندیم کی گاڑی؟؟

آج کتنے دن بعد وہ گھر آیا تھا۔ جانے کدھر رہا تھا۔ حالانکہ پھپھو سے کہا بھی تھا کہ اپنا دل موم کرلیں مگر وہ بیٹے

کی رضا میں خوش نہ ہوئیں اور آج......!!

بائیک سے اتر کر اس نے گیٹ کھولا۔ گیٹ کھولتے ہوئے پورا بھیگ گیا۔ گیٹ اندر سے لاک تھا وہ خود کو سنبھال کر باہر نکلی...... برآمدے سے گزر کر صحن میں آئی اک پل میں وہ بھی بھیگ گئی...... بھاگ کر گیٹ کھول دیا۔

وہ اسے دیکھ کر چونکا...... مضمحل اداس رنجور بھیگی ہوئی۔

غزل......ایک دم سے ندیم کے دل کو کچھ ہوا۔

بائیک لے کر اندر آ گیا۔ غزل نے گیٹ بند کیا۔

بارش ایک ساتھ دونوں کو بھگو رہی تھی۔

سر جھکائے وہ اندر کی جانب بڑھ رہی تھی۔

محبت جذباتی ہوتی ہے اور جذباتیت سوائے نقصان کے کچھ نہیں دیتی خسارہ حصے میں آتا ہے۔

اور کیا وہ خوش قسمت ہے لاحاصل محبت کے پیچھے خوار ہو رہا تھا اور خسارہ حصے میں آنے سے پہلے سنبھل گیا۔

کچن کی پیلی زرد روشنی صحن میں پھیلی تھی بارش کا شور متواتر ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ پلٹے بغیر آگے جا کر گم ہو گئی اندر کسی کمرے میں لاؤنج میں کسی تنہا گوشے میں۔

رنج نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ بائیک کھڑی کر کے وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

دل دکھ سے بوجھل تھا۔ بارش اسے بھگو رہی تھی۔

ناقدری دل کے احساس پر آنکھ بھرنے لگی۔

دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔

کیسی تلخ حقیقت سے سامنا ہوا تھا۔ درد دل کو چھو رہا تھا۔ یہ......یہ دل دکھانے کی سزا ہے۔ امی کا......غزل کا ......پیارے رشتے کا۔

غزل میں کس بات کی کمی تھی حسن سادگی، محبت، وفا ......راحمہ میں کیا تھا۔ دولت، امارت، فخر غرور......

اپنی چیز اپنی ہوتی ہے۔ دوسروں کی کب اپنی ہو سکتی ہے۔

یہ اس کا لالچ، طمع، حسد، رقابت تھی۔ اس کی کمزوریوں سے دوسروں نے فائدہ اٹھایا...... اور دوسرے فائدہ جب ہی اٹھاتے ہیں جب ہم اپنی کمزوریاں دوسروں کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں۔

اور یہ ہماری کوتاہیاں ہوتی ہیں۔

کیا نہیں تھا اس گھر میں۔ عشرت، وفا، محبت، سکون، آسائشیں......اپنا گھر اپنی چھت۔ اپنا پن۔ ندیم نے سر اٹھایا۔ بارش کی بوندیں نوکیلے پتھروں کی طرح چہرے پر پڑنے لگیں۔

ویل آف۔ شاندار گھر، قیمتی گاڑی، پرکشش جاب۔

اس کے پاس گھر بھی تھا، اچھی جاب بھی تھی، گاڑی نہیں تھی تو کیا ہوا......بائیک تو تھی...... پیدل تو نہیں تھا۔

بھیگتا رہا......دل مچلتا رہا...... ماں کے دامن میں چھپ کر رونے کی خواہش ہو رہی تھی کتنا دل دکھایا تھا ماں کا......

محبت وفا کی دیوی......غزل کا......

اسے کس محبت کی تلاش تھی......اور کیسی محبت ہوتی ہے......ندیم......!!!

محبت مطلوب بن کر ملی بھی تو......گند و غلاظت میں لتھڑی ہوئی۔

اُف......اس کا پور...... پور لرز گیا۔

کسی دعا......کسی نیکی نے بچایا تھا۔

آج اس پر کیسی قیامت آشکار ہوئی تھی۔ کل......کل اگر آ کر گزر جاتی تو کیا ہوتا۔

وہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔

بادل زور سے گرجے اور موسلا دھار بارش مسلسل برسنے لگی۔

وہ جی بھر کر اپنا کتھارس کر رہا تھا۔

وہاں سے اٹھا......اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر

آ گیا۔

سیاہ گھور...... اندھیرا...... برستی بارش...... منڈیر سے لگ کر بازوؤں پر چہرہ رکھ کر باہر دیکھا۔ گلی میں بارش کا پانی جمع ہو کر بہہ رہا تھا۔

گھروں کی بتیاں جلی ہوئی تھیں۔

رات کا جانے کون سا پہر بھیگتا برستا گزر رہا تھا۔

اس میں ہمت ہی نہیں تھی اندر آنے کی......

جانے کس حوصلے سے اس شدت کرب کو برداشت کر رہا تھا۔ جیسے سماعتوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا گیا ہو۔

جیسے......آری سے وجود کو کاٹ دیا گیا ہو۔

جیسے کند چھری نے ذبح کر دیا گیا ہو......

محبت اتنی غلیظ گندی اور ریاکار ہو سکتی ہے۔

اس نے تو ٹوٹ کر راحمہ کو چاہا تھا......اور راحمہ امیر لوگوں کی غلاظت......

اُف......ندامت کا پسینہ اندر گرنے لگا۔

وہ اسے ''استعمال'' کر رہی تھی۔ اپنے ''مفاد'' کے لیے...... اپنی غرض کے لیے...... اپنے لالچ کے لیے......

اگر وہ فون نہ سن لیتا تو......

پلیز حمزہ!......صبر کرو نا......بس تھوڑے عرصے کے بات ہے کل نکاح ہے میرا ندیم کے ساتھ پھر میں طلاق لے لوں گی کسی بہانے سے......بہانے بہت، تم فکر مت کرو......عدت گزار کر پھر ہمارا نکاح ہوگا......

ہا...... ہا...... ہا......وہ غریب بندہ......نہیں وہ کیا کہے گا......وہ تو لالچی ہے ایک اچھی جاب اور گاڑی کی خواہش کا مارا ہوا......کیا کہہ سکتا ہے بول سکتا ہے......

راحمہ ربانی کے آگے میرے پاپا اس کا سر کچل دیں گے۔

حلالہ کے لیے اس سے بہتر شخص مل ہی نہیں سکتا تھا۔

حلالہ!!!......ندیم کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کی محبت اسے ''حلالے'' کے لیے استعمال کر رہی تھی۔

اُف!!......اس کے سر پر بم پھٹا تھا۔

اس کی محبت خود غرضی کا لبادہ اوڑھے تھی۔ راحمہ شادی شدہ تھی یہ احساس ہی سوہان روح تھا۔

اس شادی کے بعد اس کی کیا حیثیت ہوئی......اگر وہ راحمہ کو طلاق نہ دیتا تو وہ خلع لینے کا حق رکھتی تھی وقت اور اختیار اس کی مٹھی میں تھا۔

وہ آفس سے نکل آیا تھا۔ باہر گرد آلود آندھی ایسی چل رہی تھی جیسی اس کے اندر۔

جانے کب تک وہ سڑکوں پر آوارہ پھرتا رہا......

وہاں تک کہ بادل زور سے آپس میں ٹکرائے بجلی کوندی اور......موسلا دھار بارش نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کہاں جائے......فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا سوچتا رہا۔

گھر......مگر کون سے گھر اس نے گھر بننے کب دیا تھا۔ وہ تو مکان تھا۔ مرد کی مردانگی کو تو اس نے سمیٹ لیا تھا۔ وہ تنہا، مجبور اور بے بس عورتوں کا مکان تھا۔ اگر وہ چلا جاتا تو وہ عورتیں کس طرح رہتیں۔ بھائی جان بھی جا رہے تھے۔ جمال بھائی اوپر شفٹ ہو رہے تھے۔ اس نے اپنی ذات کو سمیٹ لیا تھا۔

پھر گھر......گھر کہاں رہا تھا۔

پشیمانی کے بادل اس پر برس رہے تھے۔

گھر جانا تھا وہ گھر کی راہ پر ہو لیا تھا۔

تو کیا صبح کا بھولا گھر لوٹ آیا تھا۔ بھیگنے سے اس کے ہاتھ پاؤں سفید ہو گئے۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں، جوتے اتار دیے، شرٹ کے بٹن کھول دیے۔ فگار سینے پر ٹھنڈک کی بوندیں پڑنے لگیں۔

ہاں صبح کا بھولا......گھر لوٹ آیا تھا۔ صحیح و سالم......مکمل پورے کا پورا......غلطیوں سے بچ بچا کر۔

آج بارش زور سے اور کھل کر برس رہی تھی۔ شاید موسم کی پہلی بارش یونہی برسا کرتی ہے۔ غزل کچن میں کھڑی تھی۔ گھر پر گہری خاموشی تھی۔ اس نے گہرا سانس

لے کر امی کے کمرے میں جھانکا۔

وہ بستر پر دراز تھیں۔ ان کا ایک بازو پھیلا ہوا تھا انگلیوں میں تسبیح کے دانے ساکت تھے وہ محوخواب تھیں۔

ماں کی دعا ماں کی فکر، ماں کے تفکر نے بچا لیا تھا۔

اس کی آنکھ نم ہوگئی۔ دھیرے سے پیروں کو چھوا اور باہر نکل گیا۔

برآمدے سے ہوکر کچن میں آ گیا۔

کچن کی کھڑکی کے پاس کھڑی وہ تیز بارش کی بوچھاڑ سے بھیگ رہی تھی۔ اس کی آنکھ سرخ اور بھیگی ہوئی تھیں۔

نظریں بادام کے درخت پر تھیں۔

الجھے بلوں والی لمبی سی چوٹی پشت پر پڑی ہوئی تھی۔ آنچل کا ایک کونا زمین کو چھو رہا تھا۔ جلتے چولہے پر سالن دھیمی آنچ پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے کھانے کے لیے انتظار کر رہی تھی۔

غزل!......اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہوا۔

بے اختیار پلٹی۔

مجھے کھانا نہیں کھانا ...... چائے بنا لو ...... بوسیدہ ......سر جھکائے دل کی زمین پر سوئی ہوئی محبت جھٹکا لے کر بیدار ہونے لگی۔

جی!......پہلو بچا کر نکلی اور چین میں پانی رکھنے لگی۔

دو کپ......وہ کچن شیلف سے پشت ٹکا کر سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا......اک نظر اٹھا کر دیکھا۔

دہرا تمہارے لیے ......وضاحت کی ......نظر ندیم پر ٹک گئی۔

اب تم میرا ساتھ دو گی ہر کام میں ...... ہر راستے پر ......ہر قدم پر...... ہاتھ بڑھا کر جھولتی لٹ کو پیچھے کیا۔

میں لوٹ آیا ہوں ......تمہارا ندیم بن کر...... مجھے قبول کر لوگی۔

غزل اسے دیکھتی رہ گئی۔

میں غلطی پر تھا۔ میری کوتاہیوں کو سمیٹ کر قبول کر لو گی......قریب آیا۔

تم میری غزل سرا ہو میں کیسے راستہ بھٹک سکتا تھا

آواز سرگوشی بن گئی۔ آنکھوں میں بے یقینی کے بادل تیرنے لگے۔

غزل ندیم نے کے ہاتھ تھام لیے اسے کھینچ کر خود سے لگا لیا۔

میں لوٹ آیا ہوں۔ مجھ سے مت پوچھنا کہ کیوں ......؟ مجھے تمہاری وفا، تمہاری محبت کھینچ لائی ہے۔ مجھ سے لوٹنے کی وضاحت مت مانگنا......دھیرے دھیرے اس کے بھیگے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا۔

مجھے معاف کر دو......!!!

غزل کی آنکھیں برسنے لگیں۔ اس کے لیے یہ ہی بہت تھا کہ وہ لوٹ آیا تھا...... کیوں لوٹا......اسے کیوں پوچھنا تھا۔

اس نے تو خدا سے بھی اسے نہیں مانگا تھا وہ تو اپنے ہمدم اپنے رفیق، اپنے ساتھی، اپنے نام کی وفا کو ہر دم مسکراتے دیکھنا چاہتی تھی۔ ندیم کے ہونٹوں کی ہنسی کتنی عزیز تھی کوئی اس کے دل سے پوچھتا......اپنے خون جگر سے اس کے جذبوں کی آبیاری کر رہی تھی۔

دھیرے سے سر اٹھایا۔

ندیم کی گہری سرخ آنکھیں بھیگیں پلکیں اس پر آویزاں تھیں۔

سچا، صاف ستھرا، گہرا، کسی کی اترن نہیں۔

غزل بھیگے چہرے سے مسکرا دی۔

بادل ایک بار پھر زور سے گرجے ...... اور برسنا شروع ہو گئے۔ موسم کی پہلی بارش شاید یونہی ٹوٹ ٹوٹ کر برستی ہے۔ صبح کا منظر کتنا صاف وشفاف ہوگا۔

صبح کا تصور ہی خوش کن تھا اور غزل کے چہرے کی وفا انگیز مسکان ندیم کے دل کا اطمان بن گئی۔ کچھ چہرے صرف ہمارے لیے ہوتے ہیں ہماری محبت ہوتے ہیں ہم انہیں بدلنے پر قادر نہیں۔

O......O......O

افسانہ

بڑی آرزو تھی ملاقات کی

شازیہ اعجاز شازی

کبھی کبھی اپنا ہی عکس انسان کو خود فریبی میں
مبتلا کر دیتا ہے اور فلیش سے پیدا ہونے والی تیز روشنی کچھ
یوں تسلی دیتی ہے کہ اب منظر واضح اور منزل سامنے ہے...............

اس لڑکی کی کہانی جو اک تصویر کو بنیاد بنا کر اپنی خوبصورتی پر نازاں تھی۔

پھر اک دن مجھے تم بھی اکیلا چھوڑ گئے
پھر اپنے پاس تو میں بھی نہ رکھ سکا خود کو

سیاہ بادلوں کی گھن گرج نے سب لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ آج کا پروگرام بارش کی نظر ہونے والا ہے مگر اس کے باوجود فوٹوگرافروں کی فلیش بار بار چمک رہی تھی۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا اور کالج کے اساتذہ آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارت میں لگے ہوئے تھے۔ پنکی بھی آرگنائزنگ کمیٹی میں شامل تھی۔ سینے پر کالج کا مونوگرام سجائے ہوئے وہ ادھر ادھر بھاگی پھر رہی تھی۔ اور جو کام اس کی نگاہوں میں آجاتا وہ کر رہی تھی کہ اچانک کسی کیمرے کی فلیش گن کی تیز لائٹ اس کے چہرے پر بھی پڑی اور وہ چونک گئی۔ اس نے پلٹ کر اس فوٹوگرافر کو دیکھا جس نے

اس کی تصویر بنائی تھی اور پھر یوسف کو دیکھ کر اس کے چہرے پر غصے کے رنگ لہرا گئے۔

یوسف اس کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک گھر میں رہتا تھا اور کالج آتے جاتے کتنی ہی بار اس سے سامنا ہو چکا تھا۔ دونوں کے درمیان سلام دعا کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن یوسف کے بارے میں کتنی ہی بار پنکی نے اس انداز میں سوچا تھا کہ جیسے یوسف خاص طور پر اس کے سامنے آتا ہو۔ اس نے پہلے بھی پنکی کی ایک ایسی تصویر بنائی تھی جس میں وہ بالکل الگ تھلگ تھی۔ پنکی غصے میں آگے بڑھی اور اس کے قریب پہنچ کر بولی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کیا تم نے مجھ سے تصویر اتارنے کی اجازت لی تھی۔؟"

"میڈم میں پریس فوٹو گرافر ہوں ہمیں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔" یوسف نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ہوں۔ پریس فوٹو گرافر۔" پنکی غصیلے لہجے میں بولی۔ "آپ چاہیں تو میرا کارڈ دیکھ سکتی ہیں۔" بہر حال پنکی کو غصے کے ساتھ حیرت بھی ہوئی تھی۔ بعد میں یوسف نے کہا۔

"اگر آپ میری اس بات سے ناراض ہیں تو میں آپ سے شرمندہ ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ یہ تصویر اپنے اخبار کو نہیں دوں گا۔"

"ایک بات سمجھ لیجیے مسٹر یوسف! اگر آپ نے میری تصویر اخبار میں چھاپی تو میں آپ کے خلاف کیس کر دوں گی۔"

"نہیں چھاپوں گا۔ آپ سے وعدہ کر چکا ہوں۔ لیکن اگر تصویر اچھی ہوئی تو ایک تصویر آپ کی نذر تو کر سکتا ہوں۔" یوسف نے ابھی تک پنکی کی کسی بات کا برا نہیں مانا تھا۔ "جی نہیں۔ مجھے نہیں چاہئے کوئی تصویر۔ آپ اس فلم کو جلا دیجئے جس میں میری یہ تصویر موجود ہے۔"

"یہ بہت مشکل کام ہے محترمہ! کیونکہ اس میں اور بھی بہت سی تصویریں ہیں ہاں! رول میں سے آپ کی تصویر نکال کر میں ضرور جلا دوں گا۔" یوسف نے کہا اور پھر لاپروائی سے آگے بڑھ گیا۔

پھر تین چار دن گزر گئے اور ایک دن اس وقت جب پنکی کالج کے گیٹ سے اندر جا رہی تھی۔ اسے یوسف نظر آیا۔ عام طور پر اسے وہ اس وقت نظر آتا تھا جب وہ گھر سے باہر نکل کر کالج جانے کے لئے چل پڑتی تھی۔ لیکن پچھلے چند روز سے وہ اسے نظر نہیں آیا۔ وہ جرأت مندانہ انداز میں آگے بڑھ کر بولا۔

"آپ کی تصویر اتنی اچھی بنی تھی۔ محترمہ! کہ میری ہمت نہیں ہوئی کہ میں تصویر جلا دوں البتہ یہ ایک فوٹو بنانے کے بعد میں نے نیگیٹو ضائع کر دیا ہے اور یہ ایک تصویر صرف آپ ہی کی نذر کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ مجھے معاف فرما دیجئے گا۔" اس نے تصویر آگے بڑھائی تو پنکی کا ہاتھ بے اختیار آگے بڑھ گیا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے اپنے آپ کو دیکھنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ پھر اس نے تصویر دیکھی اور اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تصویر اتنی خوبصورت ہو گی۔ یوسف اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے کیمرے کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ پنکی تصویر کو دیکھتی رہی، اس نے یوسف کی طرف توجہ بھی نہیں دی تھی۔ تصویر اس طرح اس کی نگاہوں میں کھب گئی تھی کہ اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر جب تصویر دیکھنے سے جی بھر گیا تو اس نے چونک کر یوسف پر نگاہیں ڈالیں۔ لیکن وہ تو جا چکا تھا۔

پنکی اپنی تصویر دیکھ کر حیران رہ گئی...... اتنی خوبصورت تصویر...... وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی اور اس کے بعد واپسی کے لئے پلٹ گئی۔ اس نے کالج جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ گھر پہنچی تو پنکی کی امی چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"خیریت بیٹا۔ کیا ہو گیا؟"

"کچھ نہیں امی سر میں درد ہو گیا تھا۔ بس میں واپس

چلی آئی۔"

"تم یقین کرو...... آج میری طبیعت بھی بہت خراب ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔"

"اوہو...... چلیں میں آپ کو ڈاکٹر کو دکھا دوں۔" پنکی نے کہا۔

"نہیں...... بھئی ابھی تو دوا لی ہے۔ شام کو دیکھا جائے گا۔ بھائی آ جائے گا تو چلیں گے۔" پنکی کی امی نے کہا۔

"ٹھیک ہے جیسا آپ پسند کریں۔" پنکی نے جواب دیا اور اندر کی طرف چل پڑی۔ نعمان پنکی کا بھائی تھا۔ اس سے صرف دو سال بڑا۔ ابو کا انتقال ہو چکا تھا اور اس انتقال کے بعد نعمان نے ہی اس گھر کو سنبھالا ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے اسی کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی جس میں پنکی کے والد حسین صاحب ملازمت کرتے تھے۔ انہوں نے پچیس سال تک اسی فرم میں ملازمت کی تھی اور اسی بنیاد پر نعمان کو انٹر ہونے کے باوجود والد صاحب کی جگہ مل گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی تنخواہ حسین صاحب سے بہت کم تھی۔ ادھر حسین صاحب کی پنشن بھی ملتی تھی۔ گھر چل رہا تھا۔ لیکن بس اس طرح کہ گزارہ ہو جائے۔

پنکی بہت سگھڑ لڑکی تھی۔ اس نے گھر پر بھی سلائی وغیرہ کا کام شروع کر دیا تھا اور کالج کے بعد رات گئے تک وہ اپنے کمرے میں کام کرتی تھی۔ لباس وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد اس نے گھر کا کام کاج سنبھال لیا۔ امی جو کچن میں تھیں اس نے انہیں وہاں سے نکال کر آرام کرنے کے لئے کہا اور پھر دوپہر تک کھانا وغیرہ پکاتی رہی۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی چونکہ خود اس کے سر میں بھی درد ہو رہا تھا۔ اس لئے امی نے اس سے خاص طور پر آرام کرنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن کمرے میں آتے ہی اس نے تصویر نکال لی اور اسے مختلف زاویوں سے دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔ بے شک اس کا رنگ اور چہرے کے نقوش زیادہ خوبصورت نہیں تھے۔ رنگ کی سانولاہٹ سے اس کے نقوش بھی دب جاتے تھے۔ جہاں تک اسے یاد تھا اس نے صرف دو بار اپنی تصویر بنوائی تھی اور دونوں بار ہی پاسپورٹ سائز کی جو اس کی سکول اور کالج میں جمع کرانے کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تصویر اسے اپنی لگتی ہی نہیں تھی۔ پتہ نہیں یوسف نے اتنی خوبصورت تصویر کیسے بنا دی تھی وہ خود تو ایسی نہیں تھی۔ بے شمار بار اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ حسین تصویر کسی اور کو بھی دکھائی جائے۔ اگر اور کوئی نہیں تو کم از کم امی کو ہی دکھا دی جائے۔ لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ سوچنے لگی کہ امی نے اگر پوچھا کہ یہ تصویر کس نے بنائی ہے تو اس کے پاس اس کا جواب نہیں ہو گا۔ کیونکہ تصویر میں بھی اس کے ساتھ اور کوئی نہیں ہو گا۔ وہ دیکھتی اور سوچتی رہی۔ تصویر کو اس نے مختلف زاویوں سے دیکھا۔ پھر جب امی کی آواز سنائی دی تب ہی وہ کمرے سے باہر آئی۔

"ہاں۔ بیٹا...... دن کا تو کھانا وغیرہ تیار ہو گیا۔ کیسی طبیعت ہے اب تمہاری یہ بتاؤ۔"

"بالکل ٹھیک ہوں امی۔ کوئی خاص بات نہیں۔"

"نہیں بس ایسے ہی میں کہہ رہی تھی کہ رات کو کھانے میں کیا بنانا ہے۔ کچھ کھانے وغیرہ کا پروگرام بنایا یا نہیں۔ ویسے بھی نعمان آتے ہی بھوک بھوک چلاتا ہے۔"

"مگر ابھی تو بھائی بہت دیر سے آئیں گے امی۔" پنکی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی۔ چھ بجے ہیں۔ آپ ہیں کسی ہوا میں۔ کوئی مشینی ذریعے سے کھانا تھوڑا ہی بنے گا۔ دیکھو برا مت ماننا مجھے معلوم ہے کہ تمہاری بھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی......"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... میں دیکھتی ہوں۔" پنکی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

رات نو بجے کے بعد ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو سکی اس کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور اپنی تصویر نکال کر سامنے رکھ لی۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا اسے۔ ہزاروں بار آئینہ دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر کبھی خوش

نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس تصویر نے اسے اتنا خوش کیا تھا کہ بس ہی نہیں چلتا تھا کہ کیا کرے نجانے کتنی دیر تک وہ تصویر دیکھتی رہی۔ پھر شاید امی کو اس کے کمرے میں روشنی نظر آ گئی تھی۔ وہ دروازے پر پہنچیں اور دستک دی۔

"کیا بات ہے۔ پنکی ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"جی امی ذرا پڑھ رہی تھی۔" پنکی نے گھبرا کر بند دروازے کی طرف دیکھا۔

"سو جاؤ بیٹا۔ طبیعت ویسے ہی خراب ہے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"بس امی ابھی سو رہی ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے لائٹ آف کی اور بیڈ پر دراز ہو گئی۔ آنکھیں تو بند کر لیں لیکن پھر بھی بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ اور نجانے کب اس تصویر کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں یوسف بھی داخل ہو گیا۔ وہ سوئی تو اس کی آنکھوں میں یوسف بسا ہوا تھا اور نجانے کب تک وہ اس کی آنکھوں کا قیدی رہا۔ پھر دوسرے دن وہ کالج پہنچی اس کے دل میں خواہش تھی کہ یوسف نظر آئے تو وہ اس کا شکریہ ادا کرے۔ لیکن یوسف اس دن کے بعد کالج میں نظر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ وہ اس کے گھر کے بارے میں جانتی تھی۔ لیکن اتفاق کی بات یہ تھی کہ آج تک کبھی اس کے گھر جانا نہیں ہوا تھا۔ چھٹا دن تھا کہ یوسف اسے نظر آ گیا۔ وہ کالج کے قریب پہنچی ہی تھی کہ یوسف کی اسکوٹر اس کے برابر آ کر رک گئی۔

"ہیلو۔ مس پنکی کیسی ہیں آپ؟" اس نے پہلی بار اسے براہ راست اس کے نام سے مخاطب کیا۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ خیریت سے تو ہیں کہاں غائب ہو گئے تھے۔" نجانے کیوں اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور اس نے یوسف کے چہرے پر خوشی کے تاثرات دیکھے۔

"معافی چاہتا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہمت نہیں پڑی آپ کے سامنے آنے کی آپ ہماری پڑوسی ہیں۔ میں اس حساب سے بھی آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔"

"میں آپ سے تصویر کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو وہ سامنے جو ہوٹل ہے وہاں بیٹھ کر میرے ساتھ ایک کپ چائے پئیں۔ دیکھئے معافی چاہتا ہوں بہت بڑی جرأت کر رہا ہوں لیکن ہم سڑک پر کھڑے ہو کر تو بات نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ وہاں چلیں۔ میں دس منٹ میں آ جاؤں گی۔" اس نے بڑی ہمت کر کے کہا اور یوسف نے خاموشی سے اسکوٹر آگے بڑھا دیا۔

جب وہ سڑک عبور کر کے اس ہوٹل تک پہنچی تو یوسف اسکوٹر پارک کر کے کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں ایک ساتھ ہی ہوٹل میں داخل ہوئے اور یوسف نے ایک میز منتخب کر کے اس کے لئے ایک کرسی گھسیٹ لی۔

"شکریہ۔" وہ بولی۔

"اب آپ یہ بتائیے کیا کھانا پسند کریں گی۔"

"نہیں۔ کچھ نہیں۔"

"آئس کریم۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔" پنکی نے بے تکلفی سے کہا اور یوسف نے ویٹر کو بلا کر آئسکریم کا آرڈر دے دیا۔ پھر بولا۔

"پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ پر اس قدر اعتماد کیا۔"

"پہلے یہ بتائیے۔ آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" پنکی نے خوشگوار موڈ میں کہا۔

"نہیں جناب یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے میں دوبارہ عرض کروں گا کہ آخرکار ہم پڑوسی ہیں۔"

"وہ تو ہیں۔ لیکن پڑوسی کی حیثیت سے بھی ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

اچھا اب آپ مجھے تصویر کے بارے میں بتائیے۔"

"تصویر بہت خوبصورت ہے۔ لیکن میری نہیں ہے۔"

"جی؟" یوسف حیرت سے بولا۔

"ہاں۔ میں اس تصویر جیسی نہیں ہوں۔ تصویر بہت خوبصورت ہے اور مجھے آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ کو مگر ایک بات عرض کروں آپ سے۔ آپ کو یہ تو پتہ ہی ہوگا کہ کیمرے کی آنکھ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ آپ جیسی ہیں۔ ویسی ہی تصویر آئی ہے۔"

"میں نہیں مانتی۔ آپ کے کیمرے نے جھوٹ بولا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے بھی جھوٹا کہہ سکتی ہیں۔"

"نہیں..... نہیں سوری..... ایسی بات نہیں ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ آپ نے بہت خوبصورت تصویر بنائی ہے۔"

"اب اگر آپ میری بات مان لیں تو میں آپ سے عرض کروں کہ آپ کو دیکھتے ہی میرے دل میں یہ خیال مچلا کہ کوئی اتنی خوبصورت تصویر بنائی جائے جس کا جواب نہ ہو اور میں نے بے اختیار آپ کی تصویر اتار لی۔"

"دیکھئے۔ جناب! آپ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی غلط بیانی کر رہے ہیں۔ کیونکہ میں آئینہ روز دیکھتی ہوں۔"

"آپ اپنی نظروں سے دیکھتی ہیں آئینہ۔ اگر میری نظر سے دیکھیں تو حقیقت آپ پر واضح ہو جائے۔ میرا مطلب ہے۔ میرے کیمرے کی نظر سے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"کہہ لیجئے..... کہہ لیجئے آپ! مجھے پتہ ہے کہ مرد اسی طرح جھوٹ بولتے ہیں۔"

"کمال ہے۔ آپ مجھ سے بہت سے رشتے قائم کرتی جا رہی ہیں۔"

"رشتے؟"

"جی ہاں..... مرد اور کیمرے میں فرق ہوتا ہے۔" وہ بولا اور پنکی بے اختیار ہنس پڑی۔ بہر حال آئس کریم کھانے کے دوران بہت سی باتیں ہوتی رہیں پھر یوسف نے کہا۔

"ویسے تو میں آپ کو کتنی ہی بار اپنے گھر کے ایک حصے سے دیکھ چکا ہوں۔ لیکن آج مجھے یوں لگ رہا ہے۔ جیسے میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا ہے۔ ایک عرض کر سکتا ہوں۔"

"جی فرمائیے۔"

"کیا آپ سے دوبارہ بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔" پنکی نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ پھر بولی۔

"کیا حرج ہے۔"

"یہ جگہ تو بہت اچھی ہے۔ آپ کو یہاں آنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوگی۔"

"دقت کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو کالج کی کنٹین میں بھی آ سکتے ہیں۔"

"مس پنکی وہاں بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ لوگ کس طرح رسوا کر دیتے ہیں۔"

"میں کسی کی پرواہ نہیں کرتی اس لئے میں آپ کے ساتھ اس ہوٹل میں بیٹھی ہوں۔ اصل میں میرا ایک نظریہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جب دنیا ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکتی تو ہم دنیا کا خوف کیوں کریں۔"

"بات تو بہت اچھی ہے لیکن بہر حال جیسا آپ پسند کریں۔"

"کوئی حرج نہیں ہے فی الحال ہم اسی ہوٹل میں ملا کریں گے۔" پنکی نے فیصلہ دے دیا۔ نجانے کیوں اس نے اتنی بے تکلفی سے اجازت دے دی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی اس طرح کے معاملات نہیں تھے۔ بس دل میں یہی آیا تھا کہ یہ شخص برا نہیں ہے اور واقعی وہ برا نہیں تھا۔ پورے تین ماہ تک یہ لوگ ہفتے میں دو بار ملتے رہے وہ پنکی سے کافی بے تکلف ہوتا چلا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے کافی متاثر ہو گئے ہیں وہ ہمیشہ پنکی کی تعریف کرتا رہتا تھا۔ لیکن پھر تین مہینے کے بعد اچانک

ہی یوسف غائب ہوگیا۔

پنکی کے دل میں اس کے لئے بے پناہ جگہ پیدا ہوچکی تھی۔ وہ دل کی گہرائیوں سے یوسف کو چاہنے لگی تھی اور کتنی ہی بار اس نے اس بات کی آرزو کی تھی کہ یوسف اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا تذکرہ کرے۔ بہت بار اس نے یوسف سے اپنی قربت کا اظہار بھی کیا تھا اور اس نے اپنے بارے میں ایک ایک بات بتادی تھی۔ یوسف نے بھی اسے اپنے گھر کے بارے میں تفصیل بتائی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے بڑے، بہنوئی، بہن اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے والد کا انتقال دس سال پہلے بڑی بہن کی شادی کے بعد ہوگیا تھا۔ انتقال کے بعد ہی اس کی بڑی بہن اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ ہی اس کے گھر آ گئی تھی اور اس وقت سے یہ لوگ اس کے گھر میں رہتے تھی۔ ایک طرح سے یوسف کی والدہ اور یوسف کی کفالت اس کے بہنوئی ہی کرتے تھے۔ یوسف نے تعلیم چھوڑ کر کئی مرتبہ نوکری حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی تھی۔ فوٹوگرافی کا شوق اسے بچپن ہی سے تھا۔ اس شوق کو اس نے اپنا پیشہ بنالیا تھا اور وہ باقاعدہ کسی اخبار سے منسلک نہیں تھا۔ لیکن کئی اخبارات میں اس کی بنائی ہوئی تصاویر لگ جاتی تھیں۔ وہ عموماً اخبارات کے فیشن میگزین کے لئے فوٹو بناتا تھا۔ لیکن اس نے وعدے کے مطابق پنکی کی تصویر کسی فیشن میگزین کے لئے نہیں دی تھی۔

بہر حال یہ بات پنکی کے ذہن میں جڑ پکڑ چکی تھی کہ یوسف بھی اسے اسی طرح چاہنے لگا ہے جس طرح وہ یوسف کو اور اکثر اس کے دل میں یہ خیال ہوتا تھا کہ یوسف جس طرح بھی ہوسکے جلد از جلد اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلے۔ تقریباً پندرہ دن تک یوسف اسے نہیں ملا تو پنکی کی بے چینی آخری حد تک بڑھ گئی اور آخرکار وہ ایک روز اس کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو یوسف کی بہن نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر بولی۔

"جی فرمایئے۔ کون ہیں آپ؟"

"اصل میں مجھے یوسف صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔"

"وہ تو ملک سے باہر چلا گیا ہے۔"

"جی؟" وہ دھک سے رہ گئی۔

"ہاں...... وہ چلا گیا ہے۔ بہت عرصے سے وہ ملک سے باہر جانے کی تیاریاں کررہا تھا۔"

"ملک سے باہر؟" پنکی نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ اس کا سر چکرا سا گیا تھا۔ "ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ کہ وہ اچانک ہی اسے بتائے بغیر باہر چلا جائے۔"

"اصل میں وہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش کے چکر میں تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس ملک میں اسے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

"لیکن وہ گھر میں بتائے بغیر چلے گئے۔ میرا مطلب ہے۔"

"ہاں...... بھئی وہ اسی قسم کا لڑکا ہے۔ لاابالی۔ بے پرواہ دنیا سے الگ تھلگ جس روز سے وہ گیا ہے امی کی طبیعت خراب ہے لیکن خود ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اسے کہاں اطلاع دی جائے۔ بس...... گھر سے چلا گیا اور یہ بھی نہیں بتایا کہ کہاں جارہا ہے۔"

"لیکن بی بی آپ نے مجھے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔" یوسف کی بہن نے کہا۔

"جی میرا نام پنکی ہے۔ اور میں اسی محلے میں رہتی ہوں۔ آپ کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر۔" پنکی نے اپنے گھر کی جانب اشارہ کرکے کہا۔

"ارے واہ ...... ملاقات ہی نہیں ہوئی آج تک۔ آؤ...... اندر آجاؤ۔" یوسف کی بہن نے بے تکلفی سے کہا اور پنکی اس کے پیچھے پیچھے ڈگمگاتے قدموں سے اندر داخل ہوگئی۔

"میرا نام شاہدہ ہے اور یوسف میرا بھائی ہے۔ ماں اکیلی تھی اس لئے میں اپنے شوہر کے ساتھ یہیں آگئی۔

لیکن میں تمہیں یوسف کے بارے میں بتاؤں کہ سنجیدگی سے اس کا دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔ البتہ تمہارا ذکر اس نے گھر میں کبھی نہیں کیا۔ ویسے بھی ایک بات میں تمہیں بتاؤں۔ صرف فوٹوگرافی اس کا شوق ہے۔ بظاہر وہ کبھی مجھے کسی لڑکی سے متاثر نظر نہیں آتا۔ اس نے اپنے شوق پر بڑے پیسے برباد کئے ہیں۔ امی کا ایک مکان اور تھا۔ جسے اس نے فروخت کردیا اور ساری رقم اپنے شوق پر خرچ کردی۔"

"مگر اس کی بنائی ہوئی تصویریں تو شاید کسی فیشن میگزین میں......"

"ناں...... بابا ناں...... منہ میں جو آتا تھا بک دیتا تھا۔ کبھی کسی فیشن میگزین سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ بس وہ خود کو پریس فوٹوگرافر ظاہر کرتا تھا تاکہ لڑکیوں کی تصاویر بنانے میں آسانی ہوجائے۔"

"کیا واقعی؟"

"میں نے کہا ناں...... کہ اس نے اپنی ساری زندگی اپنے اسی شوق کی نظر کردی۔ اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ وہ بہت بڑا فوٹوگرافر بن جائے۔ دنیا میں اس کا نام ہو۔ کسی رشتے کو نہیں مانتا یہاں تک کہ اپنی ماں کے سلسلے میں بھی اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کے پاؤں کی بیڑی ہیں جس دن یہ بیڑی ٹوٹ جائے گی وہ آزاد ہوجائے گا۔" بڑی عجیب سی صورتحال ہے۔ نجانے وہ اور کیا کیا کہتی رہی۔ لیکن پنکی پر قیامت ٹوٹ چکی تھی۔

"یہ کیا ہوگیا...... یہ کیسے ہوگیا؟" بہر حال وہ وہاں سے چلی آئی۔ اس کا دل خون کے آنسو رورہا تھا۔ یوسف سے اس نے محبت کی تھی اور ہمیشہ یہ محسوس کیا تھا کہ یوسف بھی اسے چاہتا ہے لیکن یہ کیا ہوا؟ کئی دن تک وہ خاموش رہی لیکن ایک دن پھر یوسف کے گھر پہنچ گئی۔ آج یوسف کی بہن شاہدہ کافی پریشان تھی۔

"کچھ پتہ چلا یوسف کا؟"

"بالکل نہیں۔ امی بہت بیمار ہیں۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہیں اور اس کی گمشدگی سے سخت غمزدہ ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"ہسپتال میں۔ میں وہیں جارہی تھی۔"

"میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔" شاہدہ نے ایک نگاہ اسے دیکھا۔ پھر بولی۔

"آؤ...... چلو۔" راستے میں شاہدہ نے کہا۔

"ایک بات کہوں تم سے پنکی؟ برا تو نہیں مانو گی۔"

"نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیا تم یوسف سے محبت کرنے لگی ہو؟"

"کیوں پوچھ رہی ہیں آپ۔" وہ غم زدہ لہجے میں بولی۔

"مجھے لگتا ہے۔ میں بھی عورت ہوں اور عورت ہی عورت کی بے چینی کو سمجھ سکتی ہے۔ میں تمہیں یوسف کے بارے میں بتاؤں۔ وہ کسی کا نہیں ہے اس دنیا میں۔ اس نے جو کچھ بھی تم سے کہا ہوگا۔ وہ سب جھوٹ کہا ہوگا۔ اسے کسی سے محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ میں تمہارا دل نہیں توڑ رہی۔ اس لئے تم سے کہہ رہی ہوں کہ سنبھل جاؤ۔ وہ ایک دھوکہ ہے۔ یہ بات ایک بہن اپنے بھائی کے بارے میں کہہ رہی ہے۔ لیکن حقیقتاً اس وقت میں ایک بہن نہیں ایک عورت ہوں۔" پنکی خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی۔ شاہدہ نے اسے یہ بھی بتایا کہ انہی کے خاندان کی ایک بہت ہی حسین لڑکی سے یوسف کے رشتے کی بات چلی تھی اور یوسف نے یہ کہہ کر اس لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا کہ اس لڑکی کا اسکرین فیس نہیں ہے۔ اس کی تصویر بہت خراب آتی ہے اور کیمرے کی آنکھ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ یہ اندر سے بھی اتنی ہی خراب ہوگی جتنی اس کی تصویر خراب آتی ہے۔

بیوقوفی کی بات ہے۔ لیکن اس کا اپنا نظریہ تھا۔ پنکی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن ایک بات اس کے ذہن میں بار بار ابھر اور ڈوب رہی تھی۔ وہ یہ کہ اس کی تصویر خراب نہیں آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اندر سے

بھی اتنی ہی اچھی ہے جتنی اس کی تصویر اچھی آئی ہے۔ پھر یوسف نے اسے دھوکہ کیوں دیا۔ جبکہ شاہدہ کی باتوں سے تو یہی لگتا تھا کہ یوسف اب تک اسے بیوقوف ہی بناتا رہا ہے۔ اسی دوران شاہدہ کے شوہر کا فون آیا۔ جس میں اس نے شاہدہ سے کچھ کہا تھا۔ شاہدہ نے فوری طور پر ہسپتال جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم میرے ساتھ امی سے ملنے ہسپتال چلنا چاہتی ہو تو شام کو آ جانا اصل میں منصور کو مجھ سے کوئی کام آ پڑا ہے۔ اس وقت میں وہاں نہیں جا سکتی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"پھر یہ بتاؤ آؤ گی۔"

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں امی کو دیکھنے ضرور جاؤں گی۔"

"میں بھی چاہتی ہوں کہ تم انہیں دیکھنے چلو۔" شاہدہ نے پتہ نہیں کس جذبے کے تحت کہا۔ بہر حال وہ واپس آ گئی۔ اس کا دل گھر میں نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار اسے یوسف کا خیال آ رہا تھا۔ کیا یوسف اتنا برا انسان تھا۔ اس کی کہی ہوئی ایک ایک بات اسے یاد آ رہی تھی۔

پھر پانچ بجے اس نے ہسپتال جانے کی تیاری شروع کر دی۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کئے اور امی سے صرف اتنا کہا کہ وہ سول ہسپتال تک جا رہی ہے۔"

"کیوں، خیریت، کوئی بیمار ہے کیا؟"

"ہاں...... میری ایک دوست کی امی ہسپتال میں داخل ہیں۔" پنکی نے مختصر سا جواب دیا اور گھر سے باہر نکل آئی۔ جب وہ شاہدہ کے پاس پہنچی تو وہ تیار ہی تھی۔ رکشہ میں بیٹھ کر وہ دونوں ہسپتال چل پڑیں اور پھر یوسف کی والدہ کے پاس پہنچ گئیں۔ یوسف کی والدہ کے گردے خراب تھے اور وہ بلڈ پریشر کی مریضہ بھی تھیں۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتیں۔ شاہدہ نے ان کی طبیعت کا پوچھنے کے بعد پنکی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"امی یہ یوسف کی دوست ہیں۔"

"دوست؟" یوسف کی والدہ نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ہاں...... میرا خیال ہے۔ امی یہ لڑکی یوسف سے محبت کرتی ہے۔" شاہدہ بہت ہی کھلی زبان کی مالک تھی۔ پنکی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ لیکن شاہدہ نے کسی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا اور اس کا خیال ہے کہ یوسف بھی اسے پسند کرتا ہے لیکن وہ اسے بتائے بغیر ہی یہاں سے چلا گیا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"پنکی۔ اپنے ہی محلے میں رہتی ہے۔" شاہدہ نے کہا اور پھر تفصیل سے پنکی کے بارے میں امی کو بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اس کی تصویر یوسف کے کیمرے سے بہت اچھی آئی تھی۔"

"پھر...... پھر وہ کہاں گیا۔ اور کیوں گیا؟"

"معلوم نہیں کیوں گیا۔ جبکہ اس نے بارہا یہی بات کہی تھی کہ جس لڑکی کو اس کے کیمرے نے پسند کیا وہ اس سے شادی ضرور کرے گا۔" پنکی کی تصویر بنانے کے بعد وہ اس سے خود ملا تھا اور اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے ایسے ہی ملتا تھا۔ جیسے اس سے محبت کرنے لگا ہو۔"

"پھر تو...... پھر تو وہ ضرور واپس آ جائے گا۔ واپس آ جائے گا۔" یوسف کی والدہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹی رہیں...... لیٹی رہیں امی۔ دماغ پر زیادہ زور دینے کی کوشش نہ کریں۔" شاہدہ نے کندھوں سے پکڑ کر اپنی ماں کو لٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

پنکی کی صورتحال اس وقت بہت عجیب تھی۔ اسے نجانے کیوں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ بیمار خاتون ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یوسف ضرور واپس آ جائے گا۔ جب یوسف کی بیمار ماں کو جو اس کی طرف سے بالکل ناامید ہو گئیں تھیں، اس سے ملنے کے بعد اس کی واپسی کی امید ہو سکتی ہے تو پھر تو

پنکی کو بھی اس کی واپسی کا یقین کر لینا چاہیے۔ کیمرے کی آنکھ نے گواہی دی ہے کہ وہ اندر سے خوبصورت ہے۔ پھر تو یوسف ضرور واپس آئے گا۔ بہر حال پھر اچانک ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا کہ اس کے کیمرے کی آنکھ نے کسی اور لڑکی کو پسند کر لیا تو کیا ہو گا۔

"کیوں بیٹی تم بتاؤ۔ کیا یوسف واپس آئے گا؟" یوسف کی ماں نے براہ راست اس سے سوال کر لیا۔ لیکن پنکی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ البتہ شاہدہ بول پڑی۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا وہ عجیب و غریب فطرت کا مالک ہے۔ وہ کس وقت کیا کر دے گا اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ بہت ہی مشکل۔" بہت دیر تک یہ دونوں ہسپتال میں رہیں اور پھر یوسف کی ماں کو تسلی دے کر کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی پنکی اور شاہدہ گھر واپس آ گئیں۔

"پنکی جب گھر واپس پہنچی تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ نعمان اپنے کام سے واپس آ گیا تھا اس نے براہ راست اس سے سوال کر ڈالا۔

"کہاں گئیں تھیں تم پنکی؟"

"وہ میں ہسپتال گئی تھی۔ شاہدہ باجی میرے ساتھ تھیں۔" پنکی نے کہا لیکن نعمان کسی شاہدہ باجی کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔

"کون شاہدہ باجی؟"

"وہ پڑوس میں رہتی ہیں۔ میرے ان سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔" پنکی نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ بولا۔ اس نے یوسف کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ اپنی ماں کو بتائے بغیر باہر چلا گیا اس لئے اس کی ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ اس نے شاہدہ کے بارے میں کہا کہ وہ اسے بہت عرصے سے جانتی ہے۔ بہر حال نعمان نے اس پر کوئی شبہ نہیں کیا تھا۔ اس دن کے بعد وہ دو ہفتے تک نہ شاہدہ کے گھر گئی اور نہ اس نے اس کی ماں کے بارے میں کچھ پتہ کیا۔ دو ہفتے کے بعد جب اس کے گھر پہنچی تو اس کی ماں بستر پر تھیں۔ معلوم ہوا کہ اب ان کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔ وہ سو رہی تھیں اس لئے پنکی کی ان سے بات چیت نہیں ہو سکی لیکن شاہدہ نے بتایا کہ یوسف کا خط لندن سے آیا ہے اور وہ خیریت سے ہے۔ فی الحال اس کی واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ وہ کسی فوٹو گرافری کی نمائش میں حصہ لینے والا ہے۔ اس نمائش کے بعد ہی شاید وہ واپس آئے گا۔"

"اوہ! کیا آپ نے امی کو یہ بات بتا دی۔"

"ہاں...... اسی خط کی بناء پر ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی ہے اور میں انہیں ہسپتال سے واپس گھر لے آئی۔"

"میرا خیال ہے شاہدہ باجی آپ کو اس طرح انہیں نہیں بتانا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی۔"

"میں نے انہیں وہ خط بھی دکھا دیا ہے اور اس سے خاصی بہتر ہو گئی ہیں۔" کافی دیر تک وہ شاہدہ کے پاس رہی۔ شاہدہ نے اس سے اتنے دن نہ آنے کی شکایت بھی کی اور انہوں نے بہت سی ادھر ادھر کی باتیں کی تھیں۔ بہر حال جب پنکی گھر آئی تو اس کے دل و دماغ پر یوسف ہی چھایا ہوا تھا اور وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ فوٹو گرافی کی نمائش کے بعد واپس آ جائے۔ بہر حال وقت گزرتا رہا۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد یوسف نے لندن سے شائع ہونے والا ایک رسالہ شاہدہ کے نام پوسٹ کیا۔ یہ رسالہ فوٹو گرافی سے متعلق تھا اور اس نے لندن میں فوٹو گرافی کی ایک نمائش کی روداد بھی شائع کی تھی۔ شاہدہ باجی نے بڑے نخرے کے بعد یہ رسالہ پنکی کو دیا اور جب پنکی نے رسالے کا سرورق دیکھا تو ایک دم اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سرورق پر پنکی کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اپنا فوٹو سرورق پر دیکھ کر اس کی جو حالت ہوئی۔ اسے شاید الفاظ میں بیان نہ کیا جا سکے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے تھے۔

"ارے......ارے پنکی یہ کیا کر رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔"

پنکی نے اپنے آنسو خشک کر لئے اور بولی۔

"یہ رسالہ میں رکھ لوں باجی!"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ نہ میرے شوہر نے نہ امی نے۔" اس تصویر کے بارے میں اندر ایک مضمون بھی ہے۔ بعد میں یہ رسالہ میں تمہیں دے دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ پنکی بہت دیر تک شاہدہ باجی کے ساتھ رہی پھر گھر آ گئی۔ اس کے بعد وہ ایک ہفتے تک روزانہ ان کے گھر جاتی رہی کہ وہ رسالہ اسے دے دیں لیکن انہوں نے رسالے کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں بیان کر دیں۔ پنکی کو صاف لگا کہ وہ یہ رسالہ اسے دینا نہیں چاہتیں۔ پنکی شہر بھر کے بک سٹالوں اور کتابوں کی دکانوں پر اسے تلاش کرتی رہی لیکن اسے رسالہ کہیں سے نہ ملا۔ پھر ایک دن وہ شاہدہ باجی کے گھر پہنچی تو علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

"شاہدہ باجی۔ اگر آپ رسالہ نہیں دینا چاہتیں تو مجھے بتا دیجئے۔ میں اسے منگوا لوں گی۔" شاہدہ باجی نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولیں۔

"پنکی میں تمہیں اس کا سرورق پھاڑ کر دے سکتی ہوں۔ رسالہ میں تمہیں نہیں دوں گی۔"

"کیوں شاہدہ باجی! ایسی کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے پنکی میں نے اس رسالے کا ذکر اپنے شوہر تک سے نہیں کیا۔ نہ امی کو یہ رسالہ دکھایا۔"

"مگر کیوں؟" پنکی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"تمہارے اس کیوں کا جواب میرے پاس ہے۔ مگر میں دینا نہیں چاہتی۔ میرے اس جواب سے تمہارا دل ٹوٹ جائے گا اور تم پنکی! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔"

"باجی پلیز! ایک بار مجھے دکھا تو دیں آخر ایسی کیا بات ہے؟"
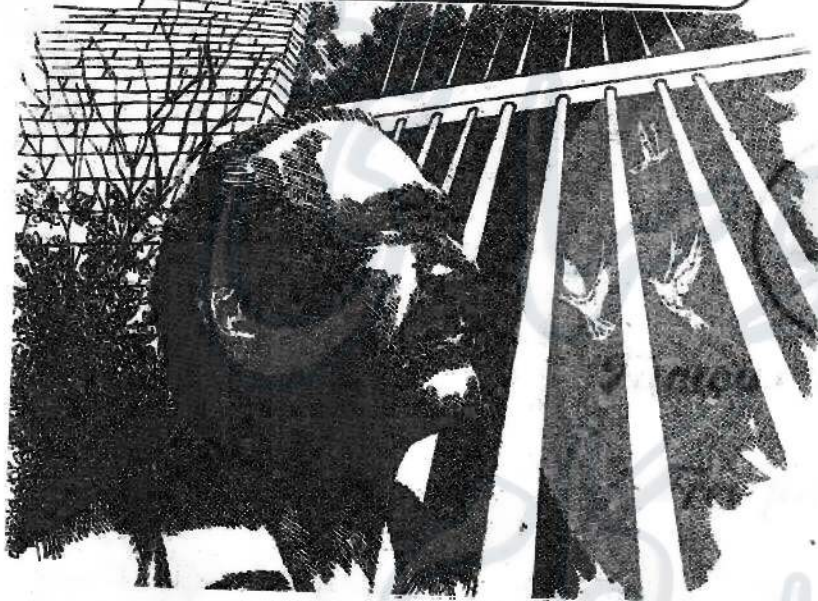
"لو"۔ آخر کار شاہدہ باجی نے رسالہ پنکی کے سامنے پھینک دیا۔

"لو اسے پڑھو اور خودکشی کر لو۔" رسالے میں یوں تو بہت کچھ تھا لیکن تصویروں کے درمیان چھوٹے چھوٹے مضمون بھی تھے۔ جن پر نشان لگے ہوئے تھے۔ یہ نشان شاہدہ باجی نے لگائے تھے۔ ایک مضمون رسالے کے ایڈیٹر کی طرف سے تھا۔ اور دوسرا مضمون فوٹوگرافر یوسف کے سلسلے میں تھا۔ جسے رسالے ہی کے کسی فرد نے لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ

یوسف پاکستان کا ایک جنونی فوٹوگرافر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ لڑکیاں جن کے اسکرین فیس ہوتے ہیں وہ اندر سے بہت خوبصورت اور باہر سے دیکھنے کے قابل بھی نہیں ہوتیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سرورق پر جس فوٹو کو نمائش میں اول قرار دیا گیا ہے۔ اس فوٹو کے پیچھے جو لڑکی ہے وہ ایسی بھی نہیں ہے کہ جسے نظر بھر کر دیکھا جائے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ دوسری نمائش میں وہ جس لڑکی کی تصویر رکھنے والا ہے وہ ایک اور لڑکی ہے اور گزشتہ پندرہ سال سے لندن ہی میں رہتی ہے۔

یہ لڑکی اندر سے اتنی حسین ہے کہ وہ نمائش کے بعد اس سے شادی کر لے گا۔ اس مضمون میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ یوسف کو جتنی رقم اس نمائش کے بعد دی گئی ہے اس کے عوض اسے برطانیہ کی شہریت بھی مل سکتی ہے۔ جیسے جیسے آنکھوں سے ٹپکتے آنسوؤں میں تیزی آ رہی تھی آسمان سے ٹپکتی بوندوں میں بھی تیزی آتی چلی جا رہی تھی......ساون کی پہلی جھڑی اس کے غم میں برابر کی شریک تھی مگر آج ہر دلاسہ ہر دلیل اس کے لئے بے معنی تھی، بالکل یوسف اور اس کی بنائی ہوئی تصویر کی طرح رسالہ ہاتھ میں لئے پنکی نجانے کیا کیا دیکھتی اور سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کیا کہ یوسف باہر سے جتنا خوبصورت تھا۔ اندر سے اتنا ہی بدصورت تھا۔

☆......☆......☆

افسانہ

جنوں کی ماری

وہ قسمت کی ماری زندگی کے تھپیڑوں سے
نڈھال تھی کہ امید کی دستک نے
عہد ستم کے ہر باب کو بھلا دیا۔

ایک لڑکی کا فسانہ جس سے زندگی کی خوشیاں روٹھ چکی تھیں

"بھلا میرے لیے کیسی خوشیاں......کیسی محبتیں......
مجھے تو سرخ جوڑا، کلائیوں میں رنگ برنگی چوڑیاں، پیروں میں پازیب پہنے بڑی مدت ہو گئی۔ اب خوشی کا کوئی بھی تہوار ہو میرے روکھے اور پھیکے ہاتھوں میں مہندی کے رنگ نہیں سجتے، ہونٹوں پہ لالی، ماتھے پہ بندیا نہیں سجتی۔"

تیز دھوپ میں سرمئی ریت کی تپش اور ذہن پر سوچوں کا حصار، پاؤں میں بھاری بھرکم پھٹے پرانے سخت مردانہ جوتے، پسینے سے شرابور میں چند گدھوں پر مشکیزے لادے پانی کی تلاش میں تھی جہاں دور دور تک کوئی سایہ دار درخت نہیں۔

میں اکیلی عورت......

بھلا کتنی دور تلک پانی کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہوں گی۔ پہلے ایک دو جگہ پر جہاں تھوڑا بہت پانی کچھ دنوں سے موجود تھا۔ اب وہ بھی سورج کی تپش سے سوکھ گیا تھا۔

اس خشک جگہ پر بہت سی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بے جان پڑی دیکھ کر میرے قدموں سے بھی زمین سرکتی چلی جا رہی تھی اور سر چکرانے لگا تھا۔ شدت پیاس سے حلق

خشک ہو کر کانٹا بن گیا تھا اور اب گدھوں کو ہانکنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔

کچھ فاصلہ مزید طے کرنے کے بعد مجھے ایک چھوٹی سی ندی دکھائی دینے لگی۔ ندی کے آس پاس کوئی بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔

"اف اتنی سخت گرمی میں بھی پانی کتنا ٹھنڈا ہے۔ اب تو میں ہر روز یہاں سے پانی بھرنے آؤں گی۔ مگر یہ جگہ تو بہت دور ہے یہاں تک آتے آتے تو سورج سر پہ آجاتا ہے پھر گھر جا کر اپنی بیمار ساس کا خیال کیسے رکھ سکوں گی......؟

اپنی ساس اور دیور کے لیے روٹی، سالن وغیرہ کا بندوبست کرنا اور بھیڑ بکریوں کے لیے کھیتوں سے چارہ کاٹ کر لانا بہت بڑا مشکل کام ہے مگر ان سب کاموں سے بڑھ کر مشکل کام تو اپنی سوتن نگہت اور شوہر رستم خان کے ناز نخرے سہنا ہے۔

نگہت جب سے رستم خان کی دلہن بن کر آئی تھی نہ گھر کا کام کاج کرتی، نہ پانی لاتی، اور نہ ہی بھیڑ بکریوں کا خیال رکھتی تھی وہ تو اپنے کمرے میں سارا دن بیٹھی رہتی ہے۔

آج تو میرا بدن تھکن سے چور چور ہے۔ بھلا اتنے کام کیسے کر سکوں گی......؟

اور رات گئے تک اپنے میاں کے پیر کیسے دباؤں گی...... اور وہ جو اپنے آپ کو وڈیرہ سائیں کا خاص خادم کہلواتا ہے مگر اس کام تو صرف وڈیرہ سائیں کے شکاری کتوں کی صفائی ستھرائی اور انہیں دیسی گھی کی چوریاں کھلاتا ہے اور ان کتوں کو لڑائی کے لیے تیار کرنا ہے پھر وہ تو رات گئے تک وڈیرہ سائیں کے شکاری کتوں اور وڈیرہ سائیں کے قصیدے سناتا ہے کہ وڈیرہ سائیں بہت اچھا آدمی ہے اور اس کے پاس دور دور سے لوگ فیصلہ کرانے آتے ہیں اور ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے کہ جب میں حویلی سے نکل رہا تھا تو کسی کی سسکیوں کی آواز سن کر اچانک میرے قدم رک گئے۔

ایک بوڑھے بابا جی میرے قدموں کی آہٹ سن کر بولے تھے۔

"بیٹا وڈیرہ سائیں کس وقت آئیں گے؟"

میں آگے بڑھا اور سلام کر کے اس نابینا شخص سے ہاتھ ملایا تو رات کی تاریکی میں بھی اس کی اور اس کی بوڑھی بیوی کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو جگنو بن کر چمک رہے تھے۔

میرے سلام کرنے پر وہ پھر بولے کہ بیٹا وڈیرہ سائیں آخر کس وقت حویلی آئیں گے۔ ہمیں تو یہاں بیٹھے بیٹھے رات ہوگئی ہے۔

یہ سن کر میں نے حیرانگی سے پوچھا کہ بابا جی آپ کے گھر کی چوری وغیرہ تو نہیں ہوئی جو آپ وڈیرہ سائیں کے پاس شکایت لے کر آئے ہیں......؟

میرا سوال سن کر وہ دونوں میاں بیوی زار و قطار رونے لگے اور کہنے لگے کہ ہمارے گھر کی چوری وغیرہ نہیں ہوئی بلکہ ہم اپنی بیٹی کے قاتل ہیں اور اس کی لاش گھر میں پڑی ہے۔ گاؤں والے کہتے ہیں کہ پہلے وڈیرہ سائیں کو اطلاع دو اور جب اس نے اجازت دی تو پھر ہم تدفین کا بندوبست کریں گے۔

ان کی یہ بات سن کر میں ایک بار پھر حیرانی سے بولا کہ آپ کی بات مجھے سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر آپ دونوں نے اپنی بیٹی کو قتل کیوں کیا......؟

یہ سن کر بوڑھا شخص بولا کہ بیٹا میں ضعیف العمر اور نابینا ہوں جس کی وجہ سے میرے گھر کی گزر بسر زکواۃ و خیرات سے ہو رہی تھی ہم دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نرگس جیسی بیٹی عطا کی۔ نرگس بیٹی جب چھوٹی تھی تو دوپہر کو لسی کے لیے ایک محلے دار کے گھر جاتی تھی۔ جب وہ ہوئی تو میں نے اسے بہت روکا مگر اس کی ماں نادان اور بھولی بھالی تھی وہ کبھی خود لسی لینے جاتی تھی تو کبھی کبھار نرگس کو ہی بھیج دیتی تھی۔

جس بات کا مجھے ہمیشہ ڈر رہتا تھا آخر وہی ہوا کہ اس گھر میں ہوس کے شکاری نے اسے اپنا نشانہ بنا لیا۔

نرگس بیٹی جب روتی ہوئی گھر آئی تو ہمارا جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں یا اس گناہ گار لڑکے کا گلہ دبا دیں۔ لیکن ہم لوگوں میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں تھی کہ ہم اس ظالم گناہ گار کے گریباں پر ہاتھ ڈالتے اس لیے ہم لوگوں نے تھانے دار صاحب کا دروازہ انصاف کے لیے کھٹکھٹایا مگر شاید وہ ظالم گناہ گار تھانے دار صاحب کو رشوت کھلا گیا تھا کہ ہمارے کڑوے سچ پر اسے یقین ہی نہیں آیا اور وہ مختلف بہانوں سے ہمیں ٹالتا رہا۔

اس دوران ہم لوگوں نے اپنے محلے کے معزز لوگوں سے بھی یہ بات کی مگر ہماری ہر کوشش بے سود ٹھہری تھی۔ اسی اثناء میں نرگس بیٹی کے جسم میں اس کمینے کا گناہ بھی پلنے لگا اور پھر اسی بھاگ دوڑ میں سات مہینے گزر گئے اور ہماری معصوم سی بیٹی گھر سے باہر نکلنے کے قابل نہ رہی۔ اب وہ ایک کمرے میں پڑی روتی سسکتی رہتی تھی ہم دونوں سے اس کا یہ دکھ دیکھا نہ گیا اور ایک بار پھر تھانے دار صاحب کے پاس گئے اور اپنی بے بسی کی داستان سنائی مگر اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

جب ہم ہر بار کی طرح مایوس ہو کر نڈھال قدموں سے گھر لوٹ آئے تو نرگس نے ہمیں دیکھ کر حسب معمول یہ پوچھا کہ بابا جی تھانے دار صاحب نے کیا کہا؟

بیٹی کے درد بھرے سوال کے جواب میں ہمارے منہ سے بے اختیار یہ نکل گیا کہ تھانے دار صاحب نے اس لڑکے اور اس کے گھر والوں کو بلوا کر تمہاری شادی اس سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور انہیں راضی بھی کر لیا ہے۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی اور اٹھ کر اتنے دنوں کے بعد اپنے لیے روٹی اور سالن پکایا لیکن رات کی تاریکی میں چپکے سے اس سالن میں ہم دونوں نے زہر ملا دیا اور جب وہ کام سے فارغ ہو کر کھانا کھا کر لیٹی تو ہمیشہ کے لیے سو گئی۔

آج دوپہر جب ہم محلے داروں کے پاس اپنی بیٹی کی تدفین کے انتظام کے لیے گئے تو انہوں نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ پہلے وڈیرہ سائیں کو بتاؤ اور یہ بات ہم وڈیرے سائیں کو بتانے آئے ہیں۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ وڈیرہ سائیں شہر سے اپنی گاڑی پر آگئے۔ اپنی حویلی کے دروازے پر اس بوڑھے شخص اور عورت کو دیکھ کر وڈیرے سائیں نے اپنی گاڑی روکی اور جب انہوں نے یہ کہا کہ وہ پہلے تھانے دار صاحب کے پاس بھی گئے تھے تو یہ سن کر وڈیرہ سائیں طیش میں آگئے اور یہ کہہ کر گاڑی آگے بڑھا دی کہ اس کی اطلاع بھی تھانے دار کو دو یہاں کیوں منہ اٹھا کر چلے آئے ہو۔

مجھے بھی وڈیرے سائیں کی بات اچھی لگی کہ پہلے جب وہ تھانے دار کے پاس گئے تھے تو اب کس منہ سے وڈیرہ سائیں کے پاس آئے تھے......؟ ایسے ظلم و جبر کے قصے آج رات میں اپنے میاں کے منہ سے کیسے سن پاؤں گی......؟ مجھے لگتا ہے کہ آج رات مجھے سخت بخار ہوگا۔

چلو خیر اب مشکیزے بھر کر گھر جانے کی تیاری کرتے ہیں۔

☆......☆......☆

آ گئی بختو بیٹی آج تو تو نے بڑی دیر لگا دی؟"

"ہاں ساسو جی! بس کیا پوچھتی ہو، صبح سے پانی کی تلاش میں گھوم گھوم کر میرے پاؤں چھلنی ہو گئے ہیں اور سر ہے کہ درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ پرانی ندی کی بغل میں کچھ پانی کھڑا تھا ورنہ تو بس میری جان ہی نکل گئی ہوتی۔"

"ناں بیٹی ایسے نہیں کہتے۔ اب ذرا سا آرام کر لے تیرا دیور ابھی تک روٹی کھانے نہیں آیا وہ شاید شام کو ہی لوٹے گا اس لیے میں نے صبح والی روٹی کھا کر دوا لے لی ہے۔ تو ذرا آرام کے بعد اپنے لیے اور اپنے دیور کے لیے روٹی پکا لینا۔"

"ٹھیک ہے ساسو جی! میں ذرا آرام کرتی ہوں مگر شاید میری زندگی میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں۔

☆......☆......☆

"ارے پگلی یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

ذرا اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے اٹھا دو اور یہ تم کس انتقام کی بات کر رہی ہو......؟

ان جبر کے رشتوں کے انتقام کی یا فرسودہ رسموں کے انتقام کی ان ظالم جاگیرداروں کے غلط فیصلوں کے انتقام کی یا اس محبت کے انتقام کی جو میرے اور تمہارے دلوں میں پنپ رہی ہے۔ کیا تمہیں اتنی خبر نہیں کہ تمہاری ذرا سی بھول سے ہماری یہ محبت فنا ہو جائے گی اور تمہارا یہ انتقام بھی ختم ہو جائے گا۔

میں تو ایک اجنبی شخص ہوں جو یہاں اتفاق سے اپنی بوڑھی ماں کو علاج کے لیے لایا تھا اور تم اپنی ساس کے علاج کے لیے اس ہسپتال میں آئی ہو۔

آج نہیں تو کل ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے پھر تم اپنے گاؤں جا کر اپنے شوہر کی بے رخی بے دردی کا انتقام کس سے لوگی......؟

"کیا کسی راہ چلتے چرواہے سے مل کر...... یا کسی گھڑ سوار سے گلے مل کر......"

"نہیں نہیں شہری بابو تم تو ایسی بری باتیں مت کرو میں اتنی بے غیرت نہیں ہوں تقریباً چھ سال کی عمر تھی میری جب میرے والد صاحب بقضائے الٰہی فوت ہو گئے تو پھر میرے بھائیوں نے کھیتوں کی کاشت کا ذمہ لیا۔ اس دوران ایک سال تو بارش نہ ہونے کی وجہ سے خشک سالی ہوئی مگر اگلے سال جب ندی میں پانی آیا تو میرے بھائیوں کا رستم خان کے باپ اور بھائیوں سے جھگڑا ہو گیا۔ میرے بھائی شرافت اور غربت کی وجہ سے صبر و برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہوئے تو رستم خان جو کہ وڈیرہ سائیں کے کتوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور وڈیرے سائیں کا خاص بندہ تھا اس کے باپ اور بھائیوں کو اس بات پر بڑا فخر تھا اور وہ میرے شریف بھائیوں کو للکار کر ڈرپوک کہہ رہے تھے۔

یہ سن کر ان سے بھی رہا نہ گیا اور پلٹ کر ڈنڈے کا وار رستم خان کے باپ پر کیا تو وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

یہ دیکھ کر میرے بھائی وہاں سے دوڑ پڑے اور ہمارے ماموں والوں کو یہ خبر دے کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ہمارے ماموں فوراً ہمارے گھر پہنچ گئے ورنہ رستم خان اور اس کے بھائی تو ہمارے گھر میں داخل ہو کر نہ جانے کیا فساد برپا کر دیتے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد حالات معمول پر آنے لگے تو میرے ماموں نے فیصلے کے لیے وڈیرے کے پاس گئے۔ پہلے تو وڈیرہ صاحب بھی بہت غصے میں تھے کہ ان کے خاص خادم رستم خان کے باپ کا قتل میرے بھائیوں نے کیوں کیا ہے۔ پھر جب میرے ماموں نے وڈیرہ صاحب کی منت سماجت کی تو وہ فیصلہ کرنے پر آمادہ ہوئے۔ فیصلے سے کچھ دن قبل فریقین سے وڈیرہ صاحب نے تحریری طور پر یہ لکھوا کر اقرار نامہ لے لیا کہ انہیں وڈیرے صاحب کا ہر فیصلہ قبول ہو گا۔

فیصلے سے ایک رات قبل میرے بھائی نامعلوم جگہ سے واپس آئے اور رات بھر ماموں سے یہ حال احوال کرتے رہے کہ کل کو وڈیرہ صاحب کس طرح کا فیصلہ کریں گے......؟

اور کیا اس کے فیصلے سے ہمیں کوئی بڑا نقصان تو نہیں ہو گا......؟ اگر زیادہ جرمانہ وغیرہ عائد کیا تو مجبوراً رقم دینی پڑے گی۔ اگلے دن سہ پہر کو بھائی اور ماموں وڈیرے کے پاس گئے تو پیچھے امی اور میں ان کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں کہ وہ بہ عافیت گھر لوٹ آئیں۔

شام ڈھلے جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو ان کے چہروں کا رنگ اترا ہوا تھا اور وہ مایوس دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر امی جان آگے بڑھیں اور فیصلے کے بارے میں پوچھا تو بھائی خاموش ہی رہے۔

پھر امی جان نے اپنے بھائی سے یہ سوال پوچھا تو اس نے کہا۔

وڈیرے صاحب نے چار لاکھ روپے قتل کا ہرجانہ تو ٹھیک رکھا ہے مگر بختو کے سنگ (رشتے) کا فیصلہ ٹھیک نہیں کیا۔ یہ سن کر امی جان اور میرے قدموں تلے سے زمین نکلتی چلی گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی آنسو اُمڈ پڑے ان آنسوؤں اور سسکیوں میں میری کم عمری میں شادی ہوئی تو میں اپنے ہاتھوں میں مہندی اور بدن پر رنگ برنگے کپڑے دیکھ کر خوش ہوئی مگر یہ خوشی رفتہ رفتہ غم میں بدلتی گئی۔ بات بات پر ساس کا بھڑک جانا روز کا معمول بن گیا۔ پہلے پہل ساسو جی گھر کا کام کاج کرتی تھیں مگر بعد میں وہ ذمہ داری بھی میرے کاندھوں پر ڈال دی۔ کم سنی میں پہلے تو مجھے اپنے شوہر رستم خان کی بے رخی کا احساس نہ ہوا مگر جوں جوں میں نے جوانی میں قدم رکھا تو اس کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے اس کے قریب رہنے کی کوشش کی مگر وہ ہر بار مجھے مایوس کر جاتا۔

پہلے ساس کے ظلم و ستم کم تھے کہ شوہر کی بے رخی کا بھی روگ دل کو آ لگا۔ اس رنج اور دکھ میں میں اپنے دل کو یہی سمجھاتی رہتی کہ آخر ایک نہ ایک دن میں رستم خان کو اپنا بنا کے رہوں گی۔

اسی جذبے اور کوشش سے میں نے ایک رات ہمت کی اور نصف شب کو اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کے پہلو میں جا لیٹی تو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مجھے اپنے قریب دیکھ کر غصے سے اپنی چارپائی سے اٹھا اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر دھکا دیتے ہوئے بولا۔

"بختو تو نے میری چارپائی کے قریب آنے کی جرات کیسے کی؟"

اس چارپائی پر تیرا اور تیرے ارمانوں کا جنازہ یہیں سے اٹھے گا۔ اگر تو نے آئندہ میری چارپائی کے قریب آنے کی کوشش کی تو میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں توڑ دوں گا۔

اس کی بات سن کر میرے آنسو بہنے لگے اور میں گڑگڑا کر اس کے قدموں میں گرتے ہوئے بولی۔

"رستم خان تم میرے شوہر ہو اور تم پر میرا بھی حق ہے کہ میں تمہارے ساتھ اٹھوں اور بیٹھوں......؟"

وہ آگے بڑھ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

بختو یہ الفاظ آئندہ اپنے منہ سے مت نکالنا۔ میرے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا مت سوچنا کیونکہ میں تمہیں روز تڑپتا، سسکتا اور روتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سے میرے دل کو سکون سا ملتا ہے۔ کیونکہ جب بھی میں تم کو دیکھتا ہوں تو خون سے لت پت اپنے باپ کی تڑپتی لاش نظر آتی ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا ہے کہ تم میرے باپ کے قاتلوں کی بہن اور بیٹی ہو جن سے میں نے اس وقت تو بدلہ نہیں لیا مگر اب میں تم سے اور تمہارے بھائیوں سے اپنے باپ کا انتقام اسی طرح لیتا رہوں گا اور ساری عمر تمہارے نزدیک نہ آؤں گا۔

اگر تم نے اس بارے میں کسی کو بھی بتانے کی کوشش کی اور اپنا منہ کھولا تو میں کسی راہ چلتے شخص سے تمہیں کاروکاری کے نام پر قتل کر دوں گا۔ جس سے مجھے کوئی بھی شخص برا بھلا نہیں کہے گا بلکہ ایک غیرت مند کے نام سے پہچانا جاؤں گا اور تمہاری عزت خاک میں مل جائے گی۔ اگر اپنی عزت اور زندگی پیاری ہے تو خاموش رہ کر اپنی زندگی گزارو اور ہاں اگلے ہفتے میں نگہت سے شادی کر رہا ہوں۔ اس موقع پر اف تک نہ کرنا۔"

یہ بات کہہ کر وہ تو اپنی چارپائی پر جا کر چین کی نیند سو گیا مگر میرے اوپر قیامت ٹوٹ پڑی۔

میں جس ناز و انداز سے سرخ جوڑے میں دلہن کی طرح اپنی کلائیوں میں رنگ برنگی چوڑیاں کھنکھاتی پھرتی تھی۔ اپنے گورے ہاتھوں پر مہندی سجائے پھرتی تھی۔ ماتھے پہ بندیاں سجائے پھرتی تھی اور اسی امید پر جی رہی تھی کہ ایک نہ ایک دن میرا شوہر میرا ہو جائے گا۔ اور میرے سارے دکھ، سارے غم مٹ جائیں گے اور میں ایک نیا جیون لوں گی۔

مگر اب اپنے ارمانوں کے جنازے پہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں کسی بیوہ کی طرح دھاڑیں مار مار کر روؤں۔

رات بھر میں سسکیاں لے لے کر روتی رہی۔ تڑپتی رہی۔ اپنی پھوٹی قسمت پہ خون کے آنسو بہاتی رہی اور پھر اپنے ہونٹوں پہ چپ کی ایسی مہر لگا دی کہ اپنے آپ پر ہونے والے ظلم و ستم کے بارے میں آج تک میں نے اپنا منہ نہیں کھولا۔ اس لیے نہیں کہ میرا شوہر رستم خان مجھے جان سے مار دے گا بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم کہیں مجھے واقعی کسی راہ چلتے شخص کے ساتھ کارو کاری کے نام پر ذلت آمیز موت نہ دے اور میرے سارے خاندان کی عزت کو خاک میں نہ ملا دے۔

میں بے بسی و محرمی کی زندگی تو جینا چاہتی ہوں مگر ایسی ذلت آمیز موت کبھی بھی نہ چاہوں گی کہ جس سے مجھ پر اور میرے خاندان پر انگلیاں اٹھیں کہ بختو ایسی بدچلن اور بدکار عورت تھی۔

ہاں شہری بابو رستم نے اگلے ہفتے ہی اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے نگہت سے دوسری شادی رچالی مگر تقریباً بیس سالوں سے میرے اندر خاموشی تھی۔ آنکھوں سے اشکوں کی برسات جاری رہتی تھی اور میرے اس درد و غم میں میرا کوئی بھی غم گسار نہیں تھا کوئی ہمدم، کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ میں تنہا یہ سب کچھ جھیل رہی تھی اور اپنی شرم و حیا کی چادر میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی مگر اس شکست زدہ زندگی کے بارے میں میں نے کسی کو بھی کچھ نہ بتایا اور نہ ہی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تھا۔

یہ تو قسمت کی بات ہے کہ میری ساس کو پہلے کھانسی ہوئی جس کا علاج کافی عرصے تک گاؤں میں ہی ہوتا رہا مگر وہ ٹھیک نہ ہوئی پھر جب میرے شوہر کو یہ پتہ چلا کہ اسے کھانسی کے بعد ٹی بی کا مرض لاحق ہوا ہے تو اس نے پہلے نگہت کو کہا کہ وہ شہر جائے مگر اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ میں تمہاری ماں کی طرح ٹی بی کی مریضہ نہیں بننا چاہتی ہوں اس لیے مجبوراً وہ مجھے اپنی ماں کے ساتھ اس ہسپتال میں لائے جہاں آپ کی ماں بھی زیر علاج تھی۔

تم کو پہلی مرتبہ دیکھ کر ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا او پھر بار بار دیکھنے کے لیے میری آنکھیں بے تاب سی رہنے لگیں۔

میں لاکھ کوششوں کے باوجود بھی محبت میں گرفتار ہوتی چلی گئی اور اگر سچ مانو تو مجھے تم سے واقعی سچی محبت ہو گئی ہے۔ مگر چند لمحوں کے لیے میں نہ جانے کیسے بہک گئی تھی اور تمہارے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے یہ بھول گئی تھی کہ میں جس کی عزت و آبرو ہوں وہ تو مجھے ہر بار دھتکارتا رہا ہے اور جو اجنبی شخص ہے وہ مجھے اتنا عزیز کیوں رکھ رہا ہے۔ اسے میری عزت، میری آبرو کا اتنا کیوں خیال رہتا ہے.....؟ شاید یہ بھی ایک انتقام ہے جو میری محبت اس سنگدل سے لے رہی ہے اور اسی محبت کے دم سے میں اب تک جی رہی ہوں اور ابھی تک میری آنکھ میلی نہیں ہوئی کیونکہ شہری بابو نے جاتے جاتے مجھے یہ کہا تھا کہ

بختو میری یہ بات سدا یاد رکھنا کہ
سچی محبت کرنے والوں کے
دلوں میں تصویر صنم
سدا مسکراتی رہتی ہے
اور جب بھی ان کا من کرتا ہے تو وہ
اپنی آنکھیں بند کر کے
ایک دوسرے کا دیدار کر لیتے ہیں
مگر رفتہ رفتہ جب
فاصلے ختم ہو جاتے ہیں
تو آنکھ میلی ہو جاتی ہے
اور اس تصویر پر
ہوس کی گرد آجاتی ہے
بس یہ محبت کا فسانہ ہے
پیار کی کہانی ہے

☆......☆......☆

دنیا رنگ و نور

سدا بہار .... بہار بیگم

رانا زاہد حسین

بہار کا اصل نام کشور تھا۔ کشور کو بہار کا نام انور کمال پاشا نے دیا تھا۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری میں جو بھی ہیروئن آئی وہ معمولی پڑھی لکھی تھی۔ مگر بہار اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ اس نے اعلیٰ تعلیمی ادارے کانونٹ میں تعلیم پائی تھی وہ فرفر انگریزی بولتی تھی۔ اس انگریزی کے لب و لہجے نے اس میں بلا کی خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ بہار کو پہلی دفعہ انور کمال پاشا نے اپنی فلم چن ماہی میں کاسٹ کیا جو 30 نومبر 1956ء کو ریلیز ہوئی اور کامیاب رہی۔ چن ماہی میں بہار کے مقابل اسلم پرویز نے کام کیا تھا۔ چن ماہی کی کامیابی نے بہار کو کامیاب فلمی ہیروئن کی صف میں لا کھڑا کیا چن ماہی کے بعد انور کمال پاشا نے فلم لیلیٰ مجنوں بنانے کا فیصلہ کیا تو اس بہار اور اسلم پرویز کو ہی لیلیٰ مجنوں کے رول میں کاسٹ کر لیا جو چن ماہی کے بعد ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے اور اصل زندگی میں بھی ایک دوسرے کے لیے لیلیٰ مجنوں بنے ہوئے تھے۔

لیلیٰ مجنوں مقابلے پر بن رہی تھی۔ کیونکہ انور کمال پاشا سے پہلے منشی دل بھی لیلیٰ مجنوں کی کہانی پر فلم بنا رہے تھے۔ منشی دل نے اپنی فلم لیلیٰ مجنوں کا نام بدل کر لیلیٰ مجنوں کی بجائے عشق لیلیٰ رکھ دیا۔ عشق لیلیٰ کے فلم ساز سیٹھ جگدیش آنند تھے عشق لیلیٰ میں صبیحہ اور سنتوش کی جوڑی یکجا کی گئی تو صبیحہ سنتوش بھی اس زمانے میں ایک دوسرے کے لیلیٰ مجنوں بنے ہوئے تھے۔ جو بعد میں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بھی بن گئے۔ یہ جوڑی سنتوش کمار کی موت تک برقرار رہی۔

لیلیٰ مجنوں اور عشق لیلیٰ میں محاذ آرائی جاری تھی دونوں فلمیں زور و شور سے بن رہی تھیں۔ بہار اور اسلم پرویز کے مقابلے میں اس وقت صبیحہ اور سنتوش زیادہ مقبول اداکار تھے۔ مگر انور کمال پاشا کو اپنی صلاحیتوں پر زیادہ اعتماد تھا بلکہ یہ کہا جائے کہ گھمنڈ تھا کہ وہ سٹارز کے محتاج نہیں ان کا نام ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ صبیحہ سنتوش اس وقت سٹار تھے۔ مگر انور کمال پاشا نے صبیحہ اور سنتوش کی بجائے نئے ہیرو اور ہیروئن اسلم پرویز اور بہار کو ان پر فوقیت دی تھی۔

عشق لیلیٰ اور لیلیٰ مجنوں کیونکہ مقابلے پر بن رہی تھیں اس لیے انور کمال پاشا نے اپنی فلم کی پبلسٹی کے لیے نئے نئے ٹرینڈ متعارف کروائے فلم کے کرداروں کو عربی لباس پہنا کر اونٹوں پر بٹھا کر لاہور شہر کی اہم سڑکوں پر گھومنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے فلمی شائقین میں ان فلموں کی ریلیز کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔

12 اپریل 1957ء کو یہ دونوں فلمیں ریلیز ہوئیں تو یہ مقابلہ عشق لیلیٰ نے جیت لیا۔ عشق لیلیٰ میں بارہ گانے تھے جو تقریباً سب ہٹ ہوئے۔ جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے تو آج بھی مقبول ہے۔ منشی دل نے یہ مقابلہ جیت لیا۔ منشی دل تقریباً دو سال پہلے اسی طرح کا مقابلہ پہلے بھی جیت چکے تھے۔ جب 1955ء میں منشی دل کی فلم "حمیدہ" کے مقابلے میں ہدایتکار لقمان نے فلم لخت جگر بنائی تھی۔ یہ دونوں فلمیں بھی ایک ہی کہانی پر مبنی تھیں۔ حمیدہ اداکارہ اعجاز کی جبکہ لخت جگر اداکار حبیب کی پہلی فلم تھی۔ یہ دونوں فلمیں ایک ہفتے کے وقفے کے بعد ریلیز ہوئی تھیں۔ حمیدہ 10 فروری 1955ء کو جبکہ لخت جگر 17 فروری 1955ء کو ریلیز ہوئی لخت جگر کے ڈائریکٹر لقمان تھے جو آج کل مشہور ٹی وی اینکر مبشر لقمان کے والد تھے۔ مبشر لقمان نے چند سال پہلے پہلا پیار کے نام سے فلم بنائی تھی جو ناکام

ہوئی تھی۔ اس کے بعد مبشر لقمان نے فلم بنانے سے توبہ کر لی۔

لیلیٰ مجنوں کے بعد انور کمال پاشا نے بہار اور اسلم پرویز کے ساتھ پنجابی فلم زلفاں بنائی جو اوسط درجے کی ثابت ہوئی۔ اس کے بعد بہار نے انور کمال پاشا کی فلم وطن میں اعجاز کے مقابل کام کیا۔ جبکہ فلم میں دوسری جوڑی مسرت نذیر اور کمال کی تھی۔ بہار کی یہ فلم بھی زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد اسلم پرویز اور بہار ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ مگر جب دونوں کی لو سٹوری کی خبریں بہار کی ماں نانی اور اس کے ماموں کے کانوں تک پہنچیں تو انہوں نے بہار پر کڑی نظر رکھنی شروع کر دی۔ بہار اور اسلم پرویز جادوگر، عشق، مٹی دیاں مورتاں، میں ایک دوسرے کے مقابل کام کر رہے تھے۔ ان فلموں کی شوٹنگ کے دوران بہار کی نانی بہار کے ساتھ سائے کی طرح چمٹی رہتی تھی۔ اس ماحول میں کیا خاک معیاری کام ہونا تھا۔ اس لیے یہ ساری فلمیں فلاپ ہو گئیں۔ اس کے بعد بہار کی فلم سوہنی کمہارن بھی فلاپ ہو گئی۔ اس میں بھی اسلم پرویز بہار کے ہیرو تھے۔ گھر والوں کی پابندیوں کے بعد بہار نے دوسرے ہیروز کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ یودی شاہ میں بہار کے ہیرو اکمل تھے۔ ایک تھی ماں میں سدھیر، آبرو میں بھی اکمل، مگر یہ سب فلمیں فلاپ ہو گئیں اور بہار کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

بہار بطور ہیروئن اپنے کیریئر سے مایوس ہو چکی تھی۔ بہار کی اس ناامیدی کو امید میں اشفاق ملک کی فلم سلمیٰ نے بدلا۔ سلمیٰ میں بہار کے مقابل اعجاز نے ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ سلمیٰ نے بہار کے کیریئر کو ایک دفعہ پھر سہارا دیا۔ سلمیٰ ایک انڈین فلم شاردا کی کاپی تھی۔ سلمیٰ کی بیک گراؤنڈ کچھ بھی ہو بہر حال بہار کی کامیابی نے ایک دفعہ پھر بہار کو کامیاب ہیروئنز کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد اسلم پرویز اور بہار کی محبت کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس کے بعد بہار کا نام چند دنوں کے لیے افضال احمد کے ساتھ بھی جوڑا گیا مگر یہ رومان بھی اپنی موت مر گیا۔

اس کے بعد بہار کی زندگی میں ایس ایم یوسف کی آمد ہوئی۔ ایس ایم یوسف بھارت میں کامیاب فلم ڈائریکٹر تھے۔ وہ ممبئی سے کراچی آئے تو انہوں نے اپنی بیوی بچوں کو کراچی چھوڑا اور خود فلم سازی کے لیے لاہور آ کر ڈیرے جما لیے اور یہاں آ کر انہوں نے اپنی شہرہ آفاق فلم سہیلی کا آغاز کر دیا۔ سہیلی کی مین ہیروئنز تو شمیم آراء اور نیئر سلطانہ تھیں۔ بہار بھی ایس ایم یوسف کے گھر سمن آباد میں ان کے گھر چکر لگایا کرتی تھی۔ تو ایس ایم یوسف نے بہار کو بھی ایک ثانوی کردار دے دیا۔ ممبئی کی فلم انڈسٹری میں بھی ایس ایم یوسف کا بڑا نام تھا۔ اس لیے بہار نے یہ ثانوی کردار بھی غنیمت جانا اور دل جمعی سے فلم سہیلی میں کام کیا۔ سہیلی سپرہٹ ہو گئی۔ ایس ایم یوسف کی کامیابیوں کے بعد اس کے بڑے بیٹے اقبال یوسف نے فلم نگری میں قدم رکھا۔ اس نے بہار کو لے کر فلم دال میں کالا بنائی۔ تو واقعی دال میں کالا تھا جو دونوں کی شادی پر سفید ہوا۔ اس کے بعد بہار نے فلمی دنیا چھوڑ کر گھریلو بیوی بن گئی اور پھر دو بچوں کی ماں بن گئی۔ پھر اقبال یوسف کی زندگی میں ایک لڑکی ماہ پارہ آ گئی۔ جس کی وجہ سے اقبال یوسف نے بہار کو طلاق دے دی۔ بہار کے دونوں لڑکے تھے جن کی تعلیم و تربیت کے لیے اسے پھر دس سال بعد فلموں میں کام کرنا پڑا۔ اب اس کی ہیروئن والی عمر تو رہی نہیں تھی۔ اب اس نے فلموں میں ماں کے کردار ادا کرنے شروع کر دیے۔ پھر بہار نے فلموں میں سلطان راہی کی ماں کا رول اتنی بار ادا کیا کہ سلطان راہی بہار کو اپنی ماں ہی سمجھنے لگے۔ حالانکہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ بہار نے ابھی بھی اداکاری سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی ابھی بھی وہ کبھی کبھار ٹی وی ڈراموں میں اداکاری کرتی نظر آتی ہیں کیونکہ پاکستان میں فلمیں تو اب بہت ہی کم تعداد میں بن رہی ہیں۔

☆☆☆

عائشہ سعد

پشاوری کباب

جو لوگ مصالحہ دار اور دیسی کھانوں کے شوقین ہیں ان کے لیے پشاوری کباب ایک نہایت مزیدار ڈش ہے۔

اجزاء:

گائے کا قیمہ	آدھا کلو
کٹا ہوا پیاز	آدھا کلو
دھنیا	دو کھانے کے چمچ
ادرک اور لہسن	1/4 کھانے کے چمچ
گرم مصالحہ	1/2 کھانے کا چمچ
سرخ مرچ	1/2 کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
میٹھا سوڈا	ایک چٹکی
زیرہ اور دھنیا	1/2 کھانے کا چمچ
بیسن	دو چائے کے چمچ

ترکیب:

تمام اجزاء کو قیمے میں ملا دیں اور اسے ایک گھنٹے کے لیے پڑا رہنے دیں ان کے باریک کباب بنا لیں اور نان سٹک برتن میں بہت ہی کم گھی میں فرائی کریں کباب کو دونوں جانب سے اچھی طرح سرخ کر لیں۔ پلیٹ میں روز پیٹل پیپر ٹاول پر رکھ کر پیش کریں تاکہ فالتو چکنائی جذب ہو جائے۔

❀❀❀❀❀

چکن لبنانی کباب

اجزاء:

چکن کا قیمہ	آدھا کلو
آلو ابلے ہوئے	دو درمیانے
مٹر ابلے ہوئے	دو پیالی
گاجر ابلی ہوئی	ایک درمیانہ
میکرونی ابلی ہوئی	ایک پیالی
پسا ہوا ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
ہری مرچ باریک کٹی ہوئی	تین سے چار عدد
ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا	آدھی گٹھی
انڈے	2 عدد
ڈبل روٹی کا چورا	حسب ذائقہ
آئل	تلنے کے لیے

ترکیب:

قیمہ میں ادرک لہسن، نمک، کالی مرچ ڈال کر درمیانی آنچ پر اتنی دیر تک پکائیں کہ اس کا پانی خشک ہو جائے۔ ابلے ہوئے آلو، مٹر گاجر اور میکرونی کو کانٹے کی مدد سے میش کر لیں۔ قیمہ کو ٹھنڈا کر کے ان تمام چیزوں کو اس میں ملا دیں ہری مرچیں، اور ہرا دھنیا ملا کر دس سے پندرہ منٹ کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ پھر اس کے چھوٹے چھوٹے رول کی شکل کے کباب بنا لیں۔ پیالے میں انڈوں کو پھینٹ کر اس میں ایک چٹکی نمک اور کالی مرچ ملائیں اور ایک پلیٹ میں ڈبل روٹی کا چورا رکھ لیں۔ لبنیز کباب کو پہلے انڈے میں ڈپ کریں پھر ڈبل روٹی کے چورے میں اچھی طرح لتھیڑ کر دوبارہ سے دس منٹ کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے ان رولز کو سنہری فرائی کر لیں۔

خوبصورتی سے ڈش میں سجا کر شام کی چائے پر ٹماٹو کیچپ کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

❀❀❀❀❀

نلی نہاری

اجزاء:

بونگ کا گوشت	ایک کلو بڑے ٹکڑے
نلیاں	آدھا کلو
لہسن پسا ہوا	2 کھانے کے چمچ
نمک	حسب ضرورت
پیاز باریک کٹی ہوئی	3 عدد درمیانی
ثابت کالی مرچ	10 سے 12 عدد
دھنیا پسا ہوا	2 کھانے کے چمچ
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچ
سونف	ایک کھانے کا چمچ
بڑی الائچی کے دانے	ایک چائے کا چمچ
سونٹھ	ایک چائے کا چمچ
پپلی	ایک چائے کا چمچ
دہی	ایک پیالی
سادہ آٹا	آدھی پیالی
ادرک باریک کٹی ہوئی	حسب پسند
ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا	حسب پسند
ہری مرچیں، لیموں کٹا ہوا	حسب پسند

ترکیب:

بڑے سائز کے پین میں گوشت، ہڈیوں اور نلیوں کے ساتھ ایک پیاز کالی مرچ اور دس سے 12 گلاس پانی ڈال کر چار سے چھ گھنٹوں کے لیے پکنے رکھ دیں۔ ایک علیحدہ دیگچی میں آئل کو درمیانی آنچ پر 3 سے 4 منٹ گرم کر کے بقیہ 2 پیاز گولڈن فرائی کر لیں۔ لہسن ڈال کر دو سے تین منٹ ہلکا سا فرائی کریں اور پھر آٹا ڈال کر اچھی طرح خوشبو آنے تک بھونیں سونف بڑی الائچی کے دانے، سونٹھ کو باریک پیس لیں دہی میں نمک، لال مرچ، پسا ہوا دھنیا، زیرہ اور پسے ہوئے مصالحے شامل کر دیں اور اس مکسچر کو دیگچی میں ڈال کر اتنی دیر بھونیں کہ تیل علیحدہ ہو جائے۔ پھر اس میں گوشت ڈال کر بھونیں ہڈیوں اور نلیوں کو چھان کر گوشت میں ڈال دیں اور بیس سے پچیس منٹ تک پکائیں کہ گوشت مزید گل جائے پھر چولہے سے اتار لیں۔ ادرک، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، لیموں اور نان کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

❀❀❀❀❀

عنبرین اختر......لاہور

مجھے شکوہ ہے۔ سماج کے ان بے رحموں سے جو "دوستی" کا پاس نہیں رکھتے۔ خدارا "دوستی" کو وقت گزاری کا ذریعہ نہ بناؤ۔ دوستی کا اصل مقصد دو ہاتھ ہیں۔ جو ہر وقت دوسروں کی مدد کے لیے تیار رہتے ہوں۔

"مطلبی لوگ" تو آج کل کے زمانے میں عام ہیں۔ اور یہ عارضی دوستی اس وقت تک چلتی ہے جب تک مطلب پورا نہ ہو جائے۔ اگر "دوستی" کرو تو اسے "نبھاؤ" اور اگر اس میں "خلوص اور چاہت" کی چاشنی شامل کر لو تو "دوستی" کا حق ادا ہو جائے گا۔

☆......☆......☆

آصفہ ......ساہیوال

مجھے شکوہ ہے اپنے چھوٹے بھائی ارسلان سے جو مجھے بہت تنگ کرتا ہے۔ کبھی میری کاپی پھاڑ دیتا ہے، کبھی میری چوٹی کھینچ لیتا ہے۔ اور کبھی میری چیزیں چھپا دیتا ہے، کاش کوئی اسے یہ بتائے کہ بہنوں کو تنگ کرنا کتنی بری بات ہے۔

☆......☆......☆

عائزہ بشیر......لندن

مجھے ان والدین سے شکوہ ہے جو اچھے مستقبل کے لیے دیارِ غیر میں جا بستے ہیں لیکن جب بچے جوان ہوتے ہیں تو ان کے رشتے پاکستان میں کرنا پسند کرتے ہیں جبکہ جوان بچے اپنی روایات کے عادی نہیں ہوتے وران کے لیے شادی شدہ زندگی عذاب بن جاتی ہے۔

☆......☆......☆

ریشمی قارئین کے نام

جو لوگ ادب سے محبت کرتے ہیں۔ وہ کبھی ادب سے دھوکہ نہیں کرتے۔ ان لوگوں کو پتہ نہیں کیا ملتا ہوگا جو لوگ ادب سے دھوکہ کرتے ہیں۔ اپنا نام اونچا کرنے کی غرض سے جھوٹی شان و شوکت دیکھا کر وہ یہ ثابت کر رہے ہوتے ہیں کہ ادب کی دنیا میں شاید میرا بہت بڑا نام بن جائے گا۔

اپنا نام کمانے کی غرض سے وہ ادب سے دھوکہ نہیں کر رہے ہوتے بلکہ وہ لوگ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں۔ سو پلیز کوئی بھی غلط کام کرنے سے پہلے ذرا سوچو کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں۔ اس لیے ضروری ہے کہ جو کچھ بھی لکھوں اپنے قلم سے لکھوں نہ کہ کسی کی شائع شدہ تحریروں کو اپنے نام سے شائع کرواتے رہو۔

(مقصود احمد بلوچ، میاں چنوں)

ریشمی دوستوں کے نام

ریشم میں صائمہ مجید، ایم حسن نظامی، پرنس افضل شاہین، عنبرین اختر، مقصود احمد بلوچ، سجدہ صابر، نگہت غفار، وقاص عمر، اشفاق شاہین، ریاض حسین تبسم، ایم ارشد وفا، شاہد سلیم، فریدہ جاوید فری یوسف زئی، کرن نور، ام جلال بخاری، روبینہ رضا، ملک علی رضا، ارشد وفا وغیرہ اکثر یاد کرتے ہیں۔ میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعائیں دیتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ سب کی مشکلات آسان کر دیں اور آپ سب کو اور بھی کامیابیاں دیں۔ (آمین)

(شیر زمان پشاوری، پشاور)

نوک جھونک میں چٹ پٹے اور شوخ سوالات بھیجنے پر منتخب کردہ پہلے بہترین سوال پر -/500 روپے کا موبائل بیلنس، دوسرے بہترین سوال پر تازہ ریشم ڈائجسٹ کا شمارہ بھیجا جائے گا۔ نوک جھونک کے کالم میں سوالات بھیجنے والوں سے التماس ہے کہ وہ سوال کے ساتھ اپنے مکمل نام کے ہمراہ اپنا موبائل نمبر ضرور تحریر کریں۔ شکریہ

نوٹ: غیر معیاری، غیر اخلاقی، مذہبی یا سیاسی سوالات کو تلف کر دیا جائے گا۔

آمنہ عاصم، اسلام آباد

سوال: بہار کا موسم ہے، میں ہوں اور......؟؟

جواب: میرے گلشن کے مسکراتے پھول ہیں۔

طارق حمید، لاڑکانہ

سوال: اگر کوئی بہار کا دیوانہ ہو جائے تو......؟؟

جواب: تو فوراً بہار بی بی کا رشتہ بھجوا دے۔

عالیہ عمران، بھکر

سوال: جب بہار آتی ہے تو میرا دل کہتا ہے۔

جواب: یہ موسم شادی بیاہ کے لیے ٹھیک رہے گا۔

سعدیہ ریحان، لالہ موسیٰ

سوال: وہ بولے جلدی سے آ کر دیکھو بہار آئی ہے۔ میں نے دیکھا تو......؟

جواب: ان کی چھوٹی بہن "بہار" دروازے پر کھڑی تھی۔

امینہ قادر، بہاول پور

سوال: بہار کے موسم میں میرے دل کی کلی کیوں کھل جاتی ہے؟

جواب: کیوں کہ وہ اپنے لان سے مفت کے پھول جو توڑ توڑ کر بھجواتے ہیں۔

ستارہ بتول، آزاد کشمیر

سوال: تیری صورت نگاہوں میں پھرتی رہے عشق تیرا ستائے تو میں کیا کروں؟

جواب: توبہ استغفار کرو لڑکی...... باؤلی ہوئی ہو کیا...... جہاں ماں باپ نے رشتہ طے کر دیا ہے وہیں دل لگاؤ۔

آصفہ ناز، میانوالی

سوال: جلدی سے بتائیے کل آپ گدھا گاڑی میں بیٹھے کہاں جا رہے تھے؟

جواب: تم نے خود ہی تو اپنی سجی سجائی گاڑی ڈرائیور سمیت مجھے لینے بھیجی تھی۔

غانیہ نہال، ہیچہ وطنی

سوال: ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی...... بھلا

پہلا انعام یافتہ سوال

رابعہ نصیر، گجرات

سوال: ساس، سسر، سالی، سالا، سسرال ان تمام رشتوں کا آغاز "س" سے کیوں ہوتا ہے؟

جواب: تاکہ سدھانے کے خلاف بوقت ضرورت سیریس اور سخت قسم کا سٹیپ اٹھایا جا سکے۔

(نوٹ: آپ کے موبائل نمبر پر 500 روپے کا بیلنس بھیجا جا رہا ہے، ملنے پر آفس میں اطلاع کریں)

دوسرا انعام یافتہ سوال

ارسلان صمد، آزاد کشمیر

سوال: آج کل محبتوں کا قحط کیوں پڑ گیا ہے؟

جواب: گرلز کالجز میں سردیوں کی تعطیلات کی وجہ سے۔

(نوٹ: آپ کو ریشم ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ بطور انعام ارسال کیا جا رہا ہے ملنے پر مطلع کیجئے گا)

کونسی مٹی؟

جواب: تمہارے دماغ میں جو مٹی اور گرد و غبار بھوسے سمیت بھرا ہوا ہے۔ اس کی بات ہو رہی ہے احمق لڑکی! کبھی عقل کا استعمال بھی کر لیا کرو۔

* * * * * *

صوفیہ اصغر، لاہور

سوال: بہار کا موسم بھلا کسے اچھا لگتا ہے؟

جواب: جنہیں گرمی، سردی، اور برسات کا موسم اچھا نہیں لگتا۔

* * * * * *

حنا شاہین، کراچی

سوال: میرے شوہر موٹے کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟

جواب: آپ کی پڑوسن مزے مزے کے کھانے جو بھجوانے لگی ہے۔

* * * * * *

پرویز تبسم، پشاور

سوال: ہمارا منہ فٹے منہ کب لگنے لگتا ہے؟

جواب: جب تمہیں اپنے اردگرد چکراتے دیکھ کر لڑکیاں کہنے لگتی ہیں کہ "دُر فٹے منہ، تیرے گھر میں ماں بہن نہیں ہیں۔"

عنبرین اختر، لاہور

سوال: کبھی ایسا بھی ہوا طلحہ بھیا! کہ آپ کسی سوال سے لاجواب ہوئے ہوں۔

جواب: ابھی تک حسرت ہی ہے کہ کوئی ایسا بھی سوال آئے۔

* * * * * *

عارفہ رشید، ساہیوال

سوال: کوئی ایسا مصرعہ سنائیں کہ واہ واہ کے بجائے آپ کو پیسے نکال کر دینے کو دل کرے۔

جواب: دے جا سخیا راہ خدا، تینوں اللہ ای بوٹا لاوے گا۔

* * * * * *

شفیع الدین، احمد پور شرقیہ

سوال: محبوبہ کو منانے کا آسان ساحل بتائیں؟

جواب: محبوبہ کی سہیلی سے دوستی کر لیں۔

* * * * * *

جہاں آراء، حیدرآباد

سوال: محبت کی کون سی قسم اچھی ہوتی ہے؟

جواب: جو محبت کا جواب محبت سے دے اور کچن میں جا کر آپ کے لیے کھانا بھی پکا سکے اور آپ کی ذات سے وابستہ ہر رشتے کا احترام کر سکے۔

* * * * * *

آپ کے روبرو

انٹرویو: سید عرفان عرفی — ملاقات: روبینہ رضا

س: آپ کا نام

ج: سید عرفان حیدر ہمدانی قلمی نام: سید عرفان عرفی

س: تاریخ پیدائش؟

ج: 8 دسمبر 1976

س: آپ کس شعبے سے وابستہ ہیں؟

ج: روزگار کے حوالے سے کنسٹرکشن اور کتابت سے ادبی حوالے سے شاعری، افسانہ نویسی اور ترجمہ نگاری سے۔

س: تعلیمی قابلیت؟

ج: سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ۔

س: شادی شدہ یا غیر شادی شدہ

ج: تا حال کنوارہ۔

س: آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟

ج: شادی ہو ہی نہیں رہی فی الحال۔

س: کیا آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟

ج: جی ہاں محبت ہوئی تھی۔

س: تو کیا آپ نے بات آگے نہیں بڑھائی تھی؟

ج: بات بنتے بنتے بگڑ گئی اور خواہش حسرت بن گئی بس...... اس پر ایک شعر لکھا۔

اسی لیے تو ہم انکار تک نہیں پہنچے
خدا کا شکر تھا اقرار تک نہیں پہنچے

س: آپ Love Marrige پر یقین رکھتے ہیں یا ارینج؟

ج: دونوں پہ ہی یقین ہے کوئی ایک بھی نہیں ہو رہی (ہاہاہاہا......) دعا کریں۔

س: آپ کو اپنی کونسی عادت پسند ہے اور کونسی ناپسند؟

ج: شعر

کام آتا ہوں دوسروں کے بہت
مجھ میں اک یہ بڑی خرابی ہے

اور یہی عادت ناپسند ہے۔ کہ خود کو اکثر نظر انداز کر دیتا ہوں۔ دوسروں کی خاطر۔ اس لیے بہت پیچھے رہ گیا۔

بہت پیچھے کہیں پہ رہ گیا ہوں
میں خود سے بھی بچھڑ کر رہ گیا ہوں

(ٹھنڈی اور گہری سانس لے کر)

مکمل کب ہوا منزل پہ آ کر
میں کچھ راہ میں تو کچھ گھر رہ گیا ہوں

س: کیا آپ شاعری کرتے ہیں؟ کیونکہ اکثر سوالات کے جوابات میں آپ نے شعر کہے ہیں؟

ج: جی ہاں! میں شاعری کرتا ہوں اور یہ اشعار میرے اپنے ہی ہیں۔

س: کیا آپ نے کوئی بک شائع کروائی یا آپ کی شاعری کہیں لگی؟

ج: جی پاکستان اور پاکستان سے باہر کئی جرائد اور اخبار میں میرا کلام، افسانے اور تراجم بھی لگے ہیں۔ میری شاعری کی بک دیر سے آئے گی پہلے ہندی ترجموں کی کتاب آئے گی۔

س: ریشم ڈائجسٹ سے آپ کا تعلق کب سے ہے؟

ج: سات آٹھ سالوں سے۔

س: کیا آپ گھر کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں؟

ج: جی ہاں میں گھر کے تمام کاموں میں سب سے زیادہ حصہ لیتا ہوں۔ سب کام بہت شوق اور خوشی خوشی کرتا تھا اب تھوڑا الیزی ہو گیا ہوں۔

س: آپ بہت اچھے کک بھی ہیں Whats app میں ریشمی گروپ میں آپ کے بنائے ہوئے مزے مزے کے کھانے دیکھ کر منہ میں پانی آجاتا ہے؟
ج: تو سیکھ لیں ہم سے کچھ۔
س: جب آپ گھر والوں کو اتنے مزے مزے کے کھانے بنا بنا کر کھلائیں گے تو وہ بھلا آپ کی شادی کیوں ہونے دیں گے عرفی جی......
ج: اوئی ای جی! اہے تے میں کدی سوچیا ہی نہیں
س...... لیکن بیٹیاں بھی تو کھانا بناتی ہیں ان کی بھی تو شادی ہو جاتی ہے ناں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ چلیں میری ڈولی ہی رخصت کر دیں۔
س: ریشم ڈائجسٹ سے آپ کا تعلق کیسے بنا؟
ج: ریشم سے تعلق بحیثیت لکھاری، اس زمانہ سے ہے جب اسے مصطفیٰ ہاشمی اور سیما غزل کراچی سے شائع کرتے تھے۔ بعد میں بشریٰ سرور صاحبہ نے سنبھالا تو اس کا پہلا سب ایڈیٹر بھی بنا۔ کچھ ناتجربہ کاری کی وجہ سے جاری نہ رکھ پایا۔ مگر قلمی تعاون گاہے گاہے جاری ہے۔
س: پسندیدہ خوشبو؟
ج: چارمنٹ
س: پسندیدہ گانا؟
ج: جب یہ دل اداس ہوتا ہے......
س: سیاست سے دلچسپی ہے؟
ج: تھوڑی بہت۔
س: کونسے سیاسی لیڈر سے متاثر ہیں؟
ج: قاضی حسین احمد
س: آپ کے نزدیک محبت کیا ہے؟
ج: محبت کا جذبہ ایک اٹل اور مضبوط حقیقت ہے۔
س: لوگ دل کیوں توڑتے ہیں؟
ج: انسان کے اندر ہمدردی کے علاوہ تشدد کرنے اور سہنے کا جذبہ بھی ہوتا ہے اور یہ اسی کے مرہون منت ہے۔
س: آپ کا آئیڈیل کیسا ہے؟
ج: صاف گو، متحمل مزاج، اور بردبار۔
س: آپ نے پہلی بار کب کچھ لکھا۔
ج: سکول و کالج دور سے ہی بچوں کے اخبار اور رسائل میں حصہ لیتا آیا۔ ادب میں سنجیدہ و باقاعدہ نہ ہو سکا۔ ہنوز یہی کیفیت طاری ہے۔
س: اگر آپ کو ایک دن کے لیے بشریٰ آپی کی سیٹ پر بٹھایا جائے تو آپ کیا کریں گے؟ ریشم کے حوالے سے پوچھا ہے۔
ج: پرانی روایات کو برقرار رکھنے کی اپنی سی کوشش۔
س: زندگی کیا ہے؟
ج: زندگی مسلسل آزمائش ہے۔
س: آپ کو اگر Lover مل جائے مگر یوں کہ درمیان میں شیر ہو آپ مقابلہ کر کے اسے پالیں گے یا جان بچا کر بھاگ جائیں گے۔
ج: مقابلہ......
☆ارے لڑکیوں اب تو کچھ غور کرو۔ (ہاہاہا) عرفی بھائی کے بارے میں......
س: آپ تنہائی میں کیا سوچتے ہیں؟
ج: بہت کچھ بلکہ سب کچھ......
س: شہرت، کیسی لگتی ہے؟
ج: کبھی شہد کبھی زہر۔
س: سنا ہے کہ آپ بہت کم سوتے ہیں؟ کیوں؟
ج: جب سوتا ہوں تو بہت سوتا ہوں۔ رات کو Online کام کرتا ہوں۔ سو دیر ہو جاتی ہے اکثر نیند سے جنگ ہوتی رہتی ہے۔
س: کسی شخص سے پہلی ملاقات میں کس چیز کو نوٹ کرتے ہیں؟
ج: صورت، لباس، ادا۔
س: ریشمی لوگوں کے لیے کوئی پیغام
ج: خودی کی کھوج لازمی کیا کریں۔ ورنہ خود سے دور ہو جائیں گے۔

روحانی معالج

باری بخار کا علاج

اگر خدانخواستہ کسی کو باری کے بخار کا عارضہ لاحق ہو گیا ہو اور کسی حکیم یا طبیب یا ڈاکٹر سے اس کا علاج ممکن نہ رہا ہو تو اسے چاہیے کہ اللہ کے پاک کلام سے اپنا علاج کرے۔ اس مقصد کے لئے اسے چاہیے کہ وہ اس عمل کو اختیار کرے۔ یہ عمل اس کے لئے بے حد مفید ہے۔
اس مقصد کے حصول کے لئے باوضو حالت میں قبلہ رخ بیٹھ کر چینی کی ایک پلیٹ پر زعفران و گلاب سے سورۃ اخلاص لکھیں اور تازہ پانی سے اس دھو کر پانی مٹی کی صراحی میں ڈال کر اس پر ایک ہزار مرتبہ درود ذیل پڑھ کر دم کرے۔
اللھم صلی علی سیدنا محمد و حبینا و شفیعنا و نصرنا محمد و علیٰ آل صحبه آله و اصحابه اجمعین.
پڑھ کر دم کریں جب بھی مریض کو پیاس لگے اس صراحی سے پانی پی لے۔ انشاء اللہ بخار جاتا رہے گا۔ اس عمل سے تاحیات مکمل شفا حاصل ہوگی۔ روزانہ تازہ پانی بنائیں اور بچا ہوا پانی کسی پاک جگہ پر پھینک دیں۔

☆☆☆☆☆

آنکھ کے ککروں کا علاج

جس شخص کی آنکھوں میں ککرے پڑ گئے ہوں تو اس کے علاج کے لئے ذیل کا عمل بے حد مفید ہے۔
اس مقصد کے لئے بکرے کی کلیجی لے کر اس کے سات ٹکڑے کرلیں ان کو توے پر بھون لیں۔ پھر ہر ایک ٹکڑے پر تین مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھیں اور مریض کو کھلا دیں۔ باری باری ہر ٹکڑے پر یہی عمل کرنا ہوگا۔ اور بعد میں مریض کو کھلانا ہوگا۔ انشاء اللہ اس عمل کی بدولت آنکھ کے ککروں سے مکمل نجات مل جائے گی۔

☆☆☆☆☆

پیٹ کے درد کیلئے وظیفہ

جس شخص کے پیٹ میں درد شدید ہو اور آرام نہ آ رہا ہو تو ایسے میں ذیل کا عمل بے حد مفید ہے۔
اس مقصد کے لئے سب سے پہلے عامل کو چاہیے کہ وہ اچھی طرح سے وضو کرے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے اور بسم اللہ شریف کے ساتھ سورۃ اخلاص کو ستر مرتبہ پڑھ کر دم کرے۔ انشاء اللہ اس عمل سے شفایاب ہوگا اور کبھی بھی پیٹ درد کی شکایت نہ ہوگی۔

☆☆☆☆☆

قبولیت کی دعا

جو شخص اس بات کا خواہش مند ہو کہ بارگاہ الٰہی میں اس کی ہر دعا قبول ہو تو ایسے میں اس پر لازم ہے کہ وہ ذیل کا عمل شروع کرنے سے پہلے رزق حلال اختیار کرے پابند صوم صلوۃ بنے اور مکروہات دین و دنیا چھوڑ دے۔ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت استغفار کرتا رہے۔ پھر اس مقصد کے لئے اتوار کے دن طلوع آفتاب سے قبل بعد از نماز فجر انتہائی عاجزی و انکساری کے ساتھ دس مرتبہ سورۃ کافرون پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے مقصد کے لئے دعا مانگتا رہے۔ دعا کم از کم پندرہ منٹ تک انتہائی عاجزی سے مانگے انشاء اللہ مقصود بفضل الٰہی حاصل ہوگا۔

☆☆☆☆☆

خودکلامی

آج تو بے سبب اداس ہے جی
عشق ہوتا تو کوئی بات بھی تھی
(وقار عظیم، اسلام آباد)

تیرا وجود رواجوں کے اعتکاف میں ہے
میرا وجود تیرے عین، شین قاف میں ہے
(سرور نواز، راولپنڈی)

زمانے بھر کے سوالوں کو میں ہنس کے ٹال دوں لیکن
نمی آنکھوں کی کہتی ہے مجھے تم یاد آتے ہو
(صدف امتیاز، ملتان)

اٹھانا خود ہی پڑتا ہے تھکا ٹوٹا بدن اپنا
کہ جب تک سانس چلتی ہے کوئی کندھا نہیں دیتا
(آسیہ شاہین، چکوال)

معصوم نظر، بھولا مکھڑا، ہونٹوں پہ تبسم، شوخ ادا
تصویر کا جب یہ عالم ہے، وہ حسن مجسم کیا ہوگا
(نور، لالہ موسیٰ)

تو نے انداز محبت دیکھا ہے انداز وفا نہیں
پنجرے کھول بھی دو تو پرندے جایا نہیں کرتے
(نور، لالہ موسیٰ)

سب وعدہ کرتے ہیں ہو جاتے ہیں بے وفا
تم اپنا اعتبار لے کر واپس آ جانا
(عنبرین اختر، لاہور)

یہ مصنوعی حسن والے کیا جانیں کیا سمجھیں گے
سادگی سے لوٹ لینے کی، ادا کچھ اور ہوتی ہے
چھن چھن چھنکتے سکوں کے پجاری کیا جانیں گے نور
دلوں کے ٹوٹ جانے کی صدا کچھ اور ہوتی ہے
(سیدہ نور العین زاہرہ، تلمبہ)

مفلس کو امیروں کے گناتے ہیں گناہ
دولت انہیں دے دو تو قیامت کر دیں
(محمد ہاشم انصاری، سیالکوٹ)

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں
(ثمینہ عثمان، خانیوال)

جرات ہے تو پیدا کر خود خلد بریں اپنی
بخشی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا
(نسیم سلطانہ، راولپنڈی)

نہ دنیا سے، نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے
تسلی دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے
(ایم اے صدیقی، گوجر خان)

حسن خیال یار کا اعجاز دیکھئے
پرچھائیاں بھی بن گئیں پیکر سی دھوپ میں
(نسرین فاطمہ، جھنگ)

طوفان کر رہا تھا میرے عزم کا طواف
دنیا سمجھ رہی تھی کہ کشتی بھنور میں ہے
(عالیہ نیازی، کمالیہ)

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا
(ایوب احمد، ملتان)

قطرہ زباں پہ رکھ لیا تو شور مچ گیا
وہ پی گئے لہو کا سمندر میں چپ رہا
(انیس الرحمٰن، سرگودھا)

نہ محبت، نہ مروت، نہ شرافت، نہ خلوص
میں تو شرمندہ ہوں اس دور کا انساں ہو کر
(ایم یوسف انصاری، کراچی)

کبھی ہمارے نقوش قدم کو ترسیں گے
وہی جو آج ستارے ہیں آسمانوں کے
(افتخار احمد، سکھر)

اپنے حالات سے میں صلح تو کر لوں لیکن
مجھ میں روپوش جو اک شخص ہے مر جائے گا
(طلعت پروین، فیصل آباد)

مسیحا کون بنے سارے ہاتھ آلودہ
لہولہان ہے دھرتی کہاں سے مرہم آئے
(محمد یاسین عبدالعزیز، ایبٹ آباد)

احتیاطاً دیکھنا چل اپنے سائے کی طرف
اس طرح شاید تجھے احساس تنہائی نہ ہو
(شمیم ناز، ملتان)

بگڑ کر کوئی بنتا ہے کوئی بن کر بگڑتا ہے
یہی دنیا کا نقشہ ہے اسی کا نام دنیا ہے
(عبدالسلام، کراچی)

قفس میں دیتے ہو کیوں؟ طعنہ ست پروازی
فضا کھلی ہوتی تو امتحاں ہوتا
(ارشاد احمد، بہاولپور)

تیرا کرم تو عام ہے دنیا کے واسطے
میں کتنا لے سکا یہ مقدر کی بات ہے
(عرفان اختر، ہارون آباد)

زندگی کے بوجھ کو ہنس کر اٹھانا چاہیے
راہ کی دشواریوں پر مسکرانا چاہیے
(عائشہ خاتون، چیچہ وطنی)

چپ ہوگیا ہوں آپ کی صورت کو دیکھ کر
کرنی تھیں آپ سے مجھے کتنی شکایتیں
(سلیم اختر، راولپنڈی)

اپنے آنچل پہ ستاروں سے میرا نام نہ لکھ
میں تیرا خواب ہوں پلکوں پہ سجا لے مجھ کو
(عبدالمقیت، شیخوپورہ)

پرورش خوف کے ماحول میں ہوگی جس کی
اپنی پرچھائیں بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا
(خلیل احمد، سکھر)

فرصت کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو
(فوزیہ انجم، ساہیوال)

ترتیب: سعدیہ عقیل

انمول موتی

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب رات کو سونے کے لیے لیٹتے تو دونوں ہتھیلیوں کو ملاتے اور سورۃ اخلاص، سورۃ فلق، سورۃ الناس پڑھ کر ہتھیلیوں میں دم کرتے۔ پھر جہاں تک آپ کے ہاتھ مبارک پہنچ سکتے ان کو جسم مبارک پر پھیرتے۔ پہلے سر اور چہرے اور جسم کے سامنے کے حصے پر پھیرتے۔ یہ عمل تین مرتبہ فرماتے۔

(ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ)

❋❋❋❋❋

وقت مشاہیر کی نظر میں

☆ وقت ہمارے پاس اس طرح آتا ہے جس طرح بھیس بدل کر دوست تحفے لے کر آتا ہے۔ مگر جب ہم ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو وہ چپ چاپ اپنے تحفوں کے ساتھ واپس چلا جاتا ہے۔

☆ وقت ضائع کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھیں کہ وقت بھی آپ کو ضائع کر رہا ہے۔

☆ وقت دولت کی مانند ہے جس کا اسراف واجب نہیں یاد رکھو کہ تم دولت تو کما سکتے ہو وقت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔

☆ آپ مسرور ہوں یا مغموم تکلیف اور مصیبت سے بچنے کا یہی واحد طریقہ ہے کہ آپ کے پاس وقت نہ ہو۔

☆ وقت ایک ایسی زمین ہے جس پر محنت کے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا اگر محنت کی جائے تو زمین پھل دینے لگتی ہے۔ اگر بیکار چھوڑ دی جائے اس میں خار دار جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔

(مسز نگہت غفار، کراچی)

❋❋❋❋❋

غزل

وہ بدل گیا آج اپنے وعدوں کو توڑ کر
کہنے لگا کہ کسی اور کے ہو جاؤں تم مجھ کو چھوڑ کر
میں نے کہا کہ میں تو مر جاؤں گا بن تیرے
وہ کھڑا ہو گیا یہی میرے سامنے ہاتھوں کو جوڑ کر
میں دیکھتا رہا حسرت سے اس کے چہرے کی طرف
اور وہ چل دیا یہیں مجھ کو تنہا چھوڑ کر!
کبھی تو اس کو بھی یہ احساس ہو گا اے بلوچ
کہ میں نے اس کو چاہا تھا ساری دنیا کو چھوڑ کر

(مقصود احمد بلوچ، میاں چنوں)

❋❋❋❋❋

سکون

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا "میرے جوتے مجھے بہت تنگ کرتے ہیں۔"

دوست: "تم روزانہ یہی کہتے ہو اور ہمیشہ لنگڑا کر چلتے ہو۔ آخر تم جوتا بدل کیوں نہیں لیتے؟"

"سنو! جب میں گھر پہنچتا ہوں تو عموماً کھانا تیار نہیں

ہوتا۔ اگر تیار ہو بھی تو کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ میرے گھر میں میری ساس، برادر نسبتی، اپنی بیوی اور چھ بچوں کے ہمراہ رہتا ہے۔ میرا گھر سڑک پر ہے۔ ٹریفک کا شور کان کے پردے پھاڑ دیتا ہے۔ گاڑیاں ہر وقت چیں چیں کرتی گزرتی ہیں۔ میرے پڑوسی کو اونچی آواز میں ڈیک سننے کی عادت ہے۔ میری بیوی ہر وقت بیمار رہتی ہے۔ ہر وقت اس کی ہائے ہائے ہوتی رہتی ہے۔ ان حالات میں گھر جا کر جوتے اتارتا ہوں تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کتنا سکون ملتا ہے۔"

(وقار حسین، کراچی)

❋❋❋❋❋

دلچسپ معلومات

☆ قرآن پاک میں زندگی کا ذکر 145 بار آیا ہے اور موت کا ذکر بھی 145 بار آیا ہے۔

☆ فرشتوں کا ذکر 88 بار آیا ہے اور شیطان کا ذکر بھی 88 بار آیا ہے۔

☆ دنیا کا ذکر 115 بار آیا ہے اور آخرت کا ذکر بھی 115 بار آیا ہے۔

☆ ابلیس کا ذکر 11 بار آیا ہے اور اس سے پناہ کا ذکر بھی 11 بار آیا ہے۔

☆ مصیبت کا ذکر 75 بار آیا ہے اور شکر کا ذکر بھی 75 بار آیا ہے۔

(فیصل عثمان، لاہور)

❋❋❋❋❋

کتابیں

کتب فروش: (لڑکے سے) "تم ہر روز کتابیں الٹ پلٹ کر چلے جاتے ہو، مگر آج تک تم ایک بھی کتاب نہیں لے کر گئے۔"

لڑکا: "واہ جناب! میں تو ہر روز ایک یا دو کتابیں لے جاتا ہوں اب آپ کو پتا نہیں چلتا تو میں کیا کروں؟"

(شرجیل عابد، لاہور)

❋❋❋❋❋

خواہش

ایک وکیل نے اپنے دوست کو اپنی زندگی کے پر لطف واقعات سناتے ہوئے ایک مقدمے کا ذکر کیا، جس میں ایک عورت نے نان نفقے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! مجھے اپنے شوہر سے کچھ نہیں چاہیے...... میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ میرا شوہر مجھے اسی حالت میں چھوڑ دے، جس میں اس نے مجھے پایا تھا۔"

"اور وہ حالت کیا تھی؟" جج نے پوچھا۔

"میں بیوہ تھی......!" عورت سر جھکا کر بولی۔

(طارق حسین، لیہ)

❋❋❋❋❋

انجام

ایک روز باس وقت مقررہ سے پہلے دفتر آ گئے تو انہوں نے اپنے کلرک کو ایک کونے میں لیڈی اسٹینوگرافر کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف پایا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے کلرک کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں اسی کام کی تنخواہ دی جاتی ہے؟"

کلرک نے جواب میں مودبانہ عرض کیا۔

"نہیں جناب......! یہ کام تو میں بلا معاوضہ انجام دیتا ہوں۔"

(سلیم رضا، فیصل آباد)

❋❋❋❋❋

غلطیاں

☆ اس نیت سے برے کام کرنا کہ صرف دو چار مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔

☆ اپنا راز کسی کو بتا کر پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔

☆ آزمائے ہوئے کو آزمانا۔

☆ اپنے آپ کو سب سے زیادہ لائق اور عقلمند تصور

کرنا۔
☆ ہر ایک شیریں زبان کو دوست سمجھ لینا۔
(محمد علی، آزاد کشمیر)

❁❁❁❁❁❁

انمول موتی

☆ بعد کی پشیمانی سے پہلے کی احتیاط بہتر ہے۔
☆ مظلوم کی بددعا سے ڈرو کیونکہ اس کی بددعا شعلے کی طرح آسمان پر جاتی ہے۔
☆ شرم صرف نگاہوں کی ہی نہیں بلکہ دل و دماغ اور زبان کی بھی ہوتی ہے۔
☆ زندگی ایک خوبصورت تتلی ہے جو اپنے خوبصورت رنگین پر دکھا کر ہر انسان کو ورغلاتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پھولوں سے لدی کیاریوں میں گم ہو جاتی ہے۔

(پرنس افضل شاہین، بہاولنگر)

❁❁❁❁❁❁

تلاش

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ارشاد فرمایا۔ "میں نے چھ چیزوں کو چھ چیزوں میں چھپا رکھا ہے لیکن لوگ انہیں غیر محل میں تلاش کرتے ہیں، اس لیے وہ نہیں پاتے۔
☆ علم کو میں نے سفر اور بھوک میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے وطن اور شکم سیری میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ راحت کو میں نے جنت میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ عزت کو میں نے شب بیداری میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے سلاطین کے دربار میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ بلندی کو میں نے تواضع اور انکساری میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے غرور میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ دعا کی قبولیت کو میں نے لقمہ حلال میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے لقمہ حرام میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ تونگری کو میں نے قناعت میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے حرص میں تلاش کرتے ہیں۔
(انتخاب: صوفیہ اصغر، لاہور)

❁❁❁❁❁❁

مسکراہٹ

مسکراہٹ محبت کی زبان اور حسن کا سنگھار ہے۔ یہ زندہ دلی کی علامت اور اچھی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔
مسکراہٹ ایک ایسا نذرانہ ہے، جسے غریب سے غریب آدمی بھی پیش کر سکتا ہے۔ کس قدر عظیم ہے وہ شخص، جو دل میں غموں اور دکھوں کا بوجھ رکھتا ہے مگر چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھتا ہے۔

(صبا امتیاز، کراچی)

❁❁❁❁❁❁

پیار اور تحفہ

پرخلوص دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ یہ بہاروں کی رت میں خوشبو بن کر، ابر باراں میں بوندوں کی طرح، وقت کے ساغر میں سیپ کے اندر موتیوں کی صورت میں بالآخر ان تک جا پہنچتی ہیں، جن کے لیے ہمارے دل میں جنم لیتی ہیں۔ یہ دعاؤں کا تحفہ سب سے پیارا اور انمول ہوتا ہے۔

(سفینہ خالد، ملتان)

❁❁❁❁❁❁

تجزیہ

ایک صاحب ایک تحریر کا نمونہ لے کر اس کا تجزیہ کرانے ماہر تحریر شناس کے پاس پہنچے۔
تحریر کا تجزیہ کرنے کے بعد بولے۔ "یہ الفاظ لکھنے والا شخص، انتہائی تحمل مزاج، صابر، شائستہ اور بامروت ہے......"

"بس......بس......ٹھیک ہے!" وہ صاحب مطمئن ہو کر بولے "دراصل میں جس نئی کالونی میں شفٹ ہوا ہوں، یہ وہاں کے جنرل اسٹور کا مالک ہے۔ میں اس سے ادھار سودا لینا شروع کر رہا ہوں۔"
(اختر ہاشمی، جھنگ صدر)

❁❁❁❁❁❁

ٹاس

مچھلی کے شوقین شکاری نے دریا میں ڈور ڈالتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔
"میں کوئی بھی کام ٹاس کے بغیر نہیں کرتا۔ اس لیے کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ آج صبح بھی ٹاس کر کے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے مچھلی کے شکار پر جانا چاہیے یا عبادت کے لیے۔"
"پھر کیا ہوا؟" ساتھی نے پوچھا۔
"بڑا سخت مرحلہ تھا۔ مجھے چھ دفعہ سکہ اچھالنا پڑا۔ تب کہیں جا کر شکار کے حق میں فیصلہ ہوا۔"
(شاہین، سرگودھا)

❁❁❁❁❁❁

غزل

اک خواب جو دیکھا بچپن میں
وہ آنکھ سے برسا ساون میں
مجھے یاد تمہاری آتی ہے
ہوتا ہوں جب میں الجھن میں
وہ چاند فلک پہ شرمائے!
جب چاند مرا ہو گلشن میں
بس درد تمہارا ہوتا ہے
اس دل کی ہر اک دھڑکن میں
یہ کس کو چھو کے آئی ہوا
خوشبو ہے بکھری آنگن میں
جب تو ہی مجھ سے روٹھ گیا
اب کیا ہے میرے جیون میں
وہ عکس ہے آنکھوں میں شاہ روم
جب دیکھا اس کو جوبن میں
(شاہ روم خان، مظفر آباد)

❁❁❁❁❁❁

کنجوسی

ساجد حد سے زیادہ کنجوس تھا گو کہ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی مگر پھر بھی اس کی جیب سے پیسہ نہیں نکلتا تھا۔
ایک دن یہ نو بیاہتا جوڑا کلفٹن گیا۔ نئی نویلی بیگم نے جھولے پر بیٹھنے کی فرمائش کی تو ساجد نے کہا "نہیں بھئی تمہیں چکر آ جائے گا" چاٹ کھانے کی فرمائش کی تو ساجد نے کہا" بازار کی چیزیں گندی ہوتی ہیں ابھی تمہاری شادی ہوئی ہے تمہیں ڈائریا ہو گیا تو کیا کروں گا میں؟"
"مگر پاپ کارن کی خوشبو کتنی اچھی لگ رہی ہے" دلہن سے نہ رہا گیا۔
"وہ تو ٹھیک ہے چلو تمہیں پاپ کارن کی مشین کے پاس لے چلوں وہاں سے خوشبو زیادہ اچھی آئے گی۔"

(زبیدہ نذیر، لاہور)

❁❁❁❁❁❁

نہیں تم جھوٹ کہتی ہو

نہیں تم جھوٹ کہتی ہو
کہ تم کو مجھ سے نفرت ہے
مجھے معلوم ہے اتنا
کہ تم جتنا بھی چاہو
مجھ سے نفرت کر نہیں سکتیں
نہیں تم جھوٹ کہتی ہو
چلو، میں چند لمحوں کے لیے یہ مان لیتا ہوں
کہ تم کو مجھ سے نفرت ہے
مگر یہ بھی تو میرے واسطے اعزاز ہے جاناں
کہ تم نے زندگی میں گر محبت کی تو مجھ سے کی
جو نفرت کی تو مجھ سے کی
(مہناز شاہد، ملتان)

چہروں کے مطابق ہیئر سٹائل کا انتخاب

بالوں کو اسٹائل دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان خواتین کے ساتھ بھی یہ بڑا مسئلہ بن سکتا ہے جن کے بال آسانی سے سنور جاتے ہیں۔ اس کا انحصار بالوں کی ساخت پر ہوتا ہے کہ کون سا اسٹائل درست رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ بناوٹ اور رنگ میں مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح چہرے کو بھی مدنظر رکھنا ہوتا ہے کیونکہ ہر چہرے پر ہر اسٹائل اچھا نہیں لگتا ہے۔ اگر چہرے کی بناوٹ کو دھیان میں رکھے بغیر بالوں کو اسٹائل دیا جائے گا تو لمبا چہرہ اور لمبا اور پتلا چہرہ مزید پتلا ہو جائے گا۔ آپ اس طرح سے بال بنائیں کہ اگر چہرہ لمبا ہے تو چھوٹا اور پتلا ہے تو موٹا نظر آئے......!

بالوں پر تجربات کرنے ہوں تو اس معاملے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں۔ ہمیشہ اس کے لیے زیادہ وقت نکالیں اور وقت کم ہو تو سادہ اسٹائل اپنائیں...... اگر آپ نے بالوں کو سیدھا یا گھنگھریالے کروایا ہے تو بالوں میں زیادہ چیزوں کا استعمال نہ کریں مثلاً جیل، ماؤس یا ہیئر اسپرے کیونکہ ان بالوں پر کیمیکل کے اثرات موجود ہوتے ہیں اور اگر آپ ایسا کریں گی تو آپ کے بال کمزور اور بے رونق ہو جائیں گے اس لیے بالوں کے ہلکے پھلکے اسٹائل اپنائیں جو آپ پہلے بھی آزما چکی ہوں اور جن کے بارے میں آپ جانتی ہیں کہ یہ اسٹائل آپ پر جچے گا۔

☆ اگر آپ کا چہرہ لمبوترہ ہے تو آپ کو جوڑا یا بالوں کو کھینچ کر پونی ٹیل بنانے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس طرح کا انداز آپ کے چہرے کو لمبا کر دے گا...... بالوں کو درمیان سے تقسیم نہ کریں اور زیادہ جیل بھی نہ لگائیں...... ایسا اسٹائل اپنائیں کہ جس سے چہرہ بھرا بھرا نظر آئے اور لمبائی میں کم دکھائی دے۔ لمبے چہرے کے لیے پیشانی پر بالوں کا جھالر گرانا اچھا رہتا ہے۔

☆ گھنگھریالے بال گول چہرے پر اچھے لگتے ہیں لیکن بالوں کو ماتھے پر گرنا نہیں چاہیے ورنہ چہرہ چھوٹا اور پھولا پھولا لگے گا۔ درمیان سے مانگ نکالی جائے اس سے چہرہ لمبا لگنے لگتا ہے۔ اگر آپ کے بال سیدھے ہیں تو درمیان سے برابر تقسیم کریں۔ اس سے بھی چہرہ بڑا اور لمبا نظر آتا ہے۔

☆ چوکور چہرے کو اپنے چہرے کی چوڑائی چھپانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ جوڑا یا بالوں کو کھینچ کر پونی ٹیل بنائیں گی تو آپ کا چہرہ بڑا لگے گا۔ سائیڈ سے مانگ نکالیں۔ یہ اسٹائل چوکور چہرے پر خوب اچھا لگتا ہے۔ بالوں کی چند ایک لٹ گالوں پر بھی گرا لیں۔ ایسا اسٹائل اپنائیں کہ جس سے بالوں کی نرم اور ہلکی تہہ کے ذریعے چہرے کے دائیں اور بائیں حصے کو تھوڑا چھپایا جا سکے۔ اس سے آپ کا چہرہ متناسب لگے گا۔

☆ بیضوی شکل پر گھنگھریالے بال اچھے لگتے

ہیں۔ ان پر لہریئے دار اور سیدھے بال بھی سیٹ رہتے ہیں۔ جوڑا بنایا جائے یا پونی ٹیل یا پھر بالوں کو کھلا رکھا جائے، ہر طرح سے جچتے ہیں مگر پھر بھی ضروری ہے کہ آپ کو ایک دو ہیئر اسٹائل معلوم ہوں۔ تاکہ وقت کی کمی ہو تو اسے اپنا سکیں۔

ہر کوئی چاہتا ہے کہ اس کے بالوں کا اسٹائل جداگانہ ہو مگر ہر اسٹائل ہر کسی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سلکی بالوں کو سیٹ کرنے کے لیے جیل اور اسپرے کا استعمال لازمی ہوتا ہے کیونکہ یہ اپنی جگہ ٹکتے نہیں ہیں۔ ایسی بالوں والی خواتین بعض اوقات بالوں کو سنبھالنے کے لیے بہت سارے کلپس لگا لیتی ہیں مگر یہ بال کھلے ہوں تو زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ خشک اور کھردرے بالوں کو سیٹ کرنے کے لیے بالوں کا سیرم (Serum) استعمال کیا جاتا ہے جس سے بال درست ہو جاتے ہیں اور اسٹائل دینا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے خشک بالوں کو کھلا رکھنا چاہتی ہیں تو ایڈوانس میں ڈیپ کنڈیشنر لگائیں تاکہ یہ اچھے اور چمکدار نظر آئیں۔

ایسے بال بھی ہوتے ہیں جو اکثر الجھے ہی رہتے ہیں۔ ان کا بہترین حل یہ ہے کہ انہیں باندھ کر رکھا جائے۔ اگر آپ کا دل انہیں کھلا رکھنے کو چاہتا ہے تو اسی مناسبت سے اینٹی فریزی شیمپو اور کنڈیشنر استعمال کریں۔ آپ انہیں بلور کے ذریعے خشک کر کے یا مستقل طور پر بال سیدھے کروا کر ان پر قابو پا سکتی ہیں۔

اگر آپ کے بال گدی سے چپکے رہنے والے ہیں اور حجم میں کم ہیں تو آپ ایسا شیمپو استعمال کریں جس سے بالوں کے حجم میں اضافہ ہو۔ آپ پانی میں ایک عدد لیموں نچوڑیں اور شیمپو کرنے کے بعد بالوں پر اس کے جوس کو ڈالیں۔ اس سے بالوں کے میل اور چکنائی جاتی رہے گی اور بالوں کے حجم میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ مہندی لگانے سے بھی بالوں کے حجم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مہندی پاؤڈر کو چائے کے پانی میں بھگو دیں اور اس میں ایک عدد لیموں کا رس ڈال دیں اور صرف تیس منٹ بالوں میں لگائیں۔ بال حسب منشا ہو جائیں گے اور بالوں میں مہندی کا رنگ بھی نہیں آئے گا۔ گھنگھریالے اور لہریئے دار بالوں کو نرم کرنے کے لیے بالوں میں بیس منٹ کے لیے دہی لگائیں اور پھر شیمپو کر لیں۔ گرم تیل سے مالش کی جائے تب بھی بال نرم ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے بہترین نسخہ کچھ اس طرح سے ہے کہ دو ٹیبل اسپون مکھن اور اس میں تھوڑا سا زیتون کا تیل ملائیں اور ان کو اچھی طرح مکس کر کے بالوں میں لگائیں اور ہولے ہولے مساج کریں اور بعد میں نیم گرم پانی سے آدھے گھنٹے کے بعد بالوں کو دھو لیں۔ اس سے آپ کے خشک بال سلکی اور بہت ہی نرم ہو جائیں گے۔

بالوں پر برا وقت بھی آتا ہے اور لاکھ سلجھانے کی کوشش کر لو نہیں سلجھتے ہیں۔ شیمپو اور کنڈیشنر سے بالوں کو صاف کریں۔ اس کے بعد جوڑا یا پونی ٹیل بنا لیں۔ اگر آپ بالوں کو کھلا رکھنا چاہتی ہیں تو انہیں ڈرائی کریں۔ سیٹ کرنا چاہتی ہیں تو جیل کی مدد سے سیٹ کر لیں اور وہی اسٹائل اپنائیں جو آپ پر جچتا ہے۔

☆☆☆☆

خواص

چائے

چائے کا استعمال ہندوستان میں روز افزوں ترقی پر ہے، شہروں اور قصبوں کے بعد اب گاؤں میں بھی چائے کا رواج بڑھنے لگا ہے، جن گھروں میں کوئی چائے کو جانتا بھی نہ تھا وہاں بھی اب یہ ضروریات زندگی میں شامل ہوگئی ہے لیکن اس سے صحت پر جو اثر ہوتا ہے اس کی جانب بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

مختلف مزاجوں پر چائے کے اثرات مختلف ہوتے ہیں، گرم اور عصبی مزاج والوں کے لیے تو یہ سخت مضر ہے، اس سے گرمی میں اضافہ ہوتا اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ البتہ سرد اور بلغمی مزاج والوں کے لیے اس کا اعتدال سے پینا کسی حد تک فائدہ ہے۔ دماغ و اعصاب میں تحریک پیدا کرتی ہے، دماغ کا دوران خون تیز ہو جاتا ہے۔ جس سے حواس میں چستی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جسمانی اور دماغی تھکان دور ہو جاتی ہے۔ درد سر، گرانی، نیند اور غنودگی کے غلبہ میں چائے کا استعمال مفید ہے۔ اگرچہ بذات خود یہ غذائیت سے یکسر خالی ہے لیکن دودھ اور چینی کی وجہ سے اس میں قدرے غذائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ خشکی کے باعث بار بار پیاس لگتی ہو تو چائے کا استعمال سودمند ہے۔

چائے میں تھیکین (چائے کا جوہر) البیومن، ڈیکسٹرین، ٹے نین اور معدنی و نباتی اجزاء وغیرہ پائے جاتے ہیں، تھیکین اور ٹے نین اس کے جزو موثر ہیں، چائے کے زیادہ اور مسلسل استعمال سے جب تھیکین زیادہ مقدار میں جسم میں پہنچتا ہے تو طرح طرح کے امراض کا پیش خیمہ بن جاتا ہے، معدہ اور ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے، آنتوں کی بیماریاں گھیر لیتی ہیں، دل کی دھڑکن تیز ہو کر اختلاج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، بار بار کی تحریک سے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں، مثانہ کمزور ہو جاتا ہے اور بار بار پیشاب آنے کی شکایت ہو جاتی ہے۔

معدہ سست ہو جاتا ہے، بھوک نہیں لگتی اور جو کچھ کھایا جاتا ہے وہ اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا، چائے مزاج کے اعتبار سے گرم خشک اور پسینہ آور ہے۔ خون کو خراب کرتی ہے اور نیند کو کم کر کے بے خوابی کی شکایت پیدا کرتی ہے۔

☆......☆......☆
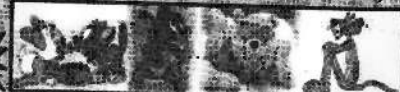
بھولا شہزادہ

نازسلوش زشے

"بھولے میرے بچے! اٹھ جا...... دیکھ سورج سر پر چڑھ آیا ہے۔ پنچھی سارے کب کے اپنے رزق کی تلاش میں جا چکے ہیں۔ ایک تو ہے کہ اٹھنے کا نام تک نہیں لے رہا۔"

چار پائی پر سویا بھولا ماں کی آواز سن کر فوراً اٹھ بیٹھا۔

رات کو ماں کی پیار بھری لوری اسے فوراً خوابوں کی حسین وادیوں میں پہنچا دیتی۔ جہاں ایک خوبصورت سلطنت ہوتی۔ اس کی ماں ملکہ ہوتی۔ وہ شہزادہ ہوتا، رنگوں، پھولوں، کھلونوں اور من پسند چیزوں سے سجی یہ سلطنت صبح اس کی ماں کی پہلی آواز کے ساتھ ہی رات تک کے لیے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔

آج بھی یہی ہوا۔ بھولا چارپائی سے اٹھا۔ پھر مٹی کے لیپے فرش پر دبے پاؤں چلتا دروازے کی چوکھٹ تک آیا۔ چک کو ذرا سا ہٹا کر اس نے سر باہر نکالا۔ اس کی ماں چمڑے کے ڈول سے کنوئیں سے تازہ پانی نکال رہی تھی۔ اور روزانہ کی طرح اسے صبح اٹھنے کے فوائد بتا رہی تھی۔ سورج افق کی گود سے نکلنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

ہلکا ہلکا اجالا اور صبح کی ٹھنڈی معطر ہوا نے بھولے کو یکدم تازہ دم کر دیا۔

"بھولے صبح اٹھ جایا کر...... خدا کے فرشتے دن بھر کا رزق صبح تڑکے بانٹنے آتے ہیں۔ جو سویا پڑا ہوتا ہے اسے رزق دیئے بغیر وہ چلے جاتے ہیں۔ اور جو جاگ رہا ہوتا ہے اور خدا کے ذکر میں مصروف ہوتا ہے۔ اسے بہت سارا برکت والا رزق دیتے ہیں۔ اپنے اردگرد دیکھ پرندے صبح سویرے اٹھ کر خدا کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ پھر رزق ڈھونڈنے جاتے ہیں۔ تو بھی جلدی اٹھا

کر......"

پانی کو مٹی کے گھڑے میں انڈیلتے ہوئے اس کی ماں بلند آواز میں بولی۔

"اب دروازے میں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ ادھر آ اور منہ ہاتھ دھو لے...... دیکھ تو چہرے پر کیسی نیند طاری ہے۔"

بھولا معصوم چہرہ اٹھائے ہونق بنا ماں کو دیکھنے لگا۔ جیسے اس کے پلے نہ پڑا ہو کہ نیند طاری ہونا کسے کہتے ہیں۔

"میرے خوشبو والے صابن سے ہاتھ منہ دھو لے۔ کل حمیدہ دے گئی تھی۔ اس کا جوائی صابن والی فیکٹری میں نوکری کرتا ہے۔" بھولے کو اپنی طرف ٹکر ٹکر دیکھتے پا کر ماں نے جلدی جلدی بتایا اور پھر بھولے کے پھیلے ننھے ننھے ہاتھوں پر پانی ڈالنے لگی۔

"یہ لے مسواک بھی کر لے۔ صبح صبح مسواک کرنے سے منہ کی ساری بو ختم ہو جاتی ہے۔ دانت چمکنے لگتے ہیں۔ چہرے پر بشاشت رہتی ہے۔" بھولے کی ماں نے کنوئیں کی منڈیر پر پڑی مسواک اٹھا کر پکڑائی۔

"پتا ہے بھولے ہمارے نبی پاک ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔ اگر میری امت کو دشواری نہ ہوتی تو میں انہیں ہر نماز سے پہلے مسواک کا حکم دیتا۔"

بھولے نے ماں کی نصیحت کو غور سے سنا اور پھر جلدی جلدی مسواک کی اور اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا۔ اس کو تولیے سے پونچھا اور مٹی کے لیپے ذرا اونچے تھڑے پر آ کر بیٹھ گیا۔ جس پر سرکنڈوں کی چھپری بنی تھی۔ اس جگہ پر اس کی ماں کھانے پکانے کا کام کرتی تھی۔

"لے بھولے چائے پی لے......" بھولے کی ماں نے پیالہ اس کے آگے رکھا۔

"ماں! ایک بات کہوں؟"

"ماں صدقے۔" بول بھولے۔

"ماں! مجھے بھی پڑھنے کو بھیج دیا کر ناں...... جس طرح فیکا اور رستم جاتے ہیں۔" بھولے کے لہجے میں آس و امید کا ایک جہان آباد تھا۔

"بھولے! تو تو نرا بھولا ہے۔ فیکے اور رستم کے ابا تو حیات ہیں۔ ان کی جیب پڑھنے لکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ ہماری نہیں...... ہمیں تو مشکل سے دو وقت کا کھانا نصیب ہوتا ہے۔ آج اگر تیرا ابا زندہ ہوتا تو شاید تو بھی پڑھ رہا ہوتا۔"

بھولے کی ماں دکھی لہجے میں بولی تو 12 سالہ بھولے نے یوں سر ہلایا جیسے ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔

"جلدی جلدی فارغ ہو لے اور جا کوئی روٹی ٹکڑ کی تلاش میں۔" بھولے نے پیالہ نیچے رکھا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"دیکھ بھولے گھر سے نکل۔ ناک کی سیدھ میں جا اور کچھ لے کر ہنسی خوشی واپس آ......" بھولے کی ماں نے چوکھٹ میں کھڑے بھولے کو نصیحت کی۔

بھولا ماں کی نصیحت سن کر باہر نکلا اور خدا کا نام لے کر نگاہ نیچی کیے ناک کی سیدھ میں چل پڑا۔ وہ کوئی آدھ میل ہی چلا ہوگا کہ کسی سے ٹکرا گیا۔

"دیکھ کر نہیں چلا جاتا تجھ سے۔" وہ جو بھی تھا زور سے جا گرا...... معصوم بھولا سہم گیا۔

"اوپر دیکھ کر چلا کر......"

"ماں کہتی ہے کہ نیچی نگاہ میں حیا ہوتی ہے۔" بھولے نے ماں کا کہا دہرایا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس بار اس شخص نے نرمی سے پوچھا۔

"رزق کی تلاش میں۔"

"کیسے تلاش کرو گے؟"

"محنت کر کے۔"

"محنت کس میں کرو گے؟"

"کام میں......"

"آج میرے یہاں کام کرو گے؟"

"ہاں"

"کل کیا کرو گے؟"

"اللہ مالک ہے۔"

پھر وہ شخص بھولے کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جہاں اس کا کام صرف اتنا تھا کہ آنے والے گاہکوں کو پانی پلائے۔ آدھا دن گزرنے کے بعد اس شخص نے اسے چھٹی دے دی اور اجرت کے طور پر ایک اشرفی دی۔ بھولا خوشی سے پھولے نہ سمایا۔

سو ماں کی نصیحت کے مطابق ہنسی خوشی اچھلتا کودتا گھر کو لوٹنے لگا۔ رستے بھر وہ اشرفی کو اچھالتا رہا۔ جب پل پر سے گزرنے لگا تو اچانک وہ اشرفی پانی میں گر گئی۔ بھولے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کافی دیر وہ پانی کو دیکھتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر گھر کو چل دیا۔ گھر پہنچتے ہی وہ سیدھا ماں کے پاس گیا۔

"آج کیا لائے ہو بھولے......؟"

"ایک اشرفی" بھولے کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

"کہاں ہے......؟"

"دریا میں گر گئی۔"

"بھولے اشرفی کو جیب میں ڈال کر لاتے ہیں۔ کل دھیان رکھنا۔" بھولے کی ماں نے اسے پیار سے چمکارا۔

رات کو بھولا ماں کی لوری سن کر پھر خوابوں کی سلطنت میں پہنچ گیا۔ جہاں وہ بہت بڑے خزانے کا مالک تھا۔

صبح وہ ماں کی پہلی آواز کے ساتھ اٹھا۔ روزانہ کا معمول دہرایا اور رزق کی تلاش کو چل دیا۔ لیکن اس سے پہلے اس نے ماں کی نصیحت سنی۔

"بھولے جو چیز بھی ہو اسے جیب میں رکھ کر لانا۔ ہاتھ میں ہو تو گر جاتی ہے۔" بھولا گھر سے نکل پڑا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ اسے اکرم منشی ملا۔

"کہاں جا رہے ہو بھولے۔"

"کام کی تلاش میں۔"

"جو بھی کام ہوا کر لو گے؟"

"ہاں"

"چل پھر آ میں تجھے چودھرائن کے پاس لے چلوں۔ انہیں آج ویسے بھی ایک کام والے کی ضرورت ہے۔" اکرم منشی اسے لے کر حویلی چلا آیا۔

"یہ کام کرے گا؟" چودھرائن نے بھولے کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"بالکل جی...... شیر ہے بھولا...... سب کرے گا۔" اکرم منشی نے دانت نکالے۔

"اچھا...... دیکھو! میں یہ دس دہی کے مٹکے بلو کر لسی بناؤں گی۔ تیرا کام صرف اتنا ہے کہ جب میں دہی بلوؤں گی تو تم نے اس میں پانی ڈالتے جانا ہے۔" چودھرائن نے اسے کام بتایا۔

جب دس کے دس مٹکے ختم ہو گئے اور بھولا کام سے فارغ ہو گیا تو چودھرائن نے اسے اجرت کے طور پر ایک بڑا مکھن کا پیڑا دیا۔

بھولے نے مکھن کا پیڑا ماں کے حکم کے مطابق جیب میں ڈال لیا اور گھر کو چلا۔ گھر پہنچ کر وہ سیدھا ماں کے پاس گیا۔

"آج کیا لائے بھولے؟" ماں نے پوچھا۔

"مکھن کا پیڑا۔" بھولے نے جواب دیا۔

"کہاں ہے؟"

"جیب میں۔" بھولے نے کہا اور ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

مگر یہ کیا.....؟

گرمی کی شدت سے مکھن پگھل چکا تھا اور بھولے کے کپڑے بھی خراب ہو چکے تھے۔

"یہ کیا کیا بھولے؟" ماں چلائی۔

"ماں آپ نے ہی کہا تھا کہ....." بھولا منمنایا۔

"بھولے مکھن کو تھیلے میں ڈال کر لاتے ہیں اور تھیلا کس کہ باندھتے ہیں۔" ماں نے سمجھایا۔

"کل ایسا ہی کروں گا ماں۔"

اگلے دن بھولا ایک اصطبل میں کام کے لیے گیا۔ کام صرف اتنا تھا کہ گھوڑوں کے آگے چنے ڈالنا تھے اور پانی رکھنا تھا۔ بھولے نے چار گھنٹے وہاں کام کیا مالک نے اسے خوش ہو کر ایک کتے کا بچہ، جو بھولے کو بہت اچھا لگا تھا۔ بھولے نے ماں کی نصیحت کو یاد رکھا اور بچے کو تھیلے میں ڈال کر تھیلا کس کر باندھ دیا۔ گھر پہنچ کر بھولا سیدھا ماں کے پاس گیا۔

"آج کیا لائے ہو بھولے.....؟"

"کتے کا بچہ....."

"کہاں ہے.....؟"

"اس تھیلے میں" ساتھ ہی بھولے نے تھیلا کھولا۔ کتے کا خوبصورت بچہ ہوا نہ ملنے اور گرمی کی وجہ سے مر چکا تھا۔

"نا سمجھ بھولے..... کتے کے بچے کو رسی سے باندھ کر لاتے ہیں۔ یوں تھیلے میں ڈال کر نہیں لاتے۔ کل دھیان رکھنا۔" ماں نے نرمی سے سمجھایا۔

"اچھا ماں....." بھولے نے تابعداری سے سر جھکایا۔

اگلے دن بھولا ایک قصائی کی دکان پر کام کو گیا۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد قصائی نے اسے شاپر میں گوشت ڈال کر دیا۔ بھولے نے ماں کی نصیحت کے مطابق گوشت والے تھیلے کو رسی سے باندھا اور گھسیٹنے لگا۔ گوشت کو یوں گھسیٹتے دیکھ کر لوگوں نے اسے سرزنش کی۔ مگر وہ ماں کی نصیحت سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

ہمیشہ کی طرح گھر پہنچ کر وہ سیدھا ماں کے پاس گیا۔

"آج کیا لائے ہو بھولے.....؟"

"گائے کا گوشت۔"

"کہاں ہے؟"

"اس تھیلے میں۔" بھولے نے رسی سے بندھا، مٹی اور گند سے اٹا گوشت کا تھیلا ماں کے آگے رکھا۔

"یہ؟" اس کی ماں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"بھولے گوشت کو کندھے پر اٹھا کر لاتے ہیں۔ یوں گھسیٹتے نہیں۔ کل کے لیے بات پلو سے باندھ لے۔"

بھولے نے ماں کی نصیحت کو دماغ میں بیٹھا لیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ کل جو بھی ہو جائے وہ اسی نصیحت پر عمل کرے گا۔

اگلے دن بھولا ایک کسان کے پاس کام کو گیا۔ مزدور کھیت سے فصل کاٹ رہے تھے۔ بھولا ان کی پیاس بجھانے کو پل کے پل پانی پلاتا۔ کام سے چھٹی کے وقت کسان نے خوش ہو کر اسے گدھے کا چھوٹا بچہ اجرت کے طور پر دیا۔ بھولا خوشی سے پھولے نہ سمایا۔

سو ماں کے حکم کے مطابق گدھے کے بچے کی اگلی دو ٹانگیں اٹھا کر اپنے کندھے پر سوار کرنے لگا۔ کسان نے لاکھ کہا کہ تم اس پر بیٹھ کر گھر چلے جاؤ۔ اس کو خود پر سوار مت کرو۔ مگر بھولے کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

بمشکل گدھے کے بچے کو آدھا گھسیٹتے ہوئے اور آدھا کندھوں پر سوار کر کے بھولا گھر کو چلا۔ سارے رستے گدھے کے بچے نے بھولے کو دولتیاں مار مار کر اس کا برا حال کر دیا۔ مگر پھر بھی بھولا خوشی خوشی چلتا گیا۔ گھر کے رستے میں پل پڑتا تھا اور اس پل سے تھوڑے فاصلے پر بادشاہ کا محل تھا۔

بادشاہ کی ایک ہی بیٹی تھی۔ جس کا نام خوش بخت تھا۔ کچھ عرصہ قبل اسے اچانک سکتہ ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے ہر طبیب سے اس کا علاج کرایا۔ ہر نسخہ آزمایا مگر شہزادی خوش بخت کا سکتہ نہ ٹوٹا..... وہ ہر وقت کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر دیکھتی رہتی۔ اس وقت بھی وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ کنیزیں خدمت کے لیے ہوشیار کھڑی تھیں کہ اچانک شہزادی نے بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔ کنیزیں حیرت سے گنگ رہ گئیں۔ شہزادی پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے بار بار باہر اشارہ کر رہی تھی۔

اس کے ہنسنے کی آواز سن کر بادشاہ اور ملکہ دوڑے چلے آئے۔ جب انہوں نے خوش بخت کے اشارے پر باہر دیکھا تو بے اختیار ان کو بھی ہنسی آ گئی۔ کیونکہ..... باہر بھولا پل پر سے گزر رہا تھا۔ گدھے کا بچہ اس کو مسلسل دولتیاں مار رہا تھا۔ گدھے کے بچے کا آدھا دھڑ زمین پر تھا اور آدھا بھولے کے کندھے پر۔

اس تکلیف کے باوجود بھولا اسے کندھے پر سے اتارنے کو تیار نہ تھا۔ بلکہ ساتھ میں وہ لہک لہک کر گاتا گا رہا تھا۔

"میں اڈا اڈا جاواں، ہوا دے نال....." جبکہ گدھے کا بچہ اسے ہوا تو کیا آندھی طوفان کے ساتھ اڑنے کی اجازت بھی نہیں دے رہا تھا۔

شہزادی کے ہنسنے کی وجہ بھولے کی بے وقوفانہ حرکت تھی۔ بادشاہ نے فوراً حکم دیا کہ بھولے کو محل میں بلایا جائے۔ چنانچہ کچھ دیر بعد بھولا اپنے گدھے کے بچے سمیت وہاں موجود تھا۔ سپاہیوں نے لاکھ کوشش کی کہ اس گدھے کے بچے کو باہر چھوڑ آئیں۔ مگر بھولا یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہ تھا۔

بادشاہ، شہزادی سمیت دربار میں موجود تھا۔ شہزادی کا سکتہ ٹوٹ چکا تھا اور وہ اب بھی ہنستے ہوئے بھولے کو دیکھ رہی تھی۔ جو ٹکر ٹکر سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ رہا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا.....؟" بادشاہ نے ملائمت سے پوچھا۔

"بھولا....." بھولے نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"یہ گدھا کہاں سے لائے ہو.....؟"

"دن کو کسان کے پاس مزدوری کی تھی۔ اجرت

کے طور پر کسان نے یہ گدھا دیا ہے۔"

"گدھے کو اس طرح کیوں اٹھا رکھا ہے؟" بادشاہ نے ایک اور سوال کیا۔

"ماں نے نصیحت کی تھی کل......" بھولے نے معصومیت سے کہا۔

"تم اتنے چھوٹے سے تو ہو...... مزدوری کیوں کرتے ہو؟" اس بار بھولے کی ہم عمر شہزادی نے پوچھا۔ جو اسے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"میرے ابو فوت ہو چکے ہیں۔ روزی کا کوئی خاص ذریعہ نہیں۔ ماں بھی سلائی کڑھائی کر کے مزدوری کرتی ہے۔" بھولے نے مختصر سا جواب دیا۔ جس کو سن کر سب کو دکھ ہوا۔

"جاؤ تم اپنی ماں کو لے کر آؤ۔ ہمیں ان سے کچھ بات کرنی ہے۔" اور ہاں! یہ گدھا باہر چھوڑ دو۔

"نہیں میں یہ نہیں کر سکتا۔ ماں کا حکم نہیں توڑ سکتا۔ میں اسے اسی طرح لے کر جاؤں گا۔"

بھولا گدھے کے بچے کو لے کر سیدھا ماں کے پاس گیا۔ اس کے ساتھ بادشاہ کے سپاہی بھی تھے۔

"آج کیا لائے ہو بھولے؟" اس کی ماں نے سپاہیوں کو دیکھ کر کہا۔

"گدھے کا بچہ ہے۔"

"آپ کو بادشاہ نے بلایا ہے۔" اچانک پہلا سپاہی بولا۔

"ہاں ماں! بادشاہ حضور نے کہا ہے کہ میں آپ کو لے کر ان کے پاس آؤں۔"

بھولے نے گدھے کے بچے کو نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

"اچھا چل......" ماں بھولے کو لے کر بادشاہ کے پاس پہنچی۔ جہاں ایک عید کا سماں تھا۔ نذر نیازیں بانٹی جا رہی تھیں۔ وہ دربار میں چلے گئے۔

"آؤ بہن ہم کو تمہارا شدت سے انتظار تھا۔" ملکہ نے بھولے کی ماں کو دیکھتے ہی کہا تو بھولے کی ماں حیرت زدہ ہو گئی۔

"بہن! تمہیں پتا ہے آج بھولے کی وجہ سے ہماری خوش بخت صحت یاب ہوئی ہے۔ ہم نے اعلان کیا تھا۔ جو ہماری بیٹی کو صحت یاب کرے گا۔ ہم اس کو انعام و کرام سے نوازیں گے۔" ملکہ نے بھولے کی ماں کی حیرت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"مگر میں کچھ سمجھی نہیں۔" بھولے کی ماں نے کہا۔

"ہم بتاتے ہیں۔" خوش بخت نے کہا اور پھر سارا واقعہ کہہ سنایا۔

"اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ بھولے کی شادی خوش بخت سے ہو گی۔ یہی بھولے کا انعام ہے۔ لیکن چونکہ یہ ابھی چھوٹا ہے۔ اس لیے کچھ سال بعد باقاعدہ منگنی کی رسم ادا کی جائے گی۔ آج سے بھولا اسی محل میں رہے گا اور آپ بھی۔ یہ خوش بخت کے ساتھ مل کر تمام علوم حاصل کرے گا پڑھے گا، ہم اپنی سلطنت اس کے نام کرنے کا بھی فیصلہ کرتے ہیں۔ جب یہ بڑا ہو گا تو اس سلطنت کے امور سنبھالے گا۔ ہمیں خوشی ہے کہ بھولا آپ کا تابعدار ہے۔

ہم ایک اور محل کی تیاری کا حکم دیتے ہیں۔ جب تک آپ دونوں ادھر رہیں گے۔

بادشاہ نے اپنا آخری فیصلہ بھولے کی ماں کو سنایا جو ابھی تک حیران کھڑی تھی۔

"خوش بخت آپ بھولے کو پائیں باغ میں لے جائیں۔" ملکہ نے خوش بخت سے کہا تو خوش بخت بھولے کا ہاتھ پکڑ کر پائیں باغ میں لے گئی۔ اور یوں ماں کا ہر حکم ماننے والا بھولا ایک دم ہی ایک بڑی سلطنت کا مالک بن گیا۔ شہزادہ بن گیا۔ "بھولا شہزادہ"

☆......☆......☆

پاکستان کا قومی ترانہ

پاکستان کا قومی ترانہ ملک کے ممتاز شاعر جناب ابو الاثر حفیظ جالندھری نے لکھا اور اس کی دھن مسٹر احمد جی چھاگلہ نے بنائی۔ اسے ایران کے سابق بادشاہ رضا شاہ پہلوی کی 1950ء میں پاکستان آمد کے موقع پر بحریہ کے بینڈ نے پیش کیا۔ اس کی دھن کا دورانیہ ایک منٹ اور بیس سیکنڈ ہے۔

پاکستان کا سب سے بڑا ڈیم

تربیلا ڈیم پاکستان کا سب سے بڑا ڈیم ہے۔ اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ بھی کہتے ہیں۔ یہ دریائے سندھ پر تعمیر کیا گیا ہے اور 1976ء کو پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس میں ذخیرہ آب کی گنجائش 159000,000 مکعب گز ہے۔ یہاں سے بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے۔

پاکستان کے ایٹمی ہمسایہ ممالک

پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کی سرحدیں اس کے تین ایٹمی ہمسایہ ممالک سے ملتی ہیں۔ یہ بھارت، چین اور روس ہیں۔ 1998ء میں پانچ ایٹمی دھماکے کر کے پاکستان بھی ایٹمی ممالک کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔

پاکستان میں طیارہ سازی کی ابتدا

15 دسمبر 1983ء کو پاکستان ایروناٹیکل کمپلیکس کی طیارہ ساز فیکٹری کامرہ (اٹک) میں پہلی بار تیار کردہ ایک انجن کے پانچ ہلکے طیارے ایک تقریب میں پاک فضائیہ اور آرمی ایوی ایشن کے حوالے کیے گئے۔ اب پاکستان میں جدید ترین لڑاکا طیارے بھی بنائے جاتے ہیں۔ پاکستان کا بنا ہوا پہلا لڑاکا طیارہ JF-17 تھنڈر 2007ء میں پاک فضائیہ کے حوالے کیا گیا۔

☆☆☆

سہیلی بوجھ پہیلی

1- ایک آدمی سڑک پر ٹرک چلا رہا ہے۔ ہیڈ لائٹس بند ہیں۔ چاند بھی نہیں نکلا ہے۔ ایک میل کے فاصلے پر ایک عورت سڑک پار کر رہی ہے۔ بتایئے ٹرک ڈرائیور اسے کیسے دیکھے گا؟

2- اگر یہ میرے پاس ہو تو میں کسی کو بتا نہیں سکتا اور اگر کسی کو بتا دوں تو یہ میرے پاس نہیں رہتا۔ بتایئے یہ کیا ہے؟

3- وہ رات کو بن بلائے مہمان کی طرح آتے ہیں اور دن کے اجالے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بتائیں وہ کون ہیں؟

4- ایک ایسی چیز کا نام بتائیں جو بارش کے موقع پر سر پر سوار ہوتی ہے؟

علم میں اضافہ کیجیے

☆ سلطان ابراہیم غزنوی ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھتا تھا۔

☆ سونے کے تاروں سے قرآن مجید لاہور میں لکھا گیا تھا۔

☆ پنجابی زبان میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ حافظ محمد لکھوی نے کیا تھا۔

☆ حرم شریف کے اندر دنیا کی چھ زبانوں کی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔

☆ درختوں میں سب سے پہلے کھجور کا درخت پیدا ہوا۔

☆ انارکلی کا اصل نام نادرہ بیگم تھا

☆ رکشہ جاپان نے ایجاد کیا

آئیے مسکرائیں

کینگرو سے کسی جانور نے پوچھا۔ ”تمہارا بچہ کہاں ہے؟“
کینگرو نے اپنے تھیلے میں جھانکا اور کہا۔
”ہائے! میری جیب کٹ گئی۔“

(صبا عمر، ساہیوال)

☆☆☆

استاد: (احمد سے) ”آنکھیں کیوں بنائی گئی ہیں؟“
احمد! ”جناب، دیکھنے کے لیے۔“
استاد: ”شاباش...... اور کان؟“
احمد: ”جناب مرغا بننے کے لیے۔“

(عمیر خالد، لاہور)

☆☆☆

ایک شخص نے بچے سے پوچھا: ”کیا تمہارے والد صاحب گھر پر ہیں؟“
بچے نے کہا: ”نہیں“
اس شخص نے دوبارہ پوچھا: ”کب آئیں گے؟“
بچے نے جواب دیا: ”جب آپ چلے جائیں گے۔“

(علی، ملتان)

☆☆☆

ایک شخص پولیس میں ملازمت کا امیدوار تھا۔ ممتحن نے اس سے پوچھا۔ ”ابراہم لنکن کو کس نے قتل کیا؟“ وہ کچھ دیر بعد سوچ کر بولا۔ ”مجھے اس کا جواب دینے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔“
ممتحن نے کہا۔ ”ضرور! آپ جائیں اور کل صحیح جواب لے کر آئیں۔“ وہ گھر آیا تو بیوی نے پوچھا۔
”کیسا رہا امتحان...... ملازمت مل گئی؟“
وہ شخص بولا۔ ”معلوم تو یہی ہوتا ہے۔ فوراً ہی انہوں نے ایک قتل کا کیس دے دیا اور قاتل کی تلاش پر مامور کر دیا۔“

(سحرش، آزاد کشمیر)

☆☆☆

دو آدمی لڑ رہے تھے ایک کہنے لگا۔ ”میں نے تو آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا۔“
دوسرے نے کہا: ”میں نے بھی آپ کو شریف سمجھا تھا۔“
پہلا آدمی بولا: ”آپ تو درست سمجھے تھے، غلطی پر میں ہی تھا۔“

(عمران علی، راولپنڈی)

☆☆☆

بچہ: ”ابا جان! بھیا کی داڑھ میں درد ہے اور وہ اسے نکلوانے کے لیے ہسپتال جا رہے ہیں، میں بھی جاؤں۔“
باپ: ”تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟“
بچہ: ”بھیا کو روتے ہوئے دیکھوں گا۔“

(جیا علی، گوجرانوالہ)

☆☆☆